ہماری ویب ڈیجیٹل بک

عارف محمود کسانہ

ARIF MEHMOOD KISANA

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Arif Mehmood Kisana"
at Hamariweb.com

شہدائے جموں کی یاد میں

ہمارا خیال تھا کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے اور جلد ہی حالات بہتر ہو جائیں گے اور ہم پھر سے اپنے گھروں میں واپس چلے جائیں لیکن بد قسمتی سے وہ دن کبھی نہ آیا اور ہم لوگ اپنے وطن واپس جانے کی آرزو لیکر ایک ایک کرکے اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میرے دادا جموں سے اپنی ہجرت کی داستاں سناتے ہوئے اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ ایک وہ ہی نہیں تقسیم ہند کے وقت جموں سے اپنے گھروں کو چھوڑ آنے والے سبھی اپنے وطن کو کبھی نہیں بھولے تھے اور بہت سے تو یہ وصیت کرکے اس دنیا سے جاتے تھے کہ اگر اُن کا انتقال ہو گیا تو انہیں بطور امانت دفن کیا جائے اور جب بھی موقع ملے تو اُن کے جسد خاکی کو اپنے وطن کی مٹی کے سپرد کر دیا جائے۔
ہجرت کے بعد میرے دادا اور نانا اپنے خاندان کے ساتھ جموں سے سیالکوٹ منتقل ہوئے تھے۔ وہ یہاں برسوں زندہ رہے لیکن اپنا وطن ہمیشہ جموں کی سرزمین کو ہی کہتے تھے۔ وہ اکیلے نہیں تھے اُن جیسے لاکھوں دوسرے بھی اسی کیفیت میں تھے اور مجھے یاد ہے کہ جب بھی انہیں کبھی وہاں کا بچھڑا ہوا رشتہ دار یا ساتھی ملتا تو گویا اُن کی عید ہو جاتی تھی۔ جب مطلع صاف ہوتا تھا تو شام کے وقت میرے نانا سیالکوٹ قلعہ پر کھڑے ہو کر جموں شہر کی روشنیوں کا حسرت بھری نگاہوں سے نظارہ کیا کرتے تھے اور ان کی آنکھیں نم ناک ہو جایا کرتی تھیں۔

ہجرت کرکے آنے والے بزرگوں سے میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو صورت حال کا ادراک کیوں نہیں ہوسکا جس میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ مسلمان کے خون سے جموں کی سرزمین رنگین ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور تقسیم ہند کے منصوبہ کے بعد پنجاب کے تقسیم کی باتیں ہونے لگیں لیکن ریاست جموں کشمیر چونکہ برطانوی ہند میں شامل نہ تھی بلکہ ایک دیسی ریاست تھی جسے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک ساتھ الحاق کا فیصلہ کرلے یا پھر اپنی خودمختاری کا اعلان کرلے۔ مہاراجہ کشمیر ریاست کو خودمختار رکھنا چاہتا تھا اور اُسے کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کی ریاستوں کے بارے میں پالیسی اپنے اور ریاست کے فائدہ میں نظر آتی تھی اسی لیے اُس نے ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست جموں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ stand still agreement کا معاہدہ کیا جس کی صورت میں دفاع، امورخارجہ، مواصلات اور کسٹم وغیرہ کے حکومت پاکستان کے کنٹرول میں چلے جانے سے ہم لوگ بھی مطمئن ہوگئے۔ ۱۴ اگست کو ریاست بھر میں پاکستان کی آزادی کا دن بہت خوشی سے منایا گیا اور مہاراجہ نے خود پاکستانی پرچم کو سلامی دی لیکن یہ خوشی زیادہ دن نہ قائم رہ سکی اور ریاست کے مختلف حصوں سے شورش کی خبریں آنا شروع ہوگئیں۔

قیام پاکستان کو بھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ پونچھ کے علاقہ سے ریاستی

حکومت کے خلاف مسلح کاروائیوں کا سلسلہ ریاست کے دوسرے تک پھیلنا شروع ہوگیا جس کے رد عمل میں دوسری جانب سے بھی جوابی کارویئوں کا آغاز ہوگیا۔ بھارتی سامرج ریاست جموں کشمیر کو ہر قیمت میں ہڑپ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ جموں کے مسلمان ان حالات کے لیے نہ تو تیار تھے اور نہ ہی اس کشت و خون کا تصور کر سکتے تھے۔ جموں اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا مگر بھارت کے ساتھ سرحد ہونے کی وجہ سے ہندووں اور سکھوں کے جتھے منظم انداز میں حملہ آور ہونے لگے۔ اگرچہ اکتوبر کے وسط تک جموں شہر کے حالات پر امن تھے مگر دیہات کے علاقوں سے لوگ حفظ ماتقدم کے طور پر پاکستان کی جانب پناہ کی تلاش میں جانے لگے۔ میرے اپنے خاندان کے افراد کا کہنا ہے کہ ہم نے ذوالحج کا چاند پاکستان اور جموں کی سرحد پر دیکھا تھا جو پندرہ اکتوبر کی تاریخ ہوگی۔ اس کے بعد جب کشمیر پر ۲۲ کتوبر کو قبائلی حملہ شروع ہوا تو پھر جموں میں بھی قتل و غارت میں شدت آتی گئی۔ ۲۳ اکتوبر کو جموں کے ایک قصبہ میراں صاحب میں ڈوگرہ سپاہیوں اور جن سنگھیوں نے مسلمانوں کے مجمع پر شدید فائرنگ کرکے ہزاروں افراد کو شہید کردیا۔ مسلمانوں کے گھروں پر حملے شروع ہوگئے اور ہزاروں مسلمان عورتیں کو اغواہ کرلیا گیا جن میں مسلم کانفرس کے صدر چوہری غلام عباس اور قائمقام صدر چوہدری حمید اللہ کی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ ۲۶ اکتوبر کو جبری الحاق کا بہانہ بنا کر بھارتی فوج جموں کشمیر میں داخل ہوگئی۔ ۳ نومبر کو پٹیالہ سے مزید فوجی کمک جموں آ گئی اور ۴ نومبر کو

بھارتی وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ اور وزیر داخلہ سردار پٹیل مزید منصوبہ بندی کے لیے جموں آئے۔ ۵ نومبر کو مسلمانوں کو کہا گیا کہ اگر وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو پولیس لائن پہنچ جائیں جہاں سے انہیں ٹرکوں اور گاڑیوں میں بھر کر لے جایا گیا مگر راستہ ہی میں انہیں شہید کردیا گیا صرف لوگ ہی اپنی جانیں بچا سکے۔ اگلے روز پھر جموں کے مسلمانوں کو قافلہ کی صورت میں پاکستان پہنچانے کی غرض سے روانہ کیا مگر انہیں بھی راستہ میں شہید کردیا گیا۔ اس قدر ظلم و بربریت کی مثال چشم فلک نے شائد پہلے نہ دیکھی ہوگی۔ بچ نکلنے والے جب وہ واقعات سناتے تھے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں مقیم جموں کے اہم عمائدین سے اکثر ملاقاتوں میں اُن حالات و واقعات کے تفصیلات سے آگاہی ہوئی۔ جموں کی اُن معروف شخصیات میں سٹیٹ کونسلر قاضی خورشید عالم، ہفت روزہ پاسبان کے ایڈیٹر منشی معراج دین، ہفت روزہ ولر کے مجید امجد بٹ، ہفت روزہ دور جدید کے ایڈیٹر عبدالحمید نظامی، آزاد کشمیر اسمبلی کے سابق قائد حزب اختلاف چوہدری سلطان علی، سابق ڈپٹی سپیکر چوہدری فرمان علی، سابق رکن آزاد کشمیر اسمبلی چوہدری وزیر علی، ملک اور دوسرے زعماء شامل تھے۔ ان میں سے اکثر کا یہ کہنا تھا کہ ریاست کے ساتھ پاکستان کے stand still agreement کے بعد تعلق کیوں نہ مضبوط بنایا گیا۔ سیالکوٹ سے جموں کے لیے ٹرین کیوں بند کی گئی۔ قبائلی حملہ اگر ناگزیر بھی

تھا تو اسے سیالکوٹ سے کٹھوعہ اور جموں کی جانب کیوں نہ کیا گیا۔ بھارت سے آنے والی صرف ایک شاہراہ کو کٹھوعہ کے قریب بند کرکے جموں کے مسلمانوں کو کیوں نہ بچایا گیا۔ اکتوبر کے وسط کے بعد جب جموں میں مسلمانوں پر حملے شروع ہوئے پھر بھی قبائلیوں کو جموں کی جانب کیوں نہ متحرک کیا گیا۔ مسلم کانفرس جموں کی قیادت کیوں حالات کا ادراک نہ کر سکی اور بہت سے اس کے رہنماء اسلامیان جموں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر خود کیوں فرار ہو گئے۔ قائدِ اعظم کے منع کرنے کے باوجود مسلم کانفرس کی قیادت نے کیوں بلاوجہ محاذ آرائی شروع کی جس کے نتیجہ میں جماعت کے صدر چوہدری غلام عباس، آر ساغر اور دوسرے جیل میں ڈال دیئے گئے۔ لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا اور ریاست بھی جبری تقسیم ہو گئی۔ اُن شہداء نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی تھی وہ آج بھی روشن ہے اور جموں کشمیر کی تیسری نسل نے بھی اس جبری تقسیم کو تسلیم نہیں اور وہ مادر وطن کی آزادی کے لیے آج بھی متحرک ہیں اور اُس دن کی نہ صرف آرزو رکھتے ہیں بلکہ اس کے لیے مصروف جدوجہد ہیں جب آ ملیں گے سینہ چاکان وطن سے سینہ چاک۔

چودھری رحمت علی ! کوئے یار کو ترستا مسافر

آج زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ کاش میں گجر نہ ہوتا وہ اس لئے کہ میں جب تحریک پاکستان کے دلیر اور دناشور بانی کی بات کرتا ہوں تو لوگ اسے برادری پرستی گردانتے ہیں۔ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں چودھری رحمت علی کبھی بھی برادری پرستی کی بات نہیں کی کسی انجمن گجراں کی سرپرستی نہیں کی تمام عمر امت مسلمہ کی نشاط ثانیہ کے لئے سرگرداں رہے کوشش جد و جہد کرتے کرتے جہان فانی سے چلے گئے مگر اپنی عظیم الشان جد وجہد کے ایسے نشان چھوڑ گئے جو تا قیامت یاد رہیں گے۔ کچھ تو ایسے تھے جو مونٹ ایورسٹ سر کر گئے اور کچھ اپنی جانیں دے گئے۔ ضروری نہیں کہ ہر ایک کہ نصیب میں کامیابی لکھ دی گئی ہو کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا نام کوشش کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ چودھری صاحب بھی انہی میں سے ہیں۔ انہیں تحریک پاکستان کا ابوذر غفاری بھی کہا گیا اور مظلوم مجاہد بھی۔

۔ اس بات پر تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔ عمر کی ۵۹ ویں سالگرہ دو ہفتے پہلے منائی ہے۔ یہ احساس تفاخر ہی رہا کہ میں مسلمان ہوں میں پاکستانی ہوں میں گجر برادری سے تعلق رکھتا ہوں لیکن جب بھی نومبر کا دوسرا ہفتہ آتا ہے اور مجھے نقاش پاکستان کے لئے لکھنا

پڑھتا ہے یا کوئی تقریب منانا پڑتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے جب قلم پکڑتا ہوں اب توان پیج پر انگلیاں ہوتی ہیں دکھ اس بات کا کہ میں اس کے لئے لکھ رہا ہوں جس نے ساری زندگی گجر ہونے کو احساس تفاخر نہیں بنایا میرا ایمان ہے.برصغیر پاک و ہند میں جب کسی نے یک پہلی مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھا پاکستان تو اسی وقت بن گیا اس لئے کہ اس کے برتن الگ کر دئے گئے اس کو سونے کے لئے الگ جگہ دے دی گئی وہ جب ان کے چوکے کی طرف بڑھا تو اسے ملیچھ قرار دے دیا گیا مسلہ اس کا نام تھا۔جب کبھی اسے پیاس لگی تو بلندی سے ایک آبشار بنا کر بک میں اسے پانی پینا پڑھا۔اس نے مسلمان ہونے کی بڑی قیمت چکائی ہو گی۔مدینے والے تو جانتا ہے کہ میرے بڑھوں نے جب اسلام قبول کیا تھا توانہیں یہاں تمہارے بلال جیسی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس کے دکھوں کو طیبہ کی سرکار تو بڑے اچھے طریقے سے جانتا ہے۔اللہ کا نام لینا اب بھی مشکل ہے اس وقت ان دیوانوں پر کیا گزری ہو گی ذات پات سے ہٹ کر جب اس نے اسلام قبول کیا تو اس پر بھی وہی گزری جو مکہ میں گزرا کرتی تھی۔وہاں ابو جہل تھا یہاں بھی کوئی بلدیو سنگھ تھا وہاں ابو سفیان تھے تو یہاں بھی کیا کم ظلم تھا۔شودروں سے بڑھ کر دکھ اٹھانے والے لوگ۔بہت پرانی بات نہیں کرتا تحریک پاکستان کے دنوں سے چند سال پہلے کی بات ہے۔انڈین سول سروس کے ایک مسلمان آفیسر قدرت اللہ شہاب ہوا کرتے تھے سول سروس کے آفیسر جو کم از کم مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے انہوں نے لکھا کہ میں ایک جگہ کا دورہ کرنے نکلا تو

میرے اعزاز میں پر تکلف دعوت دی گئی بہت اچھے برتن لگائے گئے میں بہت خوش ہوا کہ ہندو نے مسلمان کی دعوت کی ہے۔انہوں نے لکھا میں چند سال بعد گیا تو وہی برتن لگائے گئے میں سمجھ گیا کہ انہوں وہی برتن جو ان کے نزدیک ایک ملیچھ ناپاک کے زیر استعمال آ گئے تھے الگ سے رکھ دیے ہوں گے۔یہ تھی اوقات مسلمانوں کی۔ہندو پانی مسلمان پانی آج کسی بچے سے کہیں کہ پانی کا بھی دھرم ہوتا ہے بولے گا ناممکن مگر تھا۔برصغیر کے مسلمانوں کو اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا سبق پڑھایا جا رہا تھا سب اس شوق میں لگے ہوئے تھے کہ انگریز کے جانے کے بعد سب مل جل کر رہیں گے اس وقت مسلم لیگ کا قیام تو ہو چکا تھا مگر مسلم لیگ کانگریس سے مل کر آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی۔یہ بیسویں صدی کی ابتداء ہے دوسرے عشرے کا درمیانی سال ۱۹۱۵ ایک نوجوان جس کا نام چودھری رحمت علی ہے والد صاحب چودھری شاہ محمد گجر ہیں اور گجروں کی گوت ہے گورسی۔انہیں فکر لاحق ہوتی ہے جمہوریت اعداد کا کھیل ہے اور اس کے چکمے میں اگر مسلمان آ جاتے ہیں تو ایک ایسی غلامی میں آ جائیں گے جو انگریز کی غلامی سے کئی گناہ بڑھ کر اذیت ناک ہو گیانھوں نے اسلامیہ کالج کی بزم شبلی میں نیا نعرہ پیش کیا کہ مسلمانوں کو ایک خاص حصے میں اپنا الگ سے گھر چاہئے جہاں وہ اپنی مرضی سے رہ سکیں انہیں شدت سے احساس ہوا کہ یہ قوم ماری جائے گی اس کے پلے کچھ نہیں رہے گا اگر یہ ہندو کی غلامی میں چلی جائے گی انہیں مکمل ادراک تھا کی غلام ہندو تو بہتر ہوتا ہے حاکم کبھی بھی مسلمانوں

کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ یہ چند لوگوں کی بھول ہے کہ وہ جاتے ہوئے ان کو اقتدار دے کر جائے گا جن سے لیا تھا۔ یہی بھول کانگریسیوں کو رہی کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرلیں گے اور مزے کریں گے۔ ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ چودھری رحمت علی جس پاکستان کی بات کر رہے تھے اس میں پنجاب افغانہ (صوبہ سرحد) سندھ اور بلوچستان تھا انہوں نے قطعاً بندل کی بات نہیں کی۔ ۱۹۱۵ کو سب سے پہلے دو قومی نظریہ دینے والے چودھری رحمت علی تھے۔ یہاں میں کہوں گا کہ چودھری صاحب اور علامہ اقبال کو دو مختلف سوچوں سے دیکھا جائے۔ اقبال کی پوری شاعری اٹھا کر دیکھ لیں انہوں مسلم امہ کی نشاط ثانیہ کی بات کی ہے وہ صوبوں علاقوں کے شاعر نہ تھے۔ چودھری رحمت علی کی جد جہد اٹھارہ سال سے جاری تھی اور یہ کوشش ان کی وفات تک رہی۔ میں نئی نسل کے لئے ان کی زندگی کو مہ وسال میں پرکھتے ہوئے کچھ بتانا چاہتا ہوں تا کہ پاکستان کی اس نسل کو جواب ان کا نام تک نہیں جانتی انہیں پتہ چل سکے کہ چودھری صاحب کون تھے ان کی کیا کوشش تھی انہوں نے پاکستان کو کب سوچا اور اس کے لئے انہیں کیا کیا تکالیف.برداشت کرنا پڑیں۔

ا۔ تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۹۷ گاؤں موہراں۔ ۱۹۰۶ میں بالوچر سے پرائمری اسکول مکمل کیا۔ روہن سے گاؤں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ میں سنسکرٹ ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک کیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے ۱۹۱۵ میں ایف

اے کا امتحان پاس کیا اور یہی وہ سال ہے جس مین انہوں نے بزم شبلی میں دو قومی نظریہ پیش کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری 1918 میں حاصل کی۔ ۱۹۱۸ سے تک ایچی سن کالج لاہور مین پڑھایا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۲۵ تک پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۳ لاء کیا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۳۰ تک چیف آف نزاری ٹرئیب میر دوست محمد کے روجھان میں پرائیویٹ سیکریٹری رہے۔ چودھری رحمت علی ۱۹۳۰ میں انگلینڈ کے لئے روانہ ہو گئے وہاں نومبر ۳۰ کو مڈل ٹیمپل اسکول میں بار ایٹ لاء کی تعلیم کے لئے داخل ہو گئے ۱۹۳۰ میں ایمانوئل کالج مین داخلے کے لئے درخواست دے دی اور اگلے سال داخلہ مل گیا جون ۳۲ میں پارٹ ٹو پاس کیا اور ۱۹۳۳ میں مشہور زمانہ پمفلٹ NOW OR NEVER شائع کیا ۱۹۳۳ میں بے اے کی ڈگری مل گئ ۱۹۳۳ میں انہوں نے پاکستان نیشنل موومنٹ کے اغراض و مقاصد شائع کئے ۱۹۳۵ میں انہون نے برٹش ممبرز آف پارلیمنٹ کی آئینی کمیٹی کو کھلا خط لکھا جس میں چودھری صاحب نے انہیں کھل کر بتایا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں رہتی اور آئین میں مسلم حقوق کا خیال رکھنا ہوگا۔ ۱۹۳۷ میں انہوں نے پیرس کا دورہ کیا اور اسی سال میں انہوں نے جرمنی کا بھی دورہ کیا۔ ۱۹۳۸ میں ٹائمز آف لندن میں مقالہ تحریر کیا اور برطانوی قوم کو امت مسلمہ کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسی سال ان کی ملاقات چودھری خلیق الزمان سے ہوتی ہے۔ ۱۹۳۹ میں وہ بوسٹن امریکہ پہنچتے ہیں۔ چودھری رحمت علی اسی سال جاپان بھی آتے ہیں۔ ان ممالک کی سیاسی پارٹیوں کے اکابرین سے ملاقات ان کے سفر کا بڑا مقصد ہوتا ہے اور وہ

دنیا بھر میں ملت اسلامیان ہند کے حقوق کے لئے بحری جہازوں پر دور دراز کا سفر کرتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ واحد لیڈر ہیں جنھوں نے قوم کے لئے اس دور میں سب سے زیادہ سفر کی صعوبتیں.برداشت کیں۔جنوری ۱۹۴۰ میں وہ ہانگ کانگ آتے ہیں اور اگلے ماہ ممبئ پہنچتے ہیں اسی مہینے میں ان کا جہاز کراچی پہنچتا ہے مارچ ۱۹۴۰ کو وہ پاکستان نیشنل موومنٹ کے مرکزی کونسل سے بھی خطاب کرتے ہیں اپریل ۱۹۴۰ کو چودھری رحمت علی ممبئ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں اور وہ اسی سال کیمبرج پہنچتے ہیں اور یونیورسٹی آف کیمبرج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرتے ہیں ۱۹۴۱ میں انہوں نے ملت اسلامیہ اور اور اس کی منزل پر تحقیقی مقالہ شائع کیا.براعظم دینیہ جو نام انہوں نے.برصغیر کردے رکھا تھا اس کے مستقبل پر ان کی تحقیق قابل توجہ ہے۔۱۹۴۲ میں ملت اور اس کے مشن پر ان کا مقالہ شائع ہوا انہوں نے ملت اسلامیہ اور اس کی منزل کے موضوع پر مڈل ٹمپل ان بار سے خطاب کیا یہ.برصغیر کے تمام لیڈران میں سے انہیں اعزاز حاصل ہوا ۱۵ مارچ ۱۹۴۳ کو ناہوں نے ملت اسلامیہ اور ان کی اقلیتیں کے موضوع پر چودھری رحمت علی کا مقالہ آج بھی پاکستان کے تازہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے چعدھری رحمت علی نے ۱۹۴۴ میں ملت اسلامیہ کی دس بنیادیں بیان کیں میں.برصغیر دینیہ ان کا موضوع تھا ۱۹۴۶ میں چودھری رحمت علی نے پاکستان ۱۹۴۵ قومی موومنٹ اور.برطانوی سوچ کے موضوع پر انہوں نے لکھا ۱۹۴۶ میں میں ہی ان کا مقالہ بعنوان.براعظم دینیہ انڈیا کے نام سے شائع کیا اسی سال انہوں نے

بنگلستان کے موضوع پر لکھا جو پاکستان بننے کے بعد چند ہی سالوں میں حقیقت بن گیا میں انہوں نے پاکستان فادر لینڈ آف پاک نیشن پر لکھا ۱۹۴۸ میں وہ لاہور ۱۹۴۷ آئے انہوں نے اسی سال انڈیا میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لئے یونائٹڈ نیشنز کے سیکریٹری جنرل کو خط لکھا اکتوبر ۱۹۴۸ میں انہیں حکومت پاکستان نے پاکستان چھوڑ دینے کو کہا۔ یہاں میں کہنا چاہوں گا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ انہیں اس ملک سے نکال باہر کیا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ چودھری رحمت علی جو پاکستان چاہتے تھے وہ یہ پاکستان نہ تھا ان کی خواہش تھی کہ پاکستان کو پورا کشمیر ملنا چاہئے تھا جس میں اسے دریاؤں کے سوتے بھی ملتے۔ آپ کو تو یہ معلوم تھا کہ پاکستان کے بانی حضرت قائد اعظم ان دنوں شدید علیل تھے کہتے ہیں انہوں نے ایک بار مکمل تیاری کی علالت کے باوجود انہوں چودھری رحمت علی کا استقبال کرنے کی تیاری کی لیکن لیاقت علی خان کی حکومت نے ان دو عظیم لیڈروں کو ملنے نہیں دیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب قائداعظم بیمار ہوتے ہیں اور کچھ عرصے کے لئے زیارت بلوچستان جاتے ہیں۔ اس دوران آپ کو علم ہوگا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا کہ میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ کچھ لوگ جو نیچے ملنے آئے ہیں وہ دراصل یہ دیکھنے آئے ہیں کہ میں کب مروں گا۔ یہ الزام لیاقت علی خان پر لگایا جاتا ہے۔ ہم دراصل اشخاص کا بت بناتے ہیں اور پھر ان کو پوجتے ہیں شہید ملت ہونا اپنی جگہ مگر ان کا قائد سے یہ سلوک تاریخ کا حصہ بن چکا ہے وہ ہماری اور آپ کی طرح انسان تھے ان سے

بھی غلطیاں ہوئیں چودھری رحمت علی سے بدسلوکی بھی انہی کے دور میں ہوئی اور خفیہ والوں نے ان کی زندگی اجیرن بنادی۔

اسی ایجینسی کی قوم پر سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ اس نے ان دو عظیم لیڈروں کو ملنے نہیں دیا اور پاکستان کو نام دینے والے جنہیں لوگ نقاش پاکستان کہتے ہیں انہیں دھکے دے کر اس ملک سے نکال دیا۔

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

والی بات یہاں سچی ہوتی ہے۔رحمت علی انگلینڈ چلے آتے ہیں گھر سے نکلتے وقت جو ان پر گزری سو گزری۔ایک ایسا ملک جہاں باچا خان کے پجاری جنہوں نے نہ صرف قیام پاکستان کی مخالفت کی بلکہ قائد اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کی ذات پر رکیک حملے کئے جن کا تذکرہ کرنے سے ہاتھ کانپتے ہیں وہ کانگریسی ملا جو آج پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں انہیں تو عزتیں ملیں اور جس نے ملت اسلامیہ میں پاک ستان جیسی حقیقت کا خواب دیکھا کوشش کی وہ اس ملک سے نکال باہر کیا جاتا ہے۱۹۵۱ میں انگلینڈ میں نمونیے کا شکار ہوتے ہیں اور ۳ فروری کو۱۹۵۱ کو اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۱۹۵۱ فروری ۲۰ کو وہ دفن کئے گئے۔ان کی نماز جنازہ دو مصری طلباء نے پڑھائی۔برادر نذیر تبسم گورسی نے ان کے آخری ایام پر چند روز پہلے سر سید اکیڈمی میں اپنے خطاب میں بیان کرتے ہوئے ہماری معلومات میں اضافہ کیا جس کے مہمان خصوصی سردار یوسف تھے۔

چودھری صاحب کی بد قسمتی جو میں نے اپنے کالم کے شروع میں بیان کی تھی وہ اب خو
ش قسمتی میں بدل رہی ہے اس لئے کہ اس مشن کی یوسف عزیز جیسے سکالر تزین اختر
جیسے مدبر صحافی اور بریگیڈئر شفیع جیسے نامور لوگوں نے باگ دوڑ سنبھال لی ہے جو
سارے ہی نان گجر ہیں۔میں جناب الطاف حسن قریشی کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جنھوں
نے اس موضوع پر بڑا خوبصورت کالم لکھا ہے۔بد قسمتی یہ رہی کہ ایک میڈیا ہاؤس نے
ان کے جسد خاکی کو پاکستان لانے کی مخالفت کی اور جہاں چودھری شجاعت حسین نے ان
کے جسد کو لانے کی ٹھانی وہیں انہی کے گھر سے چودھری پرویز الہی نے مخالفت کر
دی۔اب جناب نظامی صاحب بھی اسی دنیا میں جا چکے ہیں جہاں رحمت علی ہیں وہاں
ضرور ان سے پوچھا ہوگا چودھری صاحب نے کہ نظامی صاحب میں نے کون سا نقصان
کیا تھا کہ آپ مجھے لاہور ائر پورٹ سے واپس بھجوا رہے تھے۔دل چسپ بات ہے میں
نے نظامی صاحب کو لکھ دیا تھا کہ لگتا ہے کہ مردہ چودھری رحمت علی آپ کے دفتر پر
قبضہ کر لے گا۔دنیا چل چلاؤ ہے اللہ ان دونوں کو غریق رحمت کرے۔بس التجا ہے کہ
گجرو ذرا مہربانی کرو تنظیمیں بناؤ مگر غیر گجروں کو آگے لاؤ۔ہم سب کی دلی خواہش ہے
کہ چودھری صاحب کو ان کا اصل مقام دیا جائے اور کیمبرج سے پاکستان لا کر دفن کیا
جائے۔اس کے لئے لاہور میں جگہ بھی لی جا چکی ہے۔ویسے تو ہونا چاہئے کہ کہ کراچی
میں قائداعظم اور شہید ملت مدفون ہیں لاہور میں علامہ اقبال بہتر ہے انہیں اسلام

آباد میں دفن کیا جائے تاکہ یہ شہر بھی معتبر ہو جائے۔

بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پاس زمین ہے، حکومت ہے اور عوام ہیں اس لیے ہم فلسطین کی ریاست کو ایک ملک کی حیثیت سے تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ تاریخی اعلان کرتے ہوئے سویڈش وزیر خارجہ مارگوت والستروم نے یورپی یونین اور دنیا کے دیگر ممالک کے لیے ایک روشن اور قابل تقلید مثال قائم کی کہ ہر قوم کی آزادی اور حق خود آرادی کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ حقوق انسانی، مساوات اور آزادی رائے پر یقین رکھنے والی اقوام کو اس میں پہل کرنا ہوگی۔جب سویڈش وزیر خارجہ سے امریکہ کی جانب سے تنقید کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ قبل از وقت قدم نہیں ہے تو انہوں نے کہا بالکل نہیں بلکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ دنیا بھر میں آزادی اور اپنے حق خود آرادی کی جدوجہد میں مصروف اقوام کو سویڈن کے اس فیصلہ سے ایک حوصلہ افزا پیغام ملا کہ کسی قوم کے بھی پیدائشی حق کو زیادہ دیر تر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترک جمہوریہ شمالی قبرص (T.R.N.O.) جو شمالی قبرص کے نام سے جانی جاتی ہے اور اس رقبہ صرف 3,355 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی تین لاکھ کے قریب ہے مگر یہ ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے 15 نومبر 1983ء سے دنیا کے نقشہ پر موجود ہے اگرچہ ابتدا میں اسے صرف ترکی نے تسلیم کیا ہوا ہے لیکن اب اس کے

سفارت خانے پاکستان اور کرغزستان میں موجود ہیں اور علی ساتتل پاکستان میں اس کے سفیر ہیں۔ شمالی قبرص کے صدر درویش اریگلو اور وزیر اعظم اوذکان ہیں۔

برصغیر میں انگریزوں کے انخلا کے وقت ریاست جموں کشمیر کا رقبہ 222236 مربع کلومیٹر تھا جس میں بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقے شامل تھے یہ رقبہ یورپی ملک رومانیہ کے برابر ہے۔ 1947ء میں ایک لاکھ چھتیس ہزار مربع کلومیٹر سے زائد علاقہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا جبکہ تقریبا بہتر ہزار مربع کلومیٹر کا علاقہ گلگت بلتستان اور تیرہ ہزار مربع کلومیٹر سے زائد خطہ آزاد جموں کشمیر کے نام سے موسوم ہوا اور طے یہ پایا کہ یہ آزاد خطہ آزادی کا بیس کیمپ بنے گا۔ اگر صرف آزاد جموں کشمیر کو ہی لیں تو جس بین الاقوامی قانون کے تحت سویڈن نے فلسطین کو تسلیم کیا ہے بالکل اسی قانون کے تحت آزاد جموں کشمیر میں ایک حکومت ہے، پینتالیس لاکھ سے زائد عوام ہیں یہ آبادی اقوام متحدہ کے 123 رکن ممالک سے زائد ہے، خطہ زمین ہے جو اقوام متحدہ کے مطابق کسی اور ملک کا حصہ نہیں بلکہ اس کے مالک خود اہل کشمیر ہیں اور اقوام متحدہ کے 68 رکن ممالک اس سے کم رقبہ کے حامل ہیں۔ آئین ہے، اپنا پرچم ہے، سپریم کورٹ ہے تو پھر اسے کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا۔ شمالی قبرص کا رقبہ اور آبادی آزاد جموں کشمیر سے کہیں کم ہے مگر اس کی حیثیت ایک ملک کی ہے اور پاکستان نے خود اسے تسلیم کیا ہوا ہے۔

اکتوبر 1947ء میں آزاد جموں کشمیر کی ریاست کے قیام کے بعد اسے جہد وجہد آزادی کا بیس کیمپ بنانا مقصود تھا لیکن یہ فعال کردار ادا نہ کر سکا اور بین الاقوامی طور پر کشمیر مسئلہ فلسطین کی طرح توجہ نہ لے سکا۔ 1961ء میں آزاد جموں کشمیر کے صدر کے ایچ خورشید بنے جو کہ قائدا عظم محمد علی جناح کے پرسنل سیکریٹری بھی رہے تھے۔ یہ قائد اعظم کی تربیت اور صحبت تھی کہ کے ایچ خورشید نے یہ جان لیا کہ بین الاقوامی طور پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے اور اس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ کشمیری خود اپنی بات کریں جیسے فلسطینی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے آزاد کشمیر کی ریاست کو تسلیم کرنے کا نظریہ پیش کیا جسے بہت پذیرائی ملی اور وہ جلد ہی کشمیری عوام کا پسندیدہ نظریہ بن گیا۔ اُس وقت پاکستان میں جنرل ایوب خان کی حکومت تھی۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے رہنماء شیخ عبداللہ اسی دور میں مذاکرات کے لیے وہاں سے آئے مگر اچانک نہرو کی وفات کے باعث انہیں واپس جانا پڑا اور پھر تاریخ کا دھارا کسی اور رخ مڑ گیا۔ صدر ایوب نے کے ایچ خورشید کی حکومت جبراً ختم کرکے انہیں دلائی کیمپ کا پہلا اسیر بنا دیا۔ آپریشن جبرالٹر اور پاک بھارت جنگ ستمبر 1965ء کے بعد حالات بالکل بدل گئے لیکن کے ایچ خورشید اپنے نظریہ کی تشہیر کرتے رہے یہاں تک کہ وہ 1986ء میں زمبابوے کے دار لحکومت ہرارہ میں ہونے والی آٹھویں سربراہی کانفرس میں مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے اور عالمی

رہنماؤں کو مسئلہ کشمیر سے روشناس کرواتے ہوئے انہیں آزاد جموں کشمیر کو تسلیم کرنے کی درخواست کی۔ اس مقصد کے کے لیے انہوں نے عالمی رہنماؤں میں ایک میمورینڈم بھی تقسیم کیا۔ اس کانفرس میں پاکستان کی نمائندگی صدر جنرل ضیاء الحق کر رہے تھے۔ کے ایچ خورشید کا کہنا تھا کہ کانفرس میں شریک بیس سے زائد ممالک کے سربراہوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر پاکستان پہل کرے اور کشمیر کو تسلیم کرے تو وہ بھی اس کے لیے تیار ہوں گے۔

پاکستان کی قیادت ، اس کے پالیسی سازوں، وزارت خارجہ کے اعلیٰ حکام اور آزاد کشمیر کے رہنماؤں کو اس حقیقت کا ادراک کرلینا چاہیے کہ مسئلہ کشمیر کے حل اور اسے بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے یہی قابل عمل راستہ ہے اور اسے ہی اپنانا ہوگا۔ بین الاقوامی دنیا بھی اسی وقت بات سنتی ہے جب کشمیری خود کرتے ہیں اور کشمیر کمیٹی سویڈن کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے راقم کو امر کا ذاتی تجربہ ہے جس کا ادراک نجی محافل میں پاکستانی اور کشمیری رہنماء بھی کرتے ہیں۔ جلسے جلوس اور بیانات مسئلہ کو صرف ایک حد تک اجاگر کرتے ہیں لیکن اس کا اثر صرف کشمیری اور پاکستانی عوام تک محدود رہتا ہے مگر عالمی رائے عامہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی دنیا کا میڈیا اسے کوئی اہمیت دیتا ہے۔ سفارت کاری، حکمت عملی اور بین الاقوامی قانون کا راستہ اپنا کر کشمیری بھی اپنی منزل پا سکتے ہیں اور انہیں فلسطین

و شمالی قبرص کی مثال پیش نظر رکھنا ہوگی۔ جس طرح ترکی نے شمالی قبرص کو تسلیم کیا
ہے پاکستانی حکومت کو بھی ایسے ہی کشمیر کو تسلیم کرنا چاہیے ۔ یہی راستہ مسئلہ کشمیر کے
حل کی جانب گامزن ہو سکتا ہے۔

اقبال شاعر نہیں تھے

دنیائے صحافت کی دو عظیم شخصیات کے مابین گذشتہ دنوں ایک عجیب سی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال نہ تو شاعر مشرق تھے اور نہ ہی کوئی قومی شاعر ہیں بلکہ وہ صرف ایک مقامی شاعر تھے اور اُن کا پیغام اب فرسودہ ہوچکا ہے۔ انہوں نے جو کہا وہ ان کے دور تک درست تھا مگر اب وہ تھیسسز آوٹ ڈیٹیڈ ہوچکا ہے۔ جبکہ اس کا جواب دیتے ہوئے ایک بہت معروف کالم نگار نے کہا ہے کہ اقبال صرف پاکستان کے ہی نہیں بلکہ ایران، تاجکستان اور ترکستان میں بھی انہیں قومی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے ۔بھارت میں اُن کی شاعری پر بہت کام ہو رہا ہے بلکہ دنیا بھر میں اُن کی شاعری کی دھوم ہے اور وہ بلا شبہ شاعر مشرق ہیں۔ میرا ان دونوں شخصیات سے اختلاف ہے بلکہ میں کیا خود علامہ اقبال کا بھی یہی موقف ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں ایسی رائے رکھنے والوں کو اصل میں غلط فہمی اس لیے ہوتی ہے کہ انہوں نے اقبال کے چند اشعار سنے ہوتے ہیں لیکن وہ فکر اقبال سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اقبال شاعر تھے ہی نہیں ، اس لیے اُن کے مقام و مرتبہ کو شاعری کے پیمانے سے ماپنا درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے شاعری کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا مگر اس میں اور شاعرانہ ذہنیت میں بہت فرق ہے۔ قرآن نے شاعری کو ایک ذہنیت قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی ہے جس کا کوئی نصب العین

نہیں ہوتا۔ قابل مذمت اسلوب بیان نہیں بلکہ ذہنیت ہے۔ اصل اہمیت پیغام کی ہوتی ہے اسلوب بیان چاہے کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی حقائق اور سچ کی بات کے اظہار کے لیے شاعری کو ذریعہ بنائے وہ قابل گرفت نہیں ہوتا۔ قابل اعتراض پیغام اور انداز فکر ہوتا ہے ۔شاعرایک وقت میں ہجر وفراق کی بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی وصل کی لذت سے بھی محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ اُن کے ذہن کی اڑان ہوتی ہے کہ کبھی گل و بلبل کے قصے کبھی محبوب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے اور ہجو پہ آجائیں تو رقیب کو روسیا قرار دے دیں۔ اسی شاعرانہ طرز عمل کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمت نہ خوابیدہ نہ بیدار

علامہ نے تو شاعری ترک کر دی تھی مگر اپنے استاد سر آرنلڈ اور قریبی دوست شیخ عبدالقادر کے کہنے پر دوبارہ شاعری کو ذریعہ پیغام بنایا۔ انہوں نے خود کہا کہ میری شاعری سے کوئی تعلق نہیں میں نے تو اسے صرف اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ

نغمہ کجا و من کجا ! ساز سخن بہانہ است سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

جو انہیں شاعر کہتے تھے انہیں وہ جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ میرے پیغام پر غور کریں اور اسے روایتی شاعری پر معمول نہ کریں۔ بال جبریل میں وہ

لکھتے ہیں کہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ

علامہ درد دل سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو میں کہا ہے اس پر تم غور نہیں کرتے بلکہ اس مجھ پر شاعر ہونے کی تہمت لگا دیتے ہو اور انھوں نے بہت ہی سخت بات کہہ دی کہ

نہ پنداری کہ من بیی بادہ مستم مثال شاعران افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازان مرد فرودست کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شاعر مشرق قرار دیتے ہیں لیکن اقبال چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ وہ بارگاہ رسالتؐ میں شکایت کرتے ہیں کہ

من اے میر امم داداز تو خواہم مرا یاراں غزل خوائے شمردند

وہ کہتے یہ ہیں کہ اے میرے اور ساری کائنات کے آقا! میں آپ کی خدمت میں یہ فریاد لے کر حاضر ہوا ہوں کہ میں نے تو اپنی قوم کو آپ ﷺ کا پیغام سنایا لیکن میری قوم نے مجھے محض ایک شاعر سمجھا۔ وہ مثنوی اسرار و رموز میں مزید عرض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ اور ہے تو روز محشر مجھے سب کے سامنے رسوا کیا جائے

پردہ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں راز خارم پاک کن

یہی نہیں بلکہ مجھے حضورؐ کے قدموں کے بوسے سے بھی محروم کردیا جائے۔

روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

فکر اقبال کا تھیسز آؤٹ ڈیٹیڈ کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا منبع قرآن ہے۔ وہ عشق مصطفیٰؐ کا پیغام ہے۔ وہ ہر دور کے لیے قابل عمل رہے گا۔ اقبال نے تو اپنے پیغام کو فردا قرار دیتے ہوئے آنے والے دور کا پیغام قرار دیا ہے اقبال کا اصل مقام پیامبر قرآن کا ہے۔ وہ حکیم الامت تھے اور جن لوگوں نے اُن کی فارسی شاعری، خطبات اور باقی کلام کو غور سے پڑھا ہے وہ اقبال کو یہی مقام دیتے ہیں۔ آج پوری دنیا میں اقبال کے کروڑوں چاہنے والے اُس کی اس دعا کی قبولیت ثبوت ہے جو اس نے بارگاہ ایزدی میں کی تھی کہ

خدایا آرزو میری یہی ہے میرا نور بصیرت عام کردے

دہشت گردی کے خلاف فکری جہاد

تاریخ انسانی کا ایسا واقعہ کہ جس پر اگر آسمان بھی خون کے آنسو روئے تو کم ہے۔ شہداء پشاور کے معصوم خون سے جو دھرتی رنگین ہوئی ہے اس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں۔ اس ظالمانہ اور انسانیت سوز کاروائی کرنے والے بد بخت گروہ کے ترجمان خالد خراسانی کے اس کا جواز بخاری جلد پانچ کی روایت ایک سو اڑتالیس کی روشنی میں پیش کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان انسانیت کے دشمنوں کو کس قسم کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان کے مائنڈ سیٹ کو کس طرح بدل دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کی کس قدر غلط تعبیر و تشریح ان کے ذہنوں میں بٹھا دی گئی ہے اور وضع روایات اور اپنی من مانی اسلام کی تشریح کرکے جہاں ایک طرف خود مسلمانوں کا بے دریغ خون بہا رہے ہیں وہیں عالمی سطح پر اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش میں وہ اسلام دشمنوں کا پورا ساتھ دے رہے ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والے آج کیوں اس قدر سفاک ہوگئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں۔ ان کی یہ ذہنیت کیسے پیدا ہوئی۔ ان کا دئنڈ سیٹ کیسے بدلا۔ انہیں کس نے حوروں اور جنت کے لالچ میں موت کے خوف بیگانہ کردیا۔ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں بلکہ یہ سب اس تعلیم و تدریس کی وجہ ہے جو انہیں دی گئی ہے اور جس نے انہیں اس قدر متشدد بنا دیا کہ انہیں اپنے علاوہ

کوئی اور مسلمان نظر ہی آتا ور وہ اپنی خود ساختہ شریعت کو بندوق کے زور پر نافذ کرنا چاہتے ہیں اور جو ان کے ساتھ متفق نہیں اسے یہود و نصاریٰ کا ساتھی قرار دیتے ہوئے واجب القتل سمجھتے ہیں۔ چونکہ طالبان اور مذہبی دہشت گردی میں ملوث تقریباً تمام جماعتوں اور افراد کی تعلیم وتربیت اور فکری تعلق دیوبند مسلک کے ساتھ ہے اس لیے اکابرین دیوبند کو ان کے ساتھ اپنی لاتعلقی اور برأت کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں دہشت گرد اور اسلام دشمن قرار دینا چاہیے۔ یہ خود مسلک دیوبند کے لیے ضروری ہے کیونکہ یہ عناصر دیوبند مسلک کے لیے بدنامی کا باعث ہے اور اس مکتبہ فکر نے جو خدمات سرانجام دیں ہیں، اُن کو یہ ختم کرنے لے در پہ ہیں۔ امید ہے کہ اکابرین دیوبند اپنا کردار ادا کرنے میں تاخیر نہیں کریں گے۔

مذہبی دہشت گردی اور جنونیت جس کا امت مسلمہ اور بالخصوص پاکستان شکار ہے اسے ختم کرنے کے لیے چار اطراف سے بیک وقت یلغار کی ضرورت ہے۔ ایک حکومتی اقدامات جو ایک مربوط پالیسی اور عزم مصمم کے ساتھ ہوں، دوسرا قوت بازو کا استعمال کرتے ہوئے مسلح افواج اور سیکورٹی کے ادارے ایسے زہریلے سانپوں کا سر کچل کر رکھ دیں۔ تیسری سطح پر مؤثر اور فوری عدالتی نظام کے تحت مجرموں کے مقدمات کا فیصلہ اور اُن پر بلاتاخیر عمل۔ چوتھا اور سب سے اہم فکری محاذ پر جنگ ہے جس میں ہر ایک کو شریک ہونا پڑے گا۔ اس سوچ کے خلاف لڑنا

ہوگا جو دہشت گرد پیدا کرتی ہے۔ ان مدرسوں، تعلیم اداروں اور بلکہ مساجد جو کہ مسجد ضرار کی مثل ہوچکی ہیں عوام کو بائیکاٹ کرنا ہوگا۔ دہشت گروں کے ساتھ نرم گوشہ رکھنے والی جماعتوں اور شخصیات سے لاتعلّقی اور ان کا محاسبہ کرنا ہوگا۔ دہشت گردوں کے حامیوں، ہمدردوں اور نرم گوشہ رکھنے والوں کا عوام کو بخوبی علم ہے۔ یہ وہی ہیں جو سانحہ پشاور پر نیم دلانہ تبصرے کررہے ہیں۔ جو اس واقعہ کو تو المناک اور سانحہ قرار دیتے ہیں مگر ایسا کرنے والوں کو دہشت گرد، قاتل اور سلام دشمن قرار نہیں دیتے ہیں۔ دہشت گردوں کے ساتھی اور ہمدرد وہی ہیں ہیں جنہیں طالبان نے حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لیے اپنے نمائندے مقرر کیا تھا۔ بدقسمتی کے ساتھ دہشت گروں کے نظریات کے حامی ہر طبقہ میں سرایت کرچکے ہیں۔ یہ فتنہ خوارج کا تسلسل ہے اور جسے اسلام دشمن ہر دور میں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ لارنس آف عریبیا ہو یا ایم ایچ ہمفرے اسلام دشمن ہر دور میں ایسے عناصر کی پشت پناہی کرتے رہے اور جیسا کہ بار بار ہم اپنے کالموں میں لکھتے رہے کہ وہ اسرائیلیات اور وضعی روایات کو بنیاد بنا کر اسلام کی غلط تعبیر و تشریح کرتے ہیں جبکہ قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جہاد میں ہمیں اپنی نوجوان نسل کو اسلام کی اصل تعبیر و تشریح سے روشناس کروانا ہوگا جو انسانیت کے نام اللہ کی آخری وحی میں موجود

ہے۔ ہمیں فکرِ اقبال کو عام کرنا ہوگا اور علامہ جو پیامبر قران اور دور حاضر کے مسائل کا حل اسلام کی روشنی میں دے گئے ہیں اسے اجاگر کرنا ہوگا۔ ہر تعلیم یافتہ طبقہ تک خطبات اقبال کا پیغام پھیلانا ہوگا۔ مذہبی انتہا پسندی کے خلاف قرانی تعلیمات سے نوجوان نسل کو آگاہ کرنا ہوگا۔ اسلام نے اعتدال کا جو درس دیا ہے اسے عام کرنا ہوگا۔ قرآنی تعلیمات اور اقبالیات کو تعلیم نصاب کا حصہ بنانا ہوگا۔ پہلے خود فہم قرآن حاصل کرنا ہوگا اور پھر اپنے بچوں کو بھی تعلیم دینا ہوگی۔ یاد رکھیں اگر آپ غفلت برتیں گے اور بچوں کو اسلام نہیں سکھائیں گے تو پھر کوئی اور سکھائے گا اور یہ نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور وہ انہی دہشت گروں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔

ہر کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ یہ عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دہشت گروں کے خلاف فکری جنگ میں فعال کردار ادا کرے اور ایسے اداروں جہاں سے ایسے ظالم لوگ پروان چڑھتے ہیں ان پر نظر رکھیں۔ دہشت گروں کو مارنے کے ساتھ ساتھ ان نرسیوں کو بھی ختم کرنا ہوگا جہاں سے یہ پیدا ہوتے ہیں۔ پنجابی کی کہاوت ہے کہ بُرے کی ماں کو مارو تاکہ بُرا پیدا ہی نہ ہو۔

آمدِ ماہ مبارک

جس ماہ مبارک میں ختم المرسلین اور پوری کائنات کے لیے رحمت، پیغمبر آخر و اعظم ﷺ کی ولادت باسعادت اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند اُس دل افراز ساعت پر لاکھوں سلام

دنیا کی تمام اقوام اور مذاہب کو ماننے والے اپنے، قومی دنِ، اہم ایام اور تہوار پورے جوش و خروش سے مناتے ہیں جس سے اُن کی قومی وحدت، اپنے نظریہ سے لگن اور اُس کے ساتھ اپنی وابستگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کی تقریبات ایک طرح سے اُن کے ملی اور قومی جذبہ کا مظہر ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری پر جشن مسرت منانے کے حوالے سے سورہ یونس کی آیت ۵۸ میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ قرآنِ حکیم جیسی عظیم نعمت جو بعثِ محمدی ﷺ سے ممکن ہوئی، اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ قرآن صاحبِ قرآن سے تو الگ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی تیئیس سال کی زندگی میں قرآن کو عملاََ متشکل کرکے دکھایا نیز اُم المومنین حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ حضور ﷺ کا خلق قرآن تھا یعنی آپ مجسم قرآن تھے۔ اِس لیے نزولِ قرآن پر جشنِ مسرت تو

عیدالفطر کی صورت میں منایا جاتا ہے اور مجسم قرآن کے لیے جشن ربیع الاول میں ہوتا ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت تین میں دینِ اسلام کو نعمت کہا گیا ہے اور جب دینِ اسلام نعمت ہے تو حضور ﷺ بھی تو نعمت ہیں جن کی وجہ سے ہمیں دین ملا۔ بلکہ قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات پر حضور ﷺ کو واضح طور پر اللہ کی نعمت قرار دیا ہے جس کی تفصیل قرآن کے اِن مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے (۲،۵، ۱۹،۵۸، ۲،۴۸، ۸،۴۹، ۵۲،۴ اور ۲،۶۸)۔ نعمت کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ نعمت ملنے پر اُس کا چرچا کرو (۹۳،۱۱)،اور نعمت کا شکر کرنے کو اللہ کی عبدیت قرار دیا (۱۶،۱۱۴)، نعمت ملنے پر اُس کا شکرادا کرنے کے بارے میں تو قرآنِ حکیم میں بہت زیادہ آیات ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو نعمت قرار دیا ہے بلکہ آپ نعمتِ کبریٰ ہیں تو آپ ﷺ کی ولادت پر خوشی در حقیت انہی قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ اللہ نے آپ ﷺ کی بعث کو مومنین پر احسان قرار دیا ہے (۳،۱۶۴) ۔ اب اِن تمام آیاتِ قرآنی کی روشنی میں حضور ﷺ کی ولادت پر خوشی کرنا در حقیت اللہ کا حکم بجا لانا ہے اور جشنِ مسرت نہ منانا اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہے۔ جب خود خدا اُن کی تعریف کرتا ہے ۴۷-۴۵،۳۳) اور حضور کو خود بہت محبت سے مخاطب کرتا ہے (۲۰،۱، ۳۶،۱، ۱، ۴۷،۱) تو پھر بندہ مومن کیوں نہ حکمِ ربانی کو بجا لاتے ہوئے ذکرِ مصطفٰے ﷺ ،۳۔۴۷ کی محافل کا انعقاد کرے۔ قرآن کی سپریم حیثیت کا تقاضا ہے کہ،مزید کوئی اور دلیل طلب کیے بغیر حکمِ خداوندی پر عمل کیا جائے۔جب قرآن واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ

نعمتِ الٰہی کا شکر ادا کرو اور جشنِ مسرت مناؤ پھر کون ہے جو انکار کی جرأت کرے۔ یہ محافل حضور سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار ہوتی ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے سب زیادہ محبت نہ کرے۔ جس سے محبت ہو اُس کا تو اکثر ذکر ہوتا ہے اور جس کا عملی مظاہرہ قول و فعل سے نظر آتا ہے۔

یہ دِن حضور ﷺ کی ولادت کا ہو یا اِس دنیا سے تشریف لے جانے کا، دین کی ابتدا کا دِن ہو یا تکمیلِ دین کی خوشی میں یا پھر ہجرت کے واقعہ کی یاد میں ،اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ مقصد ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں ختم المرسلین ﷺ کا مقام و مرتبہ، اُن کی شان بیان کرکے اُن کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا جاتا ہے اور اپنی زندگی کو اُن کے اُسوہ حسنہ پر چلنے کا عزم کیا جاتا ہے۔

جہاں تک صحابہ اکرامؓ کا میلاد منانے کا تعلق ہے تو ممکن ہے کہ وہ اِس انداز میں نہ مناتے ہوں جس طرح آج منایا جاتا ہے۔ لیکن بہت سی روایات ایسی موجود ہیں جن میں حضور ﷺ نے اپنی ولادت کا تذکرہ کیا ہے اور آپ ﷺ اپنی ولادت کے دِن یعنی پیر کو روزہ رکھا کرتے تھے یہ بھی ایک طرح سے منانا ہی ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زہیرؓ، چاروں خلفاء راشدین، حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ اور کم از کم ۳۴ صحابہ اکرامؓ کی آپ ﷺ کی شان میں نعتیں بھی تو اِسی سلسلہ کی

کڑی ہیں۔ تقریبات کو منانے کے لیے ضروری نہیں کہ ہر کوئی ایک سا طریقہ اپنائے۔ اب بھی مختلف ممالک میں میں مختلف انداز میں یہ دِن منایا جاتا ہے اور تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔اصل مقصد قرآن کی روشنی میں رسالت کا مقام اور آپ ﷺ کے بارے میں قرآنی آیات کا مفہوم پیش کرنا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کچھ مسالک سے تعلق رکھنے والے احباب عید میلاد النبی ﷺ کی تقریبات کے بارے میں اختلافی نظریہ رکھتے تھے مگر اب وہ خود یوم صدیق اکبرؓ، یوم شہادت حضرت عمرؓ اور یوم شہادت حضرت عثمان پر جلوس بھی نکالتے ہیں، ان ایام کو مناتے ہیں اور کانفرسیں منعقد کرتے ہیں بلکہ اسی طرح اگر عید میلاد النبی ﷺ کی اصطلاح اگر پسند نہیں تو اسے یوم رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے منا لیا جائے جہاں تک میلاد کی محافل کا تعلق ہے تو مجھے تو یہ کہنا ہے کہ ہم نے اِن محافل کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود کر دیا ہے۔ حضور ﷺ تو پوری کائنات کے لیے رحمت ہیں (۲۱:۱۰۸) جن میں غیر مسلمان بھی شامل ہیں تو پھر حضور ﷺ کی محافل میں غیر مسلمانوں کو کیوں شریک نہیں کیا جاتا۔ ہمیں پوری دنیا کو بتانے کی ضرورت ہے کہ آپ ﷺ پوری انسانیت کے رحمت تھے اور سب سے بڑے سوشل ریفارمر تھے جن کی تعلیمات کا ثمر آج کی تمام انسانیت لے رہی ہے۔ دنیا بھر میں مسلم ممالک کے سفارت خانوں اور بالخصوص اقوامِ متحدہ میں اِس دِن کی مناسبت سے تقریبات منعقد کرکے دنیا کو انسانی حقوق کے بارے میں رحمتِ عالم کی تعلیمات خصوصاً آپ ﷺ کے آخری خطبہ کو پیش کرنا چاہیے جو کہ حقوقِ انسانی

کا عالمی چارٹر ہے۔ وہاں سب کو بتایا جائے کہ حضور ﷺ نے غیر مسلموں، عورتوں، بچوں، زیر دستوں، جنگی قیدیوں اور جانوروں کے حقوق کا جو چارٹر دیا تھا اُسی سے روشنی لیکر اقوامِ متحدہ نے اپنا دستور بنایا ہے۔ اِس سے دنیا کو حضور ﷺ کی شخصیت اور اسلام کی اصل تعلیمات سے آگاہی ہوگی۔ مقامی تقریبات میں بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دعوت دینی چاہیے۔

ذکرِ رسول ﷺ کی محافل سے اگر قلوب میں عشقِ مصطفٰے کی شمع روشن ہوتی ہے اور حضور سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ قابلِ تحسین ہے اِس لیے اَن کے انعقاد کی ترغیب دینی چاہیے۔ جب دِلوں میں محبت ہوگی تو پھر ہی آپ ﷺ کی پیروی اور اتباع ممکن ہوگی ۔ حضور ﷺ کی اطاعت سے ہی اللہ کی محبت مشروط ہے (۳،۳۱)۔ میلاد کی محافل کے انعقاد ہی کافی نہیں بلکہ محبت کے دعویٰ کا ثبوت عمل سے دینا ہوگا۔ قرآنِ حکیم صرف ایمان لانے کو کافی نہیں قرار دیتا بلکہ اس کے ساتھ عملِ صالح کی شرط عائد کرتا ہے (۱۷،۲۳، ۴، ۳،۱۰۳)۔ حضور ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ قرآن کو اپنی زندگی کا محور بنایا جائے اور یہ بات ملحوظِ نظر رہنی چاہیے کہ قیامت کے روز رسولِ پاک ﷺ اللہ کے حضور اپنی امت کی شکایت کریں گے کہ میری اُمت نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا (۲۵،۳۰) لہٰذا ہمیں گفتار کی بجائے کردار کا غازی بننا چاہیے ۔ اللہ کرے کہ آج جس امن و سکون کی انسانیت کو ضرورت ہے وہ اس ماہ مبارک کی بدولت نصیب ہو اور ہمیں محبت رسول ﷺ کا دعویٰ

قرآن حکیم پر عمل کی صورت میں کرنے کی توفیق ملے۔

میرا پیمبر عظیم تر ہے

عید میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے خصوصی تحریر
غالب جیسا عظیم اور قادر الکلام شاعر جس کی نظروں میں اعجاز مسیحا محض اک بات ہے اور دنیا کی وسعتوں اور رنگینیوں کو وہ شب و روز کا تماشہ قرار دے کر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اُسے اپنے اہل زباں ہونے پر نہ صرف فخر ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو ریختہ کا استاد بھی قرار دیتا ہے۔ لیکن اسی غالب کے سامنے جب مدح شاہ دو عالم کا موقع آیا تو اسی غالب کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ جس کے سامنے الفاظ باندی کی طرح کھنچے چلے آتے تھے اور وہ انہیں جیسے چاہے استعمال کرتا تھا اُسے مجبور ہو کر کہنا پڑا

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذشتیم کاں ذاتِ پاک مرتبہ داں محمدؐ است

اردو کے اس عظیم شاعر نے حضورؐ کی صفت و ثنا خود خدا پر چھوڑ دی اور کہا کہ کہاں آپؐ جیسی بلند مرتبہ ہستی اور کہاں غالب یعنی بقول پیر مہر علی شاہؒ

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

ایک غالب ہی کیا دنیا کی عظیم ہستیاں بھی بارگاہ رسالت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ فیض احمد فیض نے جنھیں یوں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی

اے تو کہ ہست ہر دِل محزوں سرائے تو اوردہ ام سرائے دِگر از برائے تو

خواجہ بہ تخت بندۂ تشویش مُلک و مال بر خاک رشکِ خسرو دوراں گدائے تو

جس ذاتِ گرامی کی تعریف و توصیف خود رب کائنات انسانیت کے نام آخری پیغام میں خود کررہا ہو کہ بے شک آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں اور ورفنا لک ذکرک اور یہاں تک کہ ولسوف یرضی ۔ مقام مصطفیٰ ﷺ کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ حرمت اور تعظیم رسولؐ بھی صحابہ اکرامؓ جیسی عظیم ہستیوں کو بتادی کہ حضورؐ کی مجلس مس بیٹھ کر آپس میں سرگوشیاں نہ کرو اور نہ انہیں ایسے مخاطب کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو کرتے ہو اور مزید یہ کہ آپؐ کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو وگرنہ تمھارے تمام اعمال ضائع ہوجائیں اور تمھیں خبر تک بھی نہ ہوگی۔ اسی لیے حضورؐ سے بے پناہ محبت کرنے والے دم بخود ہو کر کہہ اٹھتے ہیں کہ

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر نفس گم کرہ می آئید جنید و بایزید ایں جا

عارف کھڑی میاں محمد بخشؒ بھی حضورؐ کے نامِ نامی کی حرمت اور تعظیم کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ

جے لکھ واری عطر گلابوں دھویے نت زباں شان اوہناں دے لائق ناہیں کی کلمے دا کاناں

اس قدر بے پناہ عقیدت و محبت کیوں نہ ہو جب خود خدا نے فرمادیا کہ میری محبت چاہتے تو میرے حبیبؐ کی پیروی کرو۔ اور پھر آپؐ کی ذات وجہ تخلیق کائنات ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ میں خدا کو اس لیے خدا مانا ہے کہ اس کی خبر مجھے رسول پاکؐ نے دی ہے۔ کیا خوب کہہ گئے مولانا ظفر علی خانؒ کہ

گرارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ سیاروں میں

اسی حقیقت کو غالب نے بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا بلکہ قرآن کی آیت وما امیت اذ امیت ولکن اللہ رمی کی تفسیریوں کی کہ

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است لیکن کشود آں از کمان محمدؐ است

خداکے تیر بھی اُسی وقت ٹھیک نشانے پر جا کر لگتے ہیں جب وہ محمدؐ کی کمان

سے نکلتے ہیں۔ یہ وہی سماں ہے کہ بدر میں تلواریں تو حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ اکرامؓ چلا رہے تھے لیکن خدا نے کہا کہ قتل ہم کر رہے تھے۔ اُس عظیم ہستی کے دِن کو پوری دنیا کے انسانوں کو منانا چاہیے اور اِسے صرف مسلمانوں تک محدود کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ بلا شبہ محسن انسانیت ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ رنگ و نسل اور زبان و ملک کی کوئی تخصیص نہیں اور تمام بنی نوع آدم محض انسان ہونے کے ناطے قابل عزت ہیں۔ انہوں نے انسان کو اس کے اصل مقام سے روشناس کراتے ہوئے اُسے شرف عظمت بخشا اور حقوق انسانی کا درس دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ رنگ و نسل اور ذات پات کے تمام بُت پاش پاش کر دیے گئے ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے کو انسان پر اپنا حکم نہیں چلا سکتا۔ حاکمیت صرف خدا کی ہے جو اُس کی کتاب کے ذریعہ ہے اور یہی انہوں نے قیامت تک آنے والوں کے لیے رہنمائی کے لیے چھوڑی جس کا واضع اعلان اپنے آخری خطبہ میں بھی کیا۔ آپؐ کی بدولت انسانیت کو قرآن ملا جس کے ملنے پر سورہ یونس میں جشن مسرت منانے کا حکم ہے جس کی پیروی میں ربیع الاول میں صاحب قرآن کی آمد پر اور رمضان میں لیلۃ القدر کے موقع پر جشن نزول قرآن منایا جاتا ہے کیونکہ قرآن کو صاحب قرآن سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو مجسم قرآن کہہ کر کی۔ آپؐ نے مروجہ نظریات میں جکڑے ہوئے انسانوں کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کا پیغام دیا جس کی بدولت انسان آج ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ آپ کے اُس نقلاب کا پوری دنیا نے اعتراف کیا ہے

اور دنیاکے بڑے بڑے مفکرین نے آپ کو اس پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس طویل فہرست میں لارڈمائن، مائیکل ایچ ہارٹ، لیونرڈ کارلائل، براؤن، سٹیفن سن، سمتھ، سر ولیم میور، سپالڈنگ، ریمنڈ لبروگٹ، ڈاکٹر راوڈن، گبن، سر رچرڈ گریگوری، برناڈ شاہ، گائٹے، برگساں، کیتھلین بلس، لیمیرٹے، ہملٹن گب، جوزف سیپچ، آرتھر گیلمین، ون کریمر، بوڈلے، رابرٹ گولیک، جوزف نونان اور ایک طویل فہرست ہے کہ کالم کی تنگ دامنی حائل ہے اور وہ سب تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

حضورؐ نے جو انقلاب بھرپا کیا تھا دنیا اُسے جان چکی ہے لیکن ہمیں اُس کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری درسی کتب میں پڑھایا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے اسلام کا پیغام دیا تو اہل مکہ آپؐ کے دشمن ہوگئے آپؐ اُن کے بتوں کی مخالفت کرتے تھے۔ بات بتوں کی دشمنی کی نہ تھی اور وہ نہ اس وجہ سے آپؐ کے جانی دشمن تھے بات کچھ اور تھی۔ اگر بتوں کی وجہ ہی ہوتی تو جب آپؐ مکہ سے ہجرت کرکے سینکڑوں میل دور مدینہ چلے گئے تھے تو اہل مکہ کو اطمینان ہوجانا چاہیے تھا کہ اُن کے بتوں کو بُرا بھلا کہنے والا اب تو بہت دور چلاگیا ہے اور معاملہ ختم ہوجانا چاہیے تھا مگر انہوں پیچھا نہ چھوڑا اور بدر، احد

اور خندق کے موقع پر خود لڑنے کے لیے آئے۔ کیوں کہ اہل مکہ جانتے تھے کہ اگر یہ انقلاب مدینہ میں کامیاب ہوگیا تو کل کو پورے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ہماری بالادستی اور انسانوں پر حاکمیت ختم ہو جائے گی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے نوحہ ابو جہل کے عنوان سے یوں بیان کیا ہے کہ ابو جہل غلاف کعبہ پکڑ کر دہائی دے رہا ہے کہ

سینہ ما از محمدؐ داغ داغ از دم او کعبہ را گل شد چراغ

وہ ہبل، لات اور منات کو رو رو کر فریاد کر رہا تھا کہ محمدؐ نے میرے سینہ میں آگ لگا دی ہے کہ اُس کی وجہ ہماری بالادستی ختم ہو رہی ہے۔ کبھی ابو جہل حجر اسود کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ فارس سے آنے والا سلمانؓ میرا بھائی ہے اور میں کس طرح حبشہ کے بلالؓ کو اپنے ساتھ ستر خوان پر بٹھا سکتا ہوں۔ یہ وہ اصل جہ تھی جس کی بدولت ابو جہل اور اہل مکہ نے آپ کی نہ صرف شدت سے مخالفت کی بلکہ آپ پر جنگیں بھی مسلط کر دیں۔ لیکن نور خدا اپنے مشن پر کاربند رہا اور دنیا نے اُس انقلاب کا ظہور دیکھ لیا۔ اب ہمارا فرض ہے اور دور حاضر کا تقاضا ہے کہ ہم اس عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ہم عہد کریں کہ محبت رسولؐ کا ثبوت اپنے کردار سے دیں اور ابو جہلی ذہنیت کو ختم کرتے ہوئے قرآن حکیم کو مشعل راہ بنا کر زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے رہنمائی لیں۔ جہاں تک آپؐ کی ذات ہے ہم کبھی بھی تعریف

وتوصیف کا حق نہیں کر سکتے۔

زندگیاں ختم ہوئیں اور قلم ٹوٹ گئے ! تیری تعریف کا ایک باب بھی پورا نہ ہوا

کیونکہ

میرا پیمبر عظیم تر ہے شعور لایا کتاب لایا وہ حشر تک کا نصاب لایا

بشر نہیں، عظمت بشر ہے میرا پیمبر عظیم تر ہے میرا پیمبر عظیم تر ہے

اہل یورپ کے لیے بھی رحمت

قرآن حکیم حضورﷺ کو پوری کائنات کے لیے رحمت قرار دیتا ہے (۲۱،۱۰۷) اب ایک غیر مسلم یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ کیسے مان لیا جائے کہ آپ کے نبی پوری کائنات کے لیے رحمت ہیں اور پھر یہ کہ وہ غیر مسلموں خصوصا اہل یورپ کے لیے کیسے رحمت ہو سکتے ہیں ہیں ؟ سوال نہایت اہم ہے اور ہمیں دلائل کے ساتھ وضاحت کرنا ہوگی کہ واقعی نبی رحمتﷺ پوری کائنات بشمول اہل یورپ کے لیے بھی رحمت ہیں اور ظاہر کہ دلائل بھی وہ پیش کرنا ہوں گے جو خود اُن کیا اپنے اہل علم کے ہوں تاکہ وہ انہیں تسلیم کرسکیں۔ جہاں تک کائنات کا تعلق ہے تو آج کی جدید تحقیق نے ثابت کردیا کہ ہماری زمین جس کہکشاں کا حصہ ہے اُس میں موجود ستاروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ہمیں صرف انہیں گننے کے لیے چھ ہزار سال درکار ہیں اور اگر ہم روشنی کی رفتار سے سفر کرسکیں تو ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک جانے کے لیے کروڑوں سال درکار ہوں گے۔ ہماری کہکشاں ملکی وے کے قریب ترین کہکشاں اینڈرومیڈا ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں پچیس لاکھ نوری سال درکار ہیں۔ عدم سے وجود میں آنے والی اس کائنات کی وسعت کا اندازہ کریں کہ ایک اندازے کے مطابق ۲۴۰ بلین کہکشائیں موجود ہیں ۔ اسی لیے خدا نے اپنے آپ کو مشرقوں اور مغربوں کا رب قرار دیتا ہے (۵۵،۱۷)۔ ابھی سائنسی تحقیق سرگرداں ہے لیکن قرآن نے بتا

دیا ہے کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں بلکہ کائنات میں دیگر سیاروں پر بھی موجود ہو سکتی ہے اور اس کا بھی امکان موجود ہے مختلف سیاروں میں موجود مخلوق ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کرسکے (۲۹،۴۲ اور ۱۶،۴۹)۔ قرآن نے یہ واضع کر دیا ہے کہ انسان کائنات کی سب سے اعلیٰ اور بہترین مخلوق یعنی اشرف المخلوقات نہیں، اگرچہ وہ اکثر میں سے بہتر ہے لیکن انسان سے بھی برتر مخلوق کائنات میں موجود ہے (۷۰، ۱۷۔خدا کائنات میں تخلیقی اضافے کرتا رہتا ہے (۱،۳۵)۔ وہ ایسی مخلوق پیدا کرتا رہتا ہے جو علم انسانی میں بھی نہی ہوتی (۱۶،۸)۔ جب خالقِ کائنات نے حضورﷺ کو پوری کائنات کے لیے رحمت قرار دیا ہے تو اس میں صرف ہماری زمین شامل نہیں اور نہ ہی حضورﷺ کی نبوت اور رحمت صرف اس زمین تک ہی محدود ہے بلکہ جہاں جہاں تک خدا کی خدائی ہے وہاں وہاں تک حضورؐ کی مصطفائی اور رحمت ہے۔ جہاں بھی زندگی جس صورت میں میں ممکن ہے یا مستقبل میں موجود ہوگی حضورؐ کی رحمت و نبوت وہاں کے تقاضوں کے مطابق کسی نہ کسی طرح وہاں یقیناً موجود ہوگی۔

اب سوال یہ کہ حضورؐ اہل یورپ کے لیے کیسے رحمت ہیں؟ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام نے مروجہ نظریات میں جکڑے ہوئے انسانوں کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کا پیغام دیتے ہوئے بار ہا کہا تتفکرون یعنی سوچا کرو جس سے انسانوں کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کا سائنسی انداز فکر ملا جس کی

بدولت انسان آج ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مذہب کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اندھی تقلید کو مسترد کرتے ہوئے انسانوں کی سوچوں پر لگے تالے کھول کر وہ دین پیش کیا جو مذہب کے لیے ایک چیلنج تھا۔ جو کسی خوف، معجزے یا مافوق الفطر تمحرکات کی بجائے یہ پیغام دے رہا تھا کہ اسے بھی اندھے اور بہرے بن کر تسلیم نہ کرو بلکہ غور و فکر اور دل و دماغ کے اطمینان Conviction کے بعد تسلیم کرو (۲۵،۷۳)۔ یہ بھی بہت قابل غور بات ہے کہ نبی رحمتؐ کی وساطت سے دنیا کو جو کتاب ملی وہ کوئی ایسی کتاب نہیں کہ جس میں مذہبی رسوم کو ادا کرنے کی تفصیل ہو بلکہ یہ ایک صحیفہ انقلاب اور کتاب زندگی ہے جس کی بدولت یورپ کو تاریک دور سے نجات ملی اور مسلمانوں کے سائنسی انداز فکر اور علم سے فیض یابی کرتے ہوئے وہ ترقی کی اس شاہراہ پر گامزن ہوئے جس پر سفر طے کرتے ہوئے وہ آج اس مقام پر موجود ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ اس حقیقت کا اعتراف خود اہل یورپ کرتے ہیں۔ آپؐ کے اُس انقلاب کا پوری دنیا نے اعتراف کیا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے آپ کو اس پر خراج عقیدت پیشکرتے ہیں۔ اس طویل فہرست میں لارڈ مائن، مائیکل ایچ ہارٹ، لیونرڈ کارلائل، براؤن، سٹیفن سن، سمتھ، سر ولیم میور، سپالڈنگ، ریمنڈ لبروگ، ڈاکٹر راوڈن، گبن، سر رچرڈ گریگوری، برناڈ شاہ، گوئٹے، برگساں، کیتھلین بلس، لیمیرٹے، ہملٹن گب، جوزف سیسچ، آرتھر گیلمین، ون کریمر، بوڈلے، رابرٹ گولیک، جوزف نونان اور ایک طویل فہرست ہے کہ کالم

کی تنگ دامنی حائل ہے اور وہ سب تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اس یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضورؐ اہل یورپ کے لیے بھی رحمت ہیں۔

یورپ کے بادشاہوں LEO 1 (717-741) , LEO V (813-820), SCOTUS ERIUGENA (815-877) OTTO II (955-983), SYLYESTER II (996-1003), BERENGAR OF TOURS (999-1088) ROGER I (1031- 1101), JOHN XVII (1003-1009), GREORY VII (1073-1085) PETER ABELARD (1079-1142), ROGER III (1174-1213), FREDERICK BARBAROSSA (1152-1190)

اور کلیسا کے پاپاؤں نے قرآن پڑھا اور 788 - 1200 تک اس کا طرز جہاں بانی اختیار کرکے زمینوں، سمندروں، ہواؤں اور فضاؤں پر چھا گئے۔آٹھویں صدی عیسوی سے پانچ سو سال بعد تک عربی یورپ کی علمی زبان اور قرآن یورپ کا ضابطہ حیات رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عربی ہی نوع بشر کی سائنسی زبان رہی ہے۔ تمام کتابیں عربی میں لکھی جاتی تھیں۔ یورپ کے جو لوگ تکمیل علم کرنا چاہتے تھے وہ عربی زبان سیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ بحوالہ BRITISH RESEARCH CHAPTER 1. PAGE 4 بارہویں صدی عیسوی کے فضلائے یورپ کی سوانح عمریوں سے یوں محسوسؐ ہوتا ہے کہ جیسے ان سب نے قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر اختیار کرلیا تھا

AMERICAN RESEARCH P. 124

اہل امغرب خود اعتراف کرتے ہیں کہ عظمت کے اعتبار سے کوئی زبان قرآن کا

مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی برتری اس کا ذخیرہ الفاظ اور اسلوب ہے۔ اس کی صرفی و نحوی خصوصیات کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں (HISTORY OF ISLAM. CHICAGO UNIVERSITY P. 37) جدید سائنس اور علوم و فنون کو اپنے فہم کے اظہار کے لیے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ عربی میں عبرانی اور آرامی زبانوں ان کے (CARNEGIE RESEARCH. P. 18, 417, 551) سے بہت بہتر تھی اہل علم مانتے ہیں کہ ہم سائنس کا قرآن سے تعلق قائم کیے بغیر اس کا صحیح ادراک کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ (HISTORY OF ISLAM, CHICAGO UNIVERSITY P.133) زندگی کا شائد ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس میں قرآن نے مغربی روایات کو مالا مال نہ کیا ہو۔ سائنس طب، صنعت و حرفت، تجارت وایجادات بلکہ سارے علوم کا علمی و فنی ذوق قرآن سے حاصل ہوا ہے۔ اگر جدید سائنسی اصطلاحات سے صرف نظر کر بھی لیا جائے تو قرآن کا زندگی میں جو علمی حصہ ہے اس کی حوالہ جاتی فہرست ہی کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے اور پھر بھی وہ نامکمل رہے گی۔ (BRITISH RESEACH P. 42) سائنس پر قرآن کے احسانات کا اہل یورپ اعتراف کرتے ہیں ۔ قرآن نے ایسے سائنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی تصورات دیئے ہیں جس کا ان کی زبان پر اثر پڑا ہے۔ انگریزی زبان میں آج بھی ایک ہزار سے زائد عربی کے الفاظ کی موجودگی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے (BRITISH REDEACH VOL 2, P. 134) یورپی سائنسدان Roger Bacon نے اہل یورپ کو نصیحت کی سائنسی ترقی کے لیے عربی زبان سیکھیں اور مسلمان سائنسدانوں کی کتب

تھے اور آج کی سائنسی ترقی ان کی Pioneer پڑھیں۔ مسلمان سائنس کے میدان میں

(Vicki Megh BBC FOCU Jan 20014 Page 17) مرہون منت ہے

یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کے بغیر انسانی تہذیب اس حد تک نہ پہنچتی جس پر پہنچ کر وہ ارتقاء کی تمام سابقہ حالتوں پر سبقت لے گئی۔ قرآن میں ایسے محکم اصول موجود ہیں جن کی بنیاد پر پوری دنیا کے ملکوں اور قوموں کی تشکیل نو ہو سکتی ہے۔ دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ جدید سائنس کا موجد یونان تھا لیکن جدید تحقیقات سے یہ ناقابل تردید حقیقت سامنے آئی کہ یونان نے بعض نظریات ضرور قائم کیے تھے لیکن تجرباتی علم کو عمومی طور پر اختیار کرنا یونانی مزاج کے خلاف تھا۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے معروضی تحقیقات اور تجربی معلومات کو

۔ (BRITISH RESEARCH VOL 2. P. 134) لازم قرار دیا ہے۔

اگر اہل یورپ حضورؐ کے پیام رحمت سے مستفیذ ہو کر ترقی کر سکتے ہیں تو موجودہ زمانے کو بھی کتاب اللہ کی روشنی میں حل کیا Contemporary Problems کے مسائل جاسکتا ہے۔ کلام اللہ انسانوں کے لیے زمان و مکاں کے ہر دور میں رہنمائی ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہ ہماری شاہراہ زندگی پر درست سمت میں Road Map اور آخرت میں کامیابی کا ہے۔ یہ کامیاب زندگی Navigator سفر کے لیے ہمارا

ہے۔یہ صحیفہ فطرت ہے Standard Operating Procedure گذارنے کے لیے جو انسان کو اُس کے مقام سے آشنا کرتی ہے۔ کلام اللہ ہمارے پاس ہو بہو اسی شکل میں پہنچا جس طرح وحی الٰہی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسے ترتیب دیا۔ نزول قرآن کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے اسے تسخیر جہاں کی بجائے برکت، تسبیح اور ثواب حاصل کرنے لیے رکھ چھوڑا جبکہ اہل مغرب نے اس پر غور و فکر کیا اور انہوں نے چاند کی تسخیر کے بعد مریخ پر کمند ڈال دی ہے۔ اگر ہم بھی اس پر غور و فکر کریں تو عروج حاصل کر سکتے ہیں ۔ روش محشر ہم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے قرآن کے ساتھ کتنا تعلق قائم کیا تھا (۴۳،۴۴) اور حضور ﷺ اللہ سے اپنی امت کی شکائیت کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا (۲۵،۳۰) ۔اس لیے ہم پر فرض ہے کہ ہم قرآن میں غور و فکر اور تدبر کریں۔ قارئین ایک کام کریں جس کے لیے آپ کے صرف چند لمحے صرف ہوں گے۔ باوضو ہو کر قرآن حکیم کا کوئی بھی مترجم نسخہ لیں اور سورہ الحدید کی آیت سولہ (۵۷،۱۶) غور سے پڑھیں اور سوچیں ،اگر آپ نے اسے دل کی گہرائیوں سے پڑھا تو آپ کی زندگی بدل جائے گی۔ ایک حدیث نبویؐ کے مطابق ہر مسلمان اپنے پاس ایک قرآن کا نسخہ ہونا چاہیے۔ حاصل بحث اور گذارش یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے پاس قرآن حکیم کا اپنی زبان میں مترجم نسخہ ہو اور جب بھی کوئی آیت پڑھیں اُس پر بقول مولانا محمد علی جوہر نشان لگاتے جائیں تاکہ ایک تو حوالے یاد رہیں اور دوسرا یہ جائزہ بھی لے سکیں کہ آپ نے کتنا مطالعہ اور تدبر کیا ہے۔ حضور ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ

ہم قرآن کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط کریں اور یہ تعلق ہمہ وقت قائم رہنا چاہیے۔

کیونکہ بقول حکیم الامت ؒ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

افکار تازہ مکالمہ کی ضرورت

دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور اسلام فوبیا کے مہیب سائے سویڈن جیسے پر امن، روشن خیال اور آزاد معاشرہ پر بھی چھا رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں مساجد پر حملے اور آتش زنی کے واقعات نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے جب دنیا بھر میں منفی رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے تو سویڈن اُس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جب یہاں سے مسلمان گھرانوں کے نوجوان شام اور عراق میں لڑنے کے لیے جائیں گے اور پھر واپس آئیں گے تو اس ملک کے لوگ متفکر کیوں نہ ہوں گے جنہوں نے دو صدیوں سے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی ہے۔ جب لاہور سے ایک بوڑھی سویڈش خاتون جو وہاں کی بچیوں کو صحت عامہ کی تعلیم دے رہی تھی اس کی لاش یہاں بھیجیں گے تو کیا رد عمل ہوگا۔ جب اس پر امن معاشرہ میں جہاں نہ صرف ہر طرح کی مذہبی آزادی میسر ہے اور ہر طرح کا حکومتی تعاون میسر ہو وہاں انتہا پسندی کی سرگرمیوں سے پر سکون ماحول کو بدلنے کی کوشش کریں تو دوسری جانب بھی نسل پرست اور انتہا پسند عناصر کو کھل کر کام کرنے کو موقع ملے گا۔ رشدی کی کتاب کو شائد چند لوگ ہی پڑھتے اور اسے وہ پذیرائی کبھی نہ ملتی جو ہماری وجہ سی اسے ملی ہے۔ فرانس کا میگزین صرف چھ ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا اور کوئی اسے جانتا تک نہ تھا مگر اب وہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوا ہے اور دھڑلے سے اس نے

سرورق پر رسول اکرمؐ کا کارٹون شائع کیا ہے اور ہم بے بسی کے تصویر بنے دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس کے دفتر پر حملہ نہ ہوتا تو کوئی اسے توجہ ہی نہ دیتا۔ رشدی کی کتاب کی طرح اسے بھی شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے والے کون ہیں۔ سوچنے کا مقام ہے کہ توہین کا باعث کون ہے۔ امن کے دین کا چہرہ کس نے مسخ کیا ہے۔ جو غیر ہیں وہ تو اپنا کام کریں گے ہی مگر یہاں تو اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں قتل و غارت اور جتنا انسانی خون بہایا گیا ہے اس میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے اور زیادہ کرادر انہی کا ہے جو آج حقوق انسانی کے علمبرادر ہیں۔ صرف گذشتہ سو سال پر نگاہ دوڑایئے صورت حال واضح ہو جائے گی۔ دونوں عظیم جنگوں میں مسلمانوں کا کوئی کرادر نہیں تھا اور ان میں جو لاکھوں انسان مرے ان کا خون کن کی گردن پر ہے۔ جاپان پر دو ایٹم بم بھی مسلمانوں نے گرائے جس سے لاکھوں انسان مرے تو تھے ہی سالوں بعد تک معذور پیدا ہوتے رہے۔۔برطانیہ، سپین، اٹلی، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک نے دوسرے ممالک کو اپنا غلام بنایا اور جب انہوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا چاہی انہیں موت کی نیند سلایا جاتا رہا اور ایسے انسانوں کی تعداد کا شمار بھی نہیں کیا جاسکا۔ اسی فرانس نے الجزائر میں پندرہ لاکھ کے قریب انسانوں کو قتل کیا۔ مشرق وسطیٰ میں انسانی خون سے ہولی کھیلنے والوں کی

پشت پناہی کون کر رہا ہے۔ دنیا کے منصفوں اور حقوق انسانی کے علمبرداروں کو کشمیر میں بہنے والا خون کیوں نظر نہیں آتا۔ پیرس میں دہشت گردی کا جو واقعہ ہوا بہت بُرا ہوا لیکن اُن کے ساتھ یکجہتی کے لیے دنیا امڈ آئی لیکن فلسطین اور کشمیر پر کیوں خاموش ہیں۔جب ناروے میں وہاں کے باشندے نے ایک سو سے زائد لوگوں کو قتل کیا اُس کے خلاف ایسا رد عمل کیوں نہیں آیا۔ انصاف اور حقوق سب کے لیے برابر ہونے چاہیے ۔ اہل یورپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح کی دنیا چاہتے ہیں۔ یورپی میڈیا کو بھی سمجھداری اور ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے اور جلتی پر تیل ڈالنے کی بجائے نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہیے اور کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے ۔پوپ فرانس نے بالکل درست بات کی ہے کہ آزادی رائے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کے مذہب کا تمسخر اڑایا جائے۔ انھوں نے بالکل درست کہا کہ اگر کوئی میری ماں کو برا کہیں تو میرا مکہ بھی کھانے کے لیے تیار رہے۔فرانس کے میگزین کے حملہ کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس کی مذمت کی تھی اور اپنی ہمدردی کا اظہار کیا تھا مگر یہ قابل مذمت ہے کہ اسی میگزین نے توہین آمیز کاٹون دوبارہ شائع کرکے اپنی اس ہمدردی کو اب نفرت یعنی میں JE SUIS MUHAMMAD میں بدل دیا ہے۔ اب دنیا بھر کے مسلمانوں نے محمد ﷺ کے ساتھ ہوں شروع کرکے اپنے جذبات کے اظہار کا پرامن انداز اپنایا ہے۔

اسلام جو کہ اعتدال کا دین ہے اور خود رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بہترین راستہ اعتدال کا ہے لیکن خود کو مسلمان کہلانے والوں نے اسے ایک انتہا پسند اور متشدد مذہب کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں خوش نصیب ہیں کہ انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے آلہ کار خود مسلمانوں کی صفوں میں دستیاب ہیں۔ پاکستان کے خلاف برسرپیکار عناصر ہوں یا عراق اور شام میں نام نہاد جہاد کرنے والے ، انہیں اسلحہ اور مدد کون دیتا ہے اب یہ کوئی مخفی بات نہیں رہی۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی اکثریت جو کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کو مسترد کرتی ہے انہیں مزید سمجھداری سے کام لینا ہے بالخصوص وہ جو یورپ میں مقیم ہیں۔ قرآن کی وہ تعلیمات جو امن ، انسان دوستی اور مذہبی آزادی کا درس دیتی ہیں انہیں اپنے کرادر اور عمل سے اجاگر کرنا ہوگا۔ انہیں ان ممالک کے قوانین کا احترام کرنا چاہیے۔ اسلام فوبیا کو اپنے اچھے کرادر و عمل، مقامی آبادی کے ساتھ اچھے اخلاق، حلم، برداشت اور دور مکی میں رسالت مآبؐ کی حکمت عملی سے رہنمائی لینی چاہیے۔ اپنے بچوں کو انتہا پسندوں کے ہتھے چڑھنے سے بچائیں۔ اسلام کی اصل تعلیمات اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں قرآن حکیم کی اس تعلیم کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کسی ایک نسان کا قتل تمام انسانیت کے قتل کے برابر ہے (۵،۳۲)، تمام انسان صرف انسان ہونے کی وجہ سے قابل عزت ہیں (۷۰ ،۱۷)، دوسروں کے مذہب، معبدوں کا احترام کرو۔ دوسروں کی عبادت گاہوں کا حفاظت کرو (۴۰،۲۲) ۔ جہاں اللہ کی آیات کا مذاق

اٹریا جارہا ہو وہاں سے وقتی طور پر الگ ہو جاؤ (۱۴۰:۴) یہ حکمت عملی اس وقت بھی اختیار کی جانی چاہیے جب کارٹون جیسے واقعات سامنے آئیں۔ تشدد اور جبر کی بجائے مہذہب انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروائیں۔ یورپ کی مسلم تنظیمیں، قانون اور سیاست میں متحرک شخصیات اور اہل علم یہ جانتے ہیں کہ یورپ میں انسانی حقوق اور یکساں سلوک پر مبنی Discrimination, Violation, Bullying, دوسرے قوانین کے تحت اپنی بات کی جا سکتی ہے۔ قائد اعظم کی حکمت عملی کو اپنانے کی ضرورت ہے جنھوں نے برطانوی سامراج کے قوانین کے اندر رہ کر کامیاب جنگ لڑی اور ایک دن کے لیے بھی جیل میں نہ گئے۔

یورپ میں مقیم مسلمانوں کو مقامی باشندوں کے ساتھ اپنے بہتر روابط قائم کرکے اپنا نقطہ نظر بجھانا چاہیے۔ الگ تھلگ رہنے کی بجائے انہیں اپنے سماجی اور مذہبی اجتماعات میں شمولیت کی دعوت دینی چاہیے۔ قرآن حکیم پر غور کرکے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ حج جو کہ اسلام کا پانچواں رکن ہے اس کے بارے میں جتنیبھی آیات ہیں ان میں انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کسی جگہ بھی اُن میں صرف مسلمانوں یا مومنینکو مخاطب نہیں کیا گیا۔ اسلام تمام مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیتا ہے جس کی تعلیمات قرآن حکیم میں موجود ہیں جسے مولانا الطاف حسین حالی نے یوں کہا ہے کہ

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدا کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

سویڈن میں کچھ پاکستانی تنظیموں نے اس ضمن میں قابل قدر کوششیں شروع کی ہیں۔ سٹاک ہوم کے ایک نواحی علاقے آلبی میں پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن کے صدر لیاقت خان نے دیگر ممالک کی کچھ تنظیموں کے ساتھ مل کر مسلمان اور مسیحی مذہبی رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر حالات حاضرہ پر ایک دوسرے کے خیالات جاننے اور تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کیا۔ اس اہم نشست میں سویڈن میں پاکستان کے سفیر جناب طارق ضمیر بھی شریک ہوئے جبکہ شرکاء نے بھی اپنے سوالات کیے۔ اسی نوعیت کی ایک اور نشست عید میلادالنبی ﷺ کے سلسلہ میں مسجد اہل بیت بیسٹا میں سید ہادی حسن کی قیادت میں ہوئی۔ اس نشست میں مسٹر بیورن وان سیڈون جو کہ سویڈن کی قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر جو کہ سابق وزیر دفاع و تجارت بھی رہے ہیں اور اس وقت سویڈش اسمبلی میں سوشل ڈیموکریٹ جماعت کے گروپ لیڈر ہیں شریک ہوئے۔ سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے ایک اور رہنما اور مقامی بلدیہ کے کونسلر لارش بینٹیین سن بھی شریک ہوئے۔ مجلس مذکراہ میں سویڈن میں پاکستان کے سفیر جناب طارق ضمیر، ڈاکٹر عاف کسانہ اور سید محمد علی نے بھی حصہ لیا۔ شرکاء نے اتفاق کیا کہ چند عناصر کی کاروائیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور اپنا موقف سمجھانے کے لیے آپس میں مکالمہ کی اشد ضرورت ہے۔ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے مابین غلط فہمیوں کو دور کرنے، اور ایک دوسرے کے خیالات کو جاننے اور ایک پرامن معاشرہ

کے قیام کے لیے مکالمہ بنیاد بن سکتا ہے۔

قابل عمل حکمت عملی

دنیا بھر کے مسلمان مضطرب اور غم و غصہ میں مبتلا ہیں کہ بار بار توہین آمیز خاکے کیوں شائع کیے جارہے ہیں۔ اس کے سد باب کے لیے کیا کریں۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ خاکے شائع کرنے والے ممالک کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس کے ساتھ گوگل، یو ٹیوب اور انٹرنیٹ کے ان تمام ذرائع کا بھی بائیکاٹ کیا جائے لیکن کیا یہ سب ممکن ہے اور کیا اس سے یہ سلسلہ رک جائے گا؟ امت مسلمہ نے گذشتہ پانچ صدیوں سے سائنسی، علمی اور تحقیق کے میدان میں کچھ نہیں کیا اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کھانے پینے سے لیکر جان بچانے کی ادویات اور روزمرہ زندگی کی ہر قابل استعمال چیز کے لیے دوسروں کے مرہون منت ہیں ان حالات میں ہم ان کا بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں بلکہ اگر وہ ہمارا بائیکاٹ کردیں تو ہمارا گذرا مشکل ہے۔ اسرائیل کے بائیکاٹ بھی مہم بھی چلائی جاتی ہے مگر ہر وہ شخص جس نے سمارٹ فون رکھا ہے وہ اسرائیل کا وائبر استعمال کررہاہے چالیس سے زائد اس کی ایسی ایجادات ہیں جو ہماری روز مرہ کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ پھر ہم بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں۔مذہبی جماعتوں کی جانب سے یہ مطالبہ بھی ہوتا ہے کہ ان ممالک کے سفیروں کو ملک بدر کیا جائے جنھوں نے خاکے شائع کیے ہیں۔کیایہ بھی ممکن ہے؟ فرانس کے

میگزین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے دنیا بھر کے بہت سے ممالک نے خاکے شائع کیے ہیں کیا سب کے ساتھ تعلقات ختم کر دیئے جائیں۔ اُن ممالک کے ساتھ کاروبار اور وہاں مقیم مسلمان کیا کریں۔ کیا وہ تحریک ترک موالات کی پیروی کرتے ہوئے وہاں سے نقل مکانی کر جائیں۔ پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتوں کو تو سیاست چمکانے کا موقع ملنا چاہیے۔ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ وہ نہ صرف عوام کے مذہبی جذبات کے ساتھ کھیل رہے ہیں بلکہ توہین آمیز خاکوں کی مہم کی تشہیر کر رہے ہیں۔ ان مذہبی جماعتوں کی یورپ میں موجود شاخوں اور یہاں رہنے والے ان کے علماء کا ردعمل مختلف کیوں ہے۔ آج تک مظاہروں سے کوئی ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے مظاہروں سے مخالفین کے مقاصد پورے ہوتے ہیں اور ہم ان کی مقبولیت اور دنیا بھر میں پھیلانے کا باعث بن جاتے ہیں۔ فرانس کے اس میگزین کو چند لوگ جانتے تھے مگر اب کو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہو رہا ہے۔ تو پھر نقصان کس کا ہوا۔

دنیا میں یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ ہر ایک نظریہ اور تہذیب اپنے تسلط اور حریف کو مٹانے کے لیے برسرپیکار رہتی ہے۔ جب ہمارے پاس طاقت تھی ہم نے بھی اس کا اظہار کیا اور آج بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ اس مشن کے تحت مسلمانوں میں ایسی جماعتوں کی سرپرستی

اور پشت پناہی کی جاتی ہے جو شدت پسند نظریات کو طاقت کے زور پر جبر سے نافذ کر رہی ہیں تاکہ اسلام کی بدنامی ہو۔ مسلمان عجیب مشکل سے دوچار ہیں اور ان ناگفتہ بہ حالات میں رہنمائی کے لیے ان کے پاس قیادت بھی موجود نہیں۔ عالمی سطح پر ان کی آواز بلند کرنے والی کوئی شخصیت موجود نہیں۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ کوئی دانشور، محقق، فلسفی اور مشکل حالات میں قوم کی درست سمت میں رہنمائی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ کوئی اقبال میسر نہیں جو ان کے مردہ دلوں کو گرماتے ہوئے پھر سے امید کا پیغام دے۔ کوئی سرسید نہیں جو زوال کا شکار قوم کو پس ماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔ کوئی جناح نہیں جو ان کا مقدمہ لڑ کر کامیابی دلا سکے۔ کوئی احمد بن بیلا اور غازی کمال پاشا نہیں جو انہیں منظم کر سکے۔ کوئی ایسا دیدہ ور نظر نہیں آتا جو دور حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے فلاح اور کامیابی کی جانب لے جائے۔ لیکن مایوسیوں کے ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی مینارہ نور بن کر رہنمائی موجود ہے اور وہ ہے سیرت رسول عربی ﷺ اور اللہ کی آخری کتاب۔ ان سے رہنمائی لیتے ہوئے ملت کا ہر فرد اس کے مقدر کا ستارہ بن سکتا ہے اور قیادت کا خلا بھی پُر ہوتا جائے گا۔

یہ ایک مسلمہ اور بنیادی حقوق انسانی میں ہے کہ دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جائے اور آزادی رائے کا مطلب دوسروں کے مذہب اور نظریات کی توہین نہیں۔

ایک حقیقت ہمیں یہ بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اہل مغرب کا انداز اور طرز زندگی ہم سے بہت مختلف ہے۔ یہ اپنے مذہبی رہنماؤں اور اکابر کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ جو کچھ یہاں حضرت آدم، حضرت عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کے بارے میں لکھا اور خاکے بنائے جاتے ہیں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔اس رو میں بہہ کر وہ ہمارے رسول پاکؐ کے بارے میں بھی ویسا کر گذرتے ہیں۔ اس صورت حال کا حل جذبات کی بجائے حکمت عملی میں ہے۔ جو حالات آج ہمیں درپیش ہیں قرآن حکیم ہماری یہاں بھی رہنمائی کرتا ہے۔ توہین آمیز خاکے ہوں یا اسلام دشمنوں کا کوئی اور دشنام طرازی قرآن مجید کی سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ میں وہ رہنما اصول بتا دیا گیا ہے کہ جذباتی ہونے اور قتل و غارت کی بجائے ایسے عمل سے کنارہ کشی کر لی جائے اور اپنے آپ کو اس سے دور رکھا جائے۔ سورہ فرقان میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھا جائے۔جب اس طرح کی حرکات پر کوئی توجہ ہی نہیں دی جائے گی تو رفتہ رفتہ یہ عوامی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ دوسرا حل سفارتی اور قانونی محاذ میں ہے۔

اسلامی ممالک کے سفیر مشترکہ حکمت عملی کے تحت سفارت کاری کے میدان میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں جن سے بہتر مثبت نتائج نکل سکتے ہیں اور اس کی ایک مثال بھی موجود ہے جند سال قبل جب ڈنمارک کے ایک اخبار نے توہین آمیز خاکے شائع کیے اور بعد میں سویڈن کے کچھ اخبارات نے انٹرنیٹ پر بھی شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو سٹاک ہوم میں موجود مسلم ممالک کے سفیروں نے اس

وقت کی سویڈش وزیر خارجہ سے ملاقات کرکے اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور سویڈش حکومت سے اپنا کردار ادا کرنے کو کہا۔ جس پر سویڈش حکومت نے ان اخبارات کے انٹر نیٹ سرور کو بند کرکے اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ ایسی ہی سفارت کاری بروئے کار لانا ہو گی۔

اسلام دشمنوں کے ایک طبقہ کو یہ اچھی طرح سے علم ہے کہ مسلمان ایک جذباتی قوم ہیں اور جب بھی ان کے مذہب کے بارے میں بات کیجائے تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں اس لیے وہ ہمیں مشتعل کرتے ہیں اور ہم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے مذموم مقاصد پورا ہونے پر اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں اس لیے بہترین حل یہی ہے کہ اس طرح کی حرکات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے تو وہ اپنی موت آپ مر جائے گی۔ ہمارے ہاں ضرب المثل بھی ہے کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور گذرنے والے اپنے راستہ پر چلتے رہتے ہیں۔ یورپ کے بے شمار اہل دانش اور صاحبان علم وحکمت نے حضور ﷺ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے اور آپ کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے جس سے سب آگاہ ہیں اس لیے آپ کے نام نامی کو کوئی بھی میلا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی مہم سے بھی آپ کی سیرت مطہرہ پر کوئی حرف نہیں آسکتا بلکہ یہ ہمارے لیے موقع ہے کہ ہم اخلاق اور اچھے طرز عمل سے یورپی عوام کو اسلام کی حقانیت اور نبی رحمتؐ کی سیرت طیبہ سے روشناس کروائیں ممکن ہے کہ انہی میں ایسے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں

جو اس خطہ میں اسلام کی سربلندی کے لیے معاون ہوں اور پاسباں مل جائیں کعبہ کو صنم خانے سے۔

وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

ملین ڈالر کا سوال ہے کہ دنیا کوئی ایک ملک بھی اگر اُن کا ساتھی نہیں اور ساری دنیا دہشت گردی کے خلاف صف آرا ہے تو داعش، بوکوحرام، القائدہ اور طالبان کو اسلحہ کون دیتا ہے؟ان دہشت گرد تنظیموں کے پاس انتہائی جدید اسلحہ کہاں آیا ہے۔ انہیں مالی وسائل کون مہیا کرتا ہے۔ انہیں ذرائع آمدورفت اور میڈیا تک رسائی کس طرح میسر ہے۔ خوارک، ادویات اور دوسری اہم چیزیں جن کے بغیر ایک تربیت یافتہ فوج بھی نہیں لڑ سکتی، انہیں کس طرح دستاب ہیں۔ امریکہ اور مغربی ممالک کے اس قدر اہم وسائل اور ٹیکنالوجی رکھنے کے باوجود انہیں قابو کرنے میں کیوں ناکام ہیں۔ شام میں لڑے والوں کو ہتھیار اور دیگر وسائل کی فراہمی کہاں سے ہو رہی ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ عراق، شام، ترکی اور سعودی عرب کی مخالفت کے باوجود داعش نے وہاں قبضہ کیسے جمایا ہے۔ ان نام نہاد جہادیوں نے کبھی اسرائیل کے خلاف کیوں کاروئی نہیں کی۔ امریکہ، نیٹو اور پاکستان کی مخالفت اور ان کے خلاف کاروائیوں کے باوجود طالبان ابھی تک کیسے ڈٹے ہوئے ہیں۔ اگر ان سوالات کے تسلی بخش جوابات سامنے آجائیں تو دور حاضر میں دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کی اصلیت کا پتہ چل جائے گا۔

بہت سے اہل دانش کے اٹھائے ہوئے یہ سوالات بھی اہم ہیں کہ جنوبی افریقہ میں جب دنیا بھر کے نمائندوں نے مل کر اسرائیل کو نسل پرست ریاست قرار دینے کی طرف پیش رفت کی ہی تھی کہ عالمی منظر گیارہ ستمبر کے واقعہ سے بدل گیا۔ ۲۰۱۳ء میں ملائیشیا کی ایک عدالت نے اسرائیل کو نسل پرست قرار دیا اور اس سے قبل مہاتیر محمد بھی اسرائیل پر سخت تنقید کیا کرتے تھے تو ملائیشیا کا جہاز ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ ہی نہیں مل سکا۔ ۲۰۱۱ء میں ناروے کی لیبر پارٹی نے اسرائیل کے بائیکاٹ کا اعلان کرنے کے بعد اوسلو میں لیبر پارٹی کے یوتھ ونگ پر حملہ کرکے جماعت کی قیادت سمیت ۷۷ افراد کو قتل کر دیا گیا۔ سویڈن کی جانب سے فلسطین کو تسلیم کرنے کے بعد سویڈن میں مساجد پر حملے اور فرانس کی پارلیمنٹ کی جانب سے فلسطینیوں کے حق میں قرارداد کے بعد پیرس کے جریدہ شارلی ابدو پر حملہ کس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ممکن ہے ان واقعات اور ان کے بعد ہونے والے رد عمل پر کوئی تحقیق کرکے اہم انکشافات کر سکے۔ معروف صحافی اور تجزیہ نگار جناب آصف جیلانی نے اپنے ایک کالم میں یورپ میں مقیم مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کا آغاز اور ان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ انہوں نے پیرس کے جریدہ پر حملے میں پوشیدہ ہاتھ تلاش کرتے ہوئے فکر انگیز تجزیہ پیش کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی تبصرہ پاکستان کے ایک سابق سفیر نے ٹیل فون پر گفتگو کرتے ہوئے کیا کہ انھی نادیدہ قوتوں کی طرف اشارہ کیا جو مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے

پر تلی ہوئی ہیں۔

یورپ میں مقیم مسلمانوں پر اس کے اثرات مرتب ہوں گے جس نے پاکستان، مشرق وسطی اور افریقی مسلمان ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور جس سے عراق، لیبیا، شام، مصر اور افغانستان کی مسلم ریاستوں کو تباہ اور ناکارہ بنا دیا ہے تاکہ اس خطہ میں صہیونی اجارہ داری کو کوئی بھی چیلنج کرنے والا نہ ہو۔ یورپی مسلمانوں کو انتہائی سمجھداری سے لائحہ عمل متعین کرنا ہوگا۔ تمام ترمیڈیا وار کے اب بھی یورپی عوام کی اکثریت نسل پرستی اور عالمی سیاست کے مہروں کو سمجھتی ہے اس لیے ان کے ساتھ روابط مضبوط کرکے حکمت عملی سے ہر قدم اٹھانا ہوگا اور کوئی ایسا کام نہیں کرنا جس سے خود اپنے لیے مشکلات پیدا ہوں۔ یورپی مسلمانوں کو نام نہاد جہادیوں سے قطع تعلّق کرتے ہوئے سب پر واضح کردینا چاہیے کہ وہ ہمارے مجاہد نہیں بلکہ ان کے مجاہد ہیں جنھوں نے ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھمایا ہے اور جو ریموٹ کنٹرول سے انہیں چلاتے ہیں۔ انہیں برملا کہہ دینا چاہیے کہ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔ اپنے بچوں کو ایسے عناصر سے بچانا ہوگا جو انہیں دین کی غلط تعبیر و تشریح کرکے اپنے آقاؤں کے مذموم مقاصد کی بھینٹ چڑھانا چاہیں۔ دنیا کی اور اقوام پر بھی بہت مشکل وقت گذرا ہے ان کی مثال سامنے رکھ کر پامردی سے آگے بڑھنا ہوگا۔ جاپان اور جرمنی نے شکست اور تباہی کے بعد کس عزم نو سے جدوجہد شروع

کی اور آج ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دنیا بھر میں آگے نکل گئے ہیں۔ یہودیوں نے یورپ میں بہت مشکل اور بُرا وقت دیکھا ہے۔ انہیں بستیوں سے نکال دیا جاتا تھا لیکن انھوں نے وقت کا سامنا کیا۔ ہر فرد اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور اپنے بچوں کو بہترین جدید تعلیم سے روشناس کرائیں ۔ ایک سادہ سا فارمولا ہے کہ جس یورپی یا کسی بھی ملک میں آپ مقیم ہیں آپ اس ملک میں رہنے والوں کی آمدنی ، تعلیم ، اور دیگر سطحوں کی اوسط سے کم نہ ہوں بلکہ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے اوسط سے بھی بہتر ہونی چاہیے۔ بچوں کو دین کا فہم اور اعتدال کی تعلیمات دیتے ہوئے قرآن کے ساتھ تعلق پیدا کردیں تو سمجھیں کہ آپ نے اپنے حصے کا کام کر دیا۔ جو صدیوں کو جمود توڑنے کے لیے بھی ایک وقت تو درکار ہوگا لیکن اگر درست سمت میں ایک بار قدم اٹھ جائے اور پھر اس پر سفر جاری رہے تو منزل مل ہی جاتی ہے۔

ذرات کو سیمابی کردے گی سبک سیری چھٹ جائے گی رستے کی تاریکی و بے نوری

امن کے متلاشی

دنیااس وقت امن و سکون کی متلاشی ہے کیونکہ انسانوں کے مختلف نظریات میں بٹنے، عدم برداشت اور احترام باہمی کے نہ ہونے سے سکون ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ ان حالات میں بین المذاہب مکالمہ کی اشد ضرورت ہے تاکہ ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کو سمجھا جائے اور غلط فہمیوں کی خلیج کم ہو اور سب ایک پر امن معاشرہ میں اپنے اپنے دین اور سوچ کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اسی کی تلاش میں سٹاک ہوم میں ایک امن کانفرس منعقد ہوئی۔ اس امن کانفرس کے محرک سویڈش برسر اقتدار سیاسی جماعت سوشل ڈیمو کریٹ کے نوجوان رہنما شفقت کھٹانہ ایڈووکیٹ تھے۔ وہ ہر سال میلاد کانفرس منعقد کرتے ہیں لیکن اس بار احباب کے مشورہ سے انہوں نے دیگر مذاہب کے لوگوں اور سویڈش سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو بھی مدعو کیا تاکہ اس امر کا عملی اظہار ہوسکے کہ رسول پاک ﷺ صرف سلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں۔ میلاد کی اس تقریب کو امن کانفرس سے منسوب کرتے ہوئے سویڈش سیاسی جماعتوں سوشل ڈیموکریٹ، لیف پارٹی، گرین پارٹی اور ماڈریٹ پارٹی کے رہنما اسٹیج پر موجود تھے۔ دی کامن گراؤنڈ نامی تنظیم کے سربراہ ایمیونوئیل لوتھر رانک جو کہ سیرت نبی ﷺ پر لکھی گئی کتاب پر صدر پاکستان سے صدارتی ایوارڈ وصول کرچکے ہیں، بھی شریک تھے۔

نوجوان مقررین ملک باسط اور ڈاکٹر ذیشان نے سویڈش معاشرہ میں مسلم نوجوانوں کے مسائل اور ان کے بارے میں رائے عامہ کی عمومی سوچ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہاکہ میڈیا کی وجہ سے جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ درست نہیں۔ انہوں نے کہا کہ عراق اور شام میں لڑنے کے لیے جانے والے نوجوانوں کی اکثریت جرائم پیشہ ہے۔
سویڈن میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کی غالب اکثریت امن پسند اور ملکی قانون کا احترام کرنے والی ہے۔ وہ میثاق مدینہ کا بھی حوالہ دے رہے تھے جس کے تحت حضورؐ نے مدینہ کے غیر مسلموں کے ساتھ پر امن رہنے اور انہیں اسلامی ریاست میں مکمل حقوق دیئے جو کہ تاریخ عالم ایک کا روشن باب ہے۔
مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک، عراق، افغانستان، فلسطین، کشمیر میں خون مسلم کی ارزانی اور دہشت گردی کے دوہرے معیار کو لیفٹ پارٹی کے کونسلر برکت حسین نے آڑے ہاتھوں لیا۔ انہوں نے سوال کیا کہ پیرس حملے پر موجود بہت سے سوالیہ نشانات صورت حال کو پیچیدہ بنا رہے ہیں۔ سٹاک ہوم سٹڈی سرکل کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر عارف کسانہ نے بھی کچھ ایسا ہی سوال اٹھایا کہ یہ بتایا جائے کہ داعش، بوکوحرام، طالبان کو کون اسلحہ، مالی امداد، خوارک اور دیگر وسائل مہیا کر رہا ہے۔ سید ذوالفقار شاہ نے سیرت رسول پاکؐ کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرنے اور لائحہ عمل متعین کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مسیحی

محقق ایمیونوئیل رانک نے قرآن حکیم کی آیات کے حوالے دے کر واضح کیا کہ دین اسلام پوری انسانیت کو کنبہ خدا کہتے ہوئے انہیں امت واحدہ قرار دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ آؤ جو چیز سب میں مشترک ہے اس پر اتفاق کرلیں اور حضرت ابراہیمؑ چونکہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں قابل عزت اور احترام ہیں اس لیے اُن کے اسوہ کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ انہوں نے امن کانفرس کی کاوش کا بہت سراہا اور سانحہ پشاور کے معصوم شہداء کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

سویڈش پالیمنٹ میں گرین پارٹی کی ترجمان ایسابیلا ڈینگیزین، سوشل ڈیمو کریٹ پارٹی کے رکن پارلیمنٹ سیرکن کوشے، لیفٹ پارٹی کے کونسلر بیکر اوزنیل، ماڈریٹ پارٹی کے کونسلر جیمی بیکر، اور گرین پارٹی کے کونسلر ڈان گرون سٹروم نے اسٹیج پر مشترکہ پینل کی صورت میں اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے کے باوجود دہشت گردی کے خلاف مشترکہ حکمت عملی پر متفق ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ عدم برداشت اور تشدد سے جمہوریت کو خطرہ لاحق ہے۔ سویڈن میں اسلام فوبیا اور یہودیوں پر حملوں میں اضافہ ہوا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے حالات نے سب کو پریشان کررکھا ہے۔ سویڈش سیاسی رہنماؤں کا کہنا تھا کہ نفرت کو نفرت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں ایسا معاشرہ چاہیے جس میں سب آزادی اور احترام باہمی سے رہ سکیں۔

سویڈن میں

دنیاکے ہر ملک کے باشندے اور تمام مذاہب کے لوگ پر امن رہ رہے ہیں اور چند شر پسند عناصر یہاں کا امن تباہ نہیں کر سکتے۔ اگر مساجد پر حملے ہوئے ہیں تو اگلے روز ہزاروں لوگ مساجد کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جعفر مغل نے شام ور عراق میں لڑنے کے لیے جانے والے نوجوانوں کے حوالے سے مربوط حکومتی پالیسی کی عدم موجودگی کا سوال اٹھایا۔

امن کانفرس کے مہمان خصوصی سفیر پاکستان جناب طارق ضمیر نے بہت اہم خطاب کیا ۔انہوں نے امن کانفرس میں خواتین، بچوں اور مختلف مذاہب کے لوگوں کی شرکت کو سراہا۔ انہوں نے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو قابل عزت قرار دیتے ہوئے اسے حق دیا کہ وہ اپنی مرضی کا دین اختیار کرے اور جو مذہب چاہے اختیار
کرے۔اسلام آخر اور مکمل دین ہے لیکن کسی کو زبردستی اس میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضمن انہوں نے بہت ہی عمدہ مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کی بجائے Latest Version اپنے کمپیوٹر کے لیے ونڈوز کا انتخاب کرنا۔ اگر کوئی ونڈوز کے پرانے ورژن کو بہتر سمجھتا ہے اور اسے ہی اپنانا چاہتا ہے تو اسے کرنے دیں، اسے زبردستی نیا ورژن اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں البتہ اسے دلائل دیں اور قائل کرنے کی کوشش کریں لیکن نہ مانے تو چھوڑ دیں اور یہی معاملہ دین میں اختیار کریں۔ انہوں نے کہا ہمیں عمل سے ثابت کرنا چاہیے کہ ہم بہتر ہیں۔ حضورؐ کے لب و رخسار کی باتیں اپنی

جگہ پر لیکن ہمیں اسوہ حسنہؐ اور آپ کے کردار کو اجاگر کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے نبیؐ کی طرح ہونا چاہیے اور ہماری روز مرہ کی زندگی میں رسول پاکؐ کے کردار کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ آج ہمیں بہت سی مشکلات درپیش ہیں، ان حالات میں ہمیں شعیب ابی طالب میں رسول پاکؐ کا اپنے اہلخانہ اور ساتھیوں کے ساتھ قیام مد نظر رکھنا چاہیے جب آپؐ پر شدید مشکلات اور پریشانیوں کا دور تھا۔ ہمیں ظلم، جبر اور مشتعل کرنے والے مقامات پر رسول پاکؐ کا حلم اور عفو و درگذر مد نظر رکھنا چاہیے۔ تحمل اور برداشت کو فروغ دیں۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیں جس کی سوشل میڈیا کی وجہ سے اور بھی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ انہوں کہا کہ سویڈش اچھے لوگ ہیں، ان سے اچھے مراسم رکھیں اور ہمسائیوں کا خیال کریں۔ ایک اچھے شہری کی طرح مقامی قوانین کا احترام کریں۔ امن کانفرس کے منتظم شفقت شانہ ایڈووکیٹ نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے تاکہ مختلف الخیال لوگوں کے درمیان رابطے بڑھیں۔ امن کانفرس میں شریک ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے مسٹر ڈبلیو پیٹر جو کہ ایک اہم ادارہ سے وابسطہ ہیں کہا کہ اس کانفرس میں شرکت کے بعد میرے خیالات مسلمانوں کے بارے میں بدل گئے ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں اور مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ مسلمان ایک پُرامن دین کے پیروکار ہیں اور دہشت گردی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ واقعی امن کانفرس اپنے مقاصد میں کامیاب رہی اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے اور دیگر

یورپی ممالک میں اس نوعیت کے اجتماعات منعقد کیے جائیں۔

بطلِ حریت شہید کشمیر محمد مقبول بٹ

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

تاریخ انسانی میں بہت بہادر اور نڈر انسان گذرے ہیں لیکن مقبول بٹ جیسا جری اور بہادر انسان شائد ہی تاریخ انسانی میں ملے۔ یہ ایک محض جذباتی جملہ نہیں بلکہ واضح حقیقت ہے کہ اگر کسی کو پھانسی کی سزا سُنائی گئی ہو، جہاں کی حکومت بھی اُس کی جانی دشمن ہو اور وہ پھانسی کی کوٹھڑی توڑ کر دشمن کی قید سے باہر نکلا ہو اور سب نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے پھر ایک بار موت کے منہ میں جانے کی ہمت کرے وہ مقبول بٹ ہی ہوسکتا ہے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مقبول بٹ کو اگر ذرا بھی موت کا خوف ہوتا تو وہ کبھی بھی سزائے موت کے فیصلہ کے ہوتے ہوئے دوبارہ وادی کشمیر میں نہ جاتے۔ انہیں پھانسی دے کر غاصب قوتوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب تحریک آزادی ختم ہوجائے گی اور کشمیری قوم خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی مگر یہ اُن کی خام خیالی ثابت ہوا اور شہید کے خون سے جلنے والے چراغ کی لو سے وادی کشمیر روشن ہونے لگی اور عوامی بیداری کی وہ لہر اٹھی کہ ۱۹۸۸ کے بعد سے کشمیری قوم نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم صرف آزادی چاہتے ہیں۔ ہم نہ ہی ریاست جموں کشمیر کی تقسیم چاہتے ہیں اور نہ ہی

غیر ملکی تسلط تسلیم کریں گے۔ مقبول بٹ نے کشمیری نوجوانوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور علامہ اقبال کے پیغام کو درست ثابت کر دیا کہ

جس خاک کے خمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

انہوں نے سیالکوٹ جموں کی سرحد پر واقع سوچیت گڑھ کے مقام پر مادرِ وطن کی مٹی کو ہاتھ میں لیکر جو حلف اٹھایا تھا اُسے سچ کر دیکھایا۔ اقوام متحدہ کی بے عملی اور مسئلہ کشمیر کے حل میں ناکامی اور تاخیری حربوں سے کشمیری قوم بے زار ہو رہی تھی۔ دنیا کے منصفوں کو کشمیر کی وادی میں بہتے ہوئے لہو کا جب شور سُنائی نہیں دے رہا تھا تو مقبول بٹ نے اپنی قوم کو بتا دیا کہ آزادی مانگنے سے نہیں چھیننے سے ملتی ہے۔ غلامی کے اندھیروں کو اپنے خون کے چراغ جلا کر ہی روشن کیا جا سکتا ہے اور دوسروں پر تکیہ کر کے آزادی کے خواب دیکھنا محض خوش فہمی ہوگا۔ انہوں نے کشمیری نوجوانوں پر واضع کر دیا کہ

مغرب کے سیاستدانوں سے امید نہ رکھ آزادی کی
طاقت سے کشمیر چھڑا یا آرزوے کشمیر نہ کر

آج مقبول بٹ کا نام ایک تحریک کا نام بن گیا ہے۔ کشمیری نوجوان خواہ کسی بھی جماعت سے تعلق رکھتا ہو وہ شہید کشمیر کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں

آزادی کے لیے مصروف جدوجہد ہے۔ مقبول بٹ نے جب یہ دیکھا کہ کشمیری عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اور ناقص منصوبہ بندی کے باعث آپریشن جبرالٹر کی ناکامی، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند کے بعد مسئلہ کشمیر کو سرد خانے میں ڈالا جارہا ہے تو انہوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اپنایا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے ساتھی میجر امان اللہ کے ہمراہ بھارتی زیر قبضہ کشمیر میں جاکر کشمیری نوجوانوں کو تربیت دینا شروع کی۔ ایک مقابلہ میں بھارتی آفیسر امرچند کی کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں قتل کے بعد مقبول بٹ گرفتار ہوئے اور اُن پر مقدمہ چلاکر انہیں پھانسی کی سزا سُنائی گئی۔ جج نے جب اپنا فیصلہ سنایا تو مقبول بٹ نے بڑی دلیری سے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ابھی وہ پھندا نہیں بنا جس سے مقبول بٹ کو پھانسی دی جاسکے۔ اور انہوں نے یہ اس وقت سچ کر دکھایا جب وہ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سری نگر جیل توڑ کر مظفرآباد پہنچے۔ لیکن یہاں آکر بھی اُن پر ظلم و ستم کا دور جاری رہا اور بلیک فورٹ میں انہیں پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد رہائی ملنے کے بعد وہ پھر متحرک ہوگئے۔ اُس وقت مسئلہ کشمیر جمود کا شکار ہورہا تھا۔ کشمیری سیاستدان مظفرآباد اور سری نگر کی کرسی کے پجاری بننے لگے اور حصول اقتدار کی خاطر وہ آزادی کو بھول چکے تھے۔ دوسری جانب عالمی سطح پر بھی مسئلہ کشمیر کو دنیا بھول رہی تھی ۔۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد شیخ عبداللہ مایوس ہوگئے اور انہوں

نے اندرا گاندھی سے معاہدہ کر لیا جبکہ دوسری جانب بھٹو اور اندرا معاہدہ کے بعد پاکستان اور بھارت نے عملاً تقسیم کشمیر کو تسلیم کرتے ہوئے سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن قرار دے دیا۔ مقبول بٹ نے ایک بار پھر جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک بار پھر بھارتی زیر قبضہ کشمیر میں اپنے دو ساتھیوں ریاض ڈار اور حمید بٹ کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں داخل ہوگئے۔ یہ کوئی آسان فیصلہ نہ تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہاں ان کے لیے سزائے موت کا فیصلہ موجود ہے پھر بھی وہ بے پناہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں چلے گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر تحریک آزادی کو متحرک نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے کشمیر کی آزادی کے نام پر کشمیر فروشی کا راستہ نہ اپنایا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور پاکستان یا آزاد کشمیر میں پرآسائش زندگی گذار سکتے تھے لیکن انہوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھا تھا۔ وہ کشمیری نوجوانوں کو ایک بار پھر تربیت دینے لگے تاکہ مادر وطن کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کا راستہ اپنایا جائے۔ اسی دوران وہ ایک بار پھر بھارتی افواج کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے اور انہیں تہاڑ جیل دہلی میں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ انہوں نے جیل سے بھی درس حریت جاری رکھا۔ آخر کار وہی ہوا جو غاصب قوتیں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ موت ایک حقیقت ہے اور ایک دن سب کو اس کا سامنا کرنا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں موت بھی سلام پیش کرتی ہے مقبول بٹ بھی انہیں میں سے ایک تھے جنہیں موت نے تہاڑ جیل دہلی

میں ۱۱فروری ۱۹۸۴ء کو سلام پیش کیا۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

مقبول بٹ کی شہادت پر کشمیری قوم کا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔ اُس کی جرات و بہادری اور جوش و جنوں کو شکست نہیں دی جا سکی۔ مقبول بٹ کی شہادت پر جہاں بھارتی سامراج کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں وہاں حکومت پاکستان بھی اس سے بری الذمہ نہیں ۔ قائدِ اعظم کے سابق سیکریٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر جناب کے ایچ خورشید نے مطالبہ کیا تھا کہ مقبول بٹ کو قیدیوں کے تبادلہ میں واپس لایا جائے مگر ارباب اقتدار نے اسے نظر انداز کردیا۔جب اندرا گاندھی کی حکومت نے انہیں جب ۸ فروری کو پھانسی دینے کا اعلان کیا پھر بھی حکومت پاکستان نے اُن کی جان بچانے کی کوئی کوشش نہ کی اور ضیاء الحق کی حکومت خاموش تماشائی بنی رہی حالانکہ مقبول بٹ وادی کشمیر سے آنے کے بعد پشاور میں مقیم تھے اور پاکستان کے شہری بھی تھے۔ دہلی اور اسلام آباد کی دونوں حکومتیں مقبول بٹ سے جان چھڑانا چاہتی تھیں اور انہوں نے یہی کیا۔ مقبول بٹ کو ختم کرنے والی قوتوں نے سمجھا کہ اب کشمیر کی آزادی کی کوئی تحریک نہیں اٹھے گی اور یہ کوئی اس کا نام لیوا ہوگا۔ مگر یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ یہ مقبول بٹ کا ہی لہو تھا جس کی روشنی میں کشمیری نوجوان اٹھے اور راہ آزادی

پر چل پڑے۔ شہید کے ساتھی امان اللہ خان نے برطانیہ میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی بنیاد رکھی اور پھر وہاں کے ساتھ پاکستان اور آزاد کشمیر میں کشمیری نوجوانوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ ۱۹۸۸ء میں یہ سلگتی ہوئے چنگاری ایک شعلہ بن گئی اور وادی میں آزادی کے متوالے مقبول بٹ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے لہو کے چراغ جلانے لگے۔ اشفاق مجید وانی، شیخ عبدالحمید، جمیل چوہدری، رضا، شبیر صدیقی اور ہزاروں شہیدوں نے لازوال داستان رقم کی ہے جس پر کشمیری قوم بلا شبہ فخر کر سکتی ہے۔

میں مقبول بٹ کو پھانسی دینے والوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اپنے مادر وطن کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنا جُرم اور دہشت گردی ہے تو کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والے سبھاش چندر بوس اور اُن کی آزاد ہند فوج بھی مجرم اور دہشت گرد تھی۔ کیا اُن کا وکیل نہرو بھی اس جرم میں شریک نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی وطن کے لیے جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں جسے اقوام متحدہ نے بھی اپنے چارٹر میں شامل کیا ہوا ہے۔ میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ وہ کون سا قانون ہے جس کے تحت پھانسی پانے والے کو سزائے موت سے قبل اس کے لواحقین سے نہ ملایا جائے اور پھانسی کے بعد اُس کی میت بھی اُن کے حوالے نہ کی جائے اور جبری طور پر دفن کردیا جائے۔ بھارت کا کون سا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ شہید کی بوڑھی والداور سرنگر میں ان کے

لیے مخصوص آخری آرام گاہ ان کی منتظر ہے۔ مقبول بٹ شہید کی والدہ کی عظمت کو سلام جس کے چار بیٹے جدوجہد آزادی میں شہید ہوئے اور پانچویں ظہور بٹ اس وقت بھی پابند سلاسل ہیں۔ مقبول بٹ نے کشمیری نوجوانوں کے قلوب میں آزادی کی جو شمع روشن کی ہے وہ اب ریاست جموں کشمیر کی آزادی پر ہی جا کر ختم ہوگی اور مقبول بٹ نے مادر وطن کی آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ آخر کار ایک دن انشاءاللہ ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تاتاریوں نے چنگیز خان اور ہلاکو خان کی قیادت میں اسلامی سلطنت میں جو تباہی مچائی اور وہ جس طرح مسلمانوں پر قہر بن کر ٹوٹے اس کی تاریخ میں مثال موجود نہیں مگر انہی کی اولاد نے حلقہ بگوش اسلام ہو کر اسلامی فتوحات کے جھنڈے گاڑے اور وہ دین اسلام کے پاسباں بن گئے جس کی طرف علامہ اقبال نے جواب شکوہ میں اشارہ کیا ہے۔ تاریخ میں یہ سلسلہ چلتا رہا ہے کہ بدترین دشمنان اسلام اور ان کی اولادیں اسلام کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے روشن مثالیں بن گئیں۔ دور حاضر میں یورپ میں اسلام فوبیا، بعض یورپی ممالک میں اسلام مخالف مظاہروں اور میڈیا مہم کے دور میں سویڈن میں ایک کلیسا کے ہاتھوں تعمیر مسجد کیا ایک غیر معمولی واقعہ نہیں۔ سویڈش دارالحکومت سٹاک ہوم کے مضافات میں بحیرہ بالٹک میں تیرتے ہوئے خوبصورت جزائر کی میونسپلیلیٹی ناکا میں فسکسیترا کے مرکز میں موجود چرچ نے اپنی زمین ایک بڑی جامع مسجد بلکہ اسلامک سینٹر کی تعمیر کے لیے دینے کا فیصلہ کیا ہے نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ مالی وسائل جمع کرنے کی مہم بھی شروع کردی ہے۔ حضرت بلالؓ کے نام سے موسوم اس مسجد کا کل رقبہ ۳۷۰ مربع میٹر ہوگا اور یہ تین منزلہ ہوگی۔ چرچ نے اپنے ساتھ ملحقہ ۳۰۰ مربع میٹر کی جگہ مسجد کے لیے انتہائی کم قیمت پر دی ہے

جبکہ لوکل کونسل نے باقی زمین مفت فراہم کی ہے۔ گرجا گھر اور مسجد دونوں ایک جگہ پر ہوں گے اور درمیان میں ایک ہال ہوگا جسے فریقین اپنی دیگر سرگرمیوں کے لیے استعمال میں لا سکیں گے۔ مسجد اور چرچ کا الگ الگ راستہ اور اپنی اپنی انتظامیہ ہوگی جو ایک دوسرے کے معلامات میں مداخلت نہیں کرے گی لیکن دونوں عمارتیں ایک ساتھ ہوں گی اور اس منصوبے کو God´s House یعنی بیت اللہ کا نام دیا گیا۔

تعمیر مسجد کے اس منصوبہ کو پائیہ تکمیل کے لیے مسلم ایسوسی ایشن ناکا کے تحت فسکیسترا مسجد فاؤنڈیشن قائم کی گئی ہے۔ ایسوسی ایشن کے صدر سادات صدیقی، سیکریٹری جنرل جاوید احمد نے افضل نقوی اور میاں عاقب کے ہمراہ اس عظیم منصوبہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل ۱۹۹۰ء سے ہمارا اس چرچ کی انتظامیہ کے ساتھ رابطہ اور مکالمہ جاری تھا اور آخر کار ہم نے انہیں قائل کر لیا ہے کہ چونکہ اس علاقہ کی پچاس فی صد تک مسلم آبادی ہے اس لیے انہیں ایک باقاعدہ مسجد کی ضرورت ہے۔ چرچ کے ساتھ مسجد کی تعمیر سے مذہبی رواداری کو فروغ حاصل ہوگا اور چونکہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اس غرض سے مسجد اور چرچ دونوں کو بیت اللہ قرار دینا مبنی بر حقیقت ہوگا۔ اسی بات کی تائید چرچ انتظامیہ نے یوں کی کہ مسلمان اور عیسائی دونوں اولاد ابراہیم اور دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں اس لیے ہم بخوشی اپنی زمین مسجد کو دے رہے

ہیں بلکہ تعمیر مسجد کے لیے پچاس ہزار یورو دینے کے ساتھ مسجد کی تعمیر کے لیے چرچ کی جانب سے الگ نو رکنی کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں دو مسلمان نمائندے بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں سٹاک ہوم کی جامع مسجد عائشہ کے امام محمد مسلم بھی شامل ہیں۔ چرچ نے اس فاؤنڈیشن کو ایک لاکھ یورو کی رقم بھی تفویظ کی ہے۔

مسجد اور اسلامک سینٹر سٹاک ہوم کی مسلم کیمونیٹی کا اہم مذہبی، سماجی اور ثقافتی مرکز ہوگا۔ یہاں قرآن حکیم اور دینی تعلیم وتربیت کا انتظام ایک مربوط انداز میں دور جدید کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنایا جائے گا۔ شادی اور دوسری سماجی تقریبات کے لیے مسجد سے ملحقہ ہال کو استعمال میں لایا جاسکے گا۔ اسی ہال میں افطار اور عید ملن پارٹیاں منعقد ہوا کریں گی۔ دکھ اور غم کے مواقع پر اور تجہیز و تکفین کے لیے بھی یہ مرکز کیمونیٹی کی خدمت میں مستعد ہوگا۔ یہ سویڈن میں مسلم آبادی کا ایسا مرکز ہوگا جو مقامی اور ملکی سیاست کے ساتھ یورپ میں دیگر اسلامی تنظیموں کے ساتھ منسلک ہوگا۔ سماجی بہبود کے اداروں اور مزدور تنظیموں کے ساتھ بھی مل کر کام کرے گا اور دین اسلام کی اشاعت دور حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اچھے ماحول کو اپناتے ہوئے خوبصورت انداز اپنائے گا۔ تین منزلہ عمارت میں لائبریری، خواتین کے لیے الگ جگہ اور نماز کے لیے وسیع ہال

شامل ہوگا۔

بیت اللہ کے اس منصوبہ پر بہت خطیر رقم درکار ہوگی۔ چرچ کی عمارت تو پہلے ہی تعمیر ہے جبکہ مسجد کی تعمیر ہونا باقی ہے۔ اس بلال مسجد کی تعمیر کا تخمینہ ۳۲ ملین سویڈش کرونا یعنی ۳۲ لاکھ یورو ہے۔ مسجد فاؤنڈیشن نے اب تک ڈھائی ملین سویڈش کرونا (ڈھائی لاکھ یورو) جمع کرلیے ہیں لیکن اب بھی تعمیر مسجد کے لیے بہت بڑی رقم درکار ہے۔ تعمیری اخراجات پورے کرنے کے لیے مزید تقریبا تیس ملین سویڈش کرونا یعنی ۳۰ لاکھ یورو کی ضرورت ہے۔ اگر اتنی بڑی رقم اکھٹی نہ ہوسکی تو تعمیر مسجد کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے اس لیے فسکٹ سیترا مسجد فاؤنڈیشن نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بلال مسجد کی تعمیر کے اس منصوبہ میں بھرپور مالی تعاون کریں۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق شمالی یورپ کے اس بیت اللہ کے منصوبہ میں اپنا حصہ ڈال سکتا ہے۔ مخیّر حضرات کو اس تعمیر مسجد کے اس منفرد منصوبہ میں اپنا کرادر ادا کرنا چاہیے۔

کچھ احباب کو بحریہ ٹاؤن کے ملک ریاض سے توقع ہے کہ اگر وہ تعاون کریں تو یہ کام بلا تاخیر پائیہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ اپیل اگر ملک ریاض یا ان کے ادارے کے کسی فرد کی نظر سے گذرے تو وہ توجہ فرمائیں۔ جو احباب اس کار خیر میں معاونت کرنا چاہیں وہ فاؤنڈیشن کی ای میل fiskismoske@gmail.com یا فون نمبر + 46700476662 پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

جدید سائنسی تحقیقات

ہمارے اخبارات میں سیاسی، مذہبی، سماجی اور دیگر موضوعات پر کالم تو باقاعدگی سے پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن صحت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے موضوعات پر بہت کم لکھا جاتا ہے حالانکہ عصر حاضر کا تقاضا ہے کہ عوام الناس کو جدید تحقیقات سے نہ صرف آگاہی ہونی چاہیے بلکہ نت نئی معلومات اور دنیا بھر میں ہونے والے نئے نئے انکشافات کا علم ہونا چاہیے جن کا تعلق براہ راست ہماری روز مرہ کی زندگی سے ہے اور جو کہ علم نافع کا درجہ رکھتی ہیں۔ کائنات کے اسرار و رموز کے علم، غور و فکر اور جستجو کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ خالق کائنات نے انسانیت کے نام اپنے آخری پیغام میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے اور قرآن حکیم کا تقریبا بارہ فیصد اسی پر مشتمل ہے۔ اسی حکم ربانی کی تعمیل میں قارئین کی آگاہی کے لیے گاہے بگاہے ہماری روز مرہ کی زندگی سے متعلق سائنس کے مختلف شعبہ جات میں ہونے والی جدید سائنسی تحقیقات جو عام آدمی کے بھی اہم اور دلچسپ ہوں پر مشتمل تحریر پیش کی جائے گی۔ یہ سلسلہ آج کے اس کالم سے شروع کیا جارہاہے اور اگر قارئین نے اسے سراہا تو اسے جاری رکھا جائے گا۔

سب سے پہلے یہ خبر کہ مستقبل میں یہ بھی ممکن ہوسکے گا کہ آپ اپنے موبائل

فون کے ذریعہ اپنے پیغامات کو خوشبو اور ذائقہ سے لبریز کرکے بھیج سکیں گے بلکہ اپنے ہاتھوں کا لمس بھی اس میں شامل کر سکیں گے۔ برطانیہ میں ماہرین کو اس سمت میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ان کہنا ہے کہ سمارٹ فون سے یہ ممکن ہو سکے گا۔ دوسری خبر یہ کہ فضائی سفر کرتے ہوئے ایک ٹائم زون سے دوسرے ٹائم زون میں جانے سے بہت لوگوں کو جیٹ لاگ کی وجہ سے طبیعت بہت گراں ہو جاتیہے جس کا علاج طبّی ماہرین نے سٹیرائیڈ ہارمون سے تلاش کر لیا ہے اب مستقبل میں اس پریشانی سے بھی چھٹکارا مل سکے گا۔ چھٹکارا تو دانتوں کی حساسیت سے ہونے والے درد سے بھی آسانی کے ساتھ مل سکے گا۔ تائیوان میں طبّی ماہرین نے کیلشیم، فاسفورس اور دیگر اجزاء سے ایک پیسٹ تیار کی ہے۔ اس کے استعمال سے دانتوں کی حساسیت دور ہونے کے ساتھ دانتوں کی محفوظ تہہ انیمل کی تعمیر نو بھی ہو سکے گی۔ طبّی دنیا سے ایک اور اچھی خبر بہرے افراد کے لیے ہے جو اب اپنی زبان کی مدد سے سن سکیں گے۔ ایک ننھا منھا آلہ کو بہرے افراد کی زبان کے ساتھ منسلک ہوگا جہاں سے وہ بلیو ٹوتھ ٹیکنالوجی کو بروے کار لاتے ہوئے دماغ کو سننے کے سگنل بھیج سکے گا اس طرح بہرے افراد سن سکیں گے۔ اور یہ کہ ڈارک چاکلیٹ دل کی بیماریوں اور فالج سے بچاؤ کے ساتھ ساتھ یاداشت بہتر بنانے کے لیے بھی اہم ہے۔ اس چاکلیٹ میں موجود فلیوانول نامی مادہ یہ اہم کرادر ادا کرتا ہے۔

بچوں کی بیماری آٹزم کے حوالے سے سویڈن اور امریکہ میں دو مختلف تحقیقات سے اس مرض کے بارے میں کچھ نئی معلومات سامنے آئیں ہیں۔آٹزم کا عارضہ لڑکیوں کی نسبت لڑکوں میں زیادہ ہوتا ہے اور تین سال کی عمر میں اس کی علامات واضع ہوجاتی ہیں۔ماہرین نے سولہ اہم امور کی موجودگی کی بنا پر اس عارضہ کی تشخیص کو معیار بنایا ہے۔اہم علامات میں بچے کا براہ راست دوسرے کو متوجہ نہ کرنا، بولنے میں تاخیر، دوسرے بچوں سے کم مل جل کر کھیلنا اور شدید صورتوں میں چلنے میں دشواری بھی شامل ہے۔جینز (Genes) اور ماحولیات اس مرض کا باعث ہیں۔اگر بچے کی پیدائش سے قبل ماں فضائی آلودگی کے ماحول میں رہے تو مرض ہونے کا امکان دوگنا بڑھ جاتا ہے خصوصاً زمانہ حمل کے آخری تین ماہ جب دماغ کی تیزی سے بڑھوتی کا عمل ہورہا ہوتا ہے۔یہ تحقیق امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں کی گئی ہے۔یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جسم انسانی چار سو مختلف قسم کے خلیوں کا مجموعہ ہے جن کے افعال بھی مختلف ہیں لیکن ان میں موجود وراثتی مادہ ڈی این اے ایک ہی قسم ہوتا ہے اور اس میں تغیر و تبدل بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔

وائرس کو کبھی بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا کیوں وہ بیماریوں کا باعث ہوتے ہیں لیکن سویڈن کی لند یونیورسٹی میں ہونے والی ایک اہم تحقیق میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ وائرس ہمارے دوست بھی ہیں اور وہ ہمارے دماغ کے پیچیدہ نیٹ ورک

کے بنانے اور کارکردگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جسم انسانی کے ڈی این اے کا پانچ فی صد ریٹرو وائرس پر مشتمل ہوتا ہے جس بارے میں پہلے یہی خیال کیا جاتا تھا کہ یہ بے کار سی شئے ہے مگر لند یونیورسٹی کے ماہرین نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے اسے دماغ کی کارکردگی اور ذہانت کے لیے اہم قرار دیا ہے۔ حکیم الامت نے بجا فرمایا تھا کہ

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں ! کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اسی طرح بیکٹیریا آپ کے موڈ کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ آنتوں میں موجود مفید بیکٹیریا ہمارے مددگار ہیں اور وہ کھانا ہضم اور جذب کرنے کے ساتھ ساتھ وٹامن بی پیدا کرتے ہیں اور یہ بھی سامنے آیا ہے کہ وہ مزاج پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان مفید بیکٹیریا کی حامل مختلف مصنوعات جوس، دہی اور دیگر صورتوں میں تجارتی طور پر فروخت ہوتی ہیں۔

سویڈن کی معروف میڈیکل یونیورسٹی کارولنسکا انسٹیٹیوٹ میں الزائمر بیماری پر تحقیق سے اس مرض کے علاج میں پیش رفت سامنے آئی ہے۔ طبّی ماہرین نے اس مرض میں مبتلا مریضوں کے جسم میں خاص قسم کے خلیے داخل کیے جنھوں نے اعصابی خلیوں کو اس انداز میں متحرک کیا کہ نئے صحت مند اعصابی خلیے پیدا ہو گئے ہیں جس سے یہ امید ہے کہ مستقبل میں اس مرض کا علاج ممکن ہو سکے گا۔ ورزش کے

حوالے سے کئی ایک تحقیقات سامنے آئی ہیں جن کے مطابق ورزش یاداشت بہتر بنانے کا بھی باعث ہے خصوصا ساٹھ کی عمر کے بعد بعد ورزش کرنے سے یاداشت بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ گھنٹہ چہل قدمی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک روایت بھی ہے۔ اور آخر میں یہ تحقیق کہ دیار مغرب میں رہنے والو یہ جان لو کہ کھانے میں مغربی طرز زندگی ماحولیات اور صحت انسانی کے لیے مضر ہے۔ اور زیادہ تیل اور روغنیات پر مشتمل ہوتے Refind, Processed مغربی کھانوں ہیں جبکہ مشرق وسطی کے کھانے زیادہ سلاد، پھل اور بہتر روغنیات کی وجہ سے صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔ پندرہ امیر ترین ممالک کے لوگ اپنی روزانہ ضروریات کے برعکس چار سے پانچ سو حرارے کی اضافی خوراک کو ہڑپ کرجاتے ہیں جو مختلف امرض جن میں سرطان، دل اور دوران خون کے امراض شامل ہیں ان میں اضافے کا باعث بن جاتے ہیں۔ سرورکائنات ﷺ نے کیا سنہرا اصول دیا تھا کہ بہترینطریقہ میانہ روی ہے۔

عورت کا اصل مسئلہ

۸ مارچ۔ خواتین کے عالمی دن پر خصوصی کالم

یہ کیسا معاہدہ ہے کہ جو دو فریقین باہمی رضا مندی سے کرتے ہیں لیکن جونہی معاہدہ پر دستخط ہوتے ہیں ایک حاکم بن جاتا ہے اور دوسرے کی حیثیت محکوم کی ہو جاتی ہے حالانکہ معاہدہ میں ایسی کوئی شرط موجود ہوتی ہی نہیں۔ ہمارے سماج میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے اور نکاح کے بعد بیوی محکوم اور خاوند حاکم اور مجازی خدا بن جاتا ہے جو بعض اوقات مجازکے سابقہ کو بھی اتار پھینکتا ہے۔بد قسمتی سے ہماری سماجی اور مروجہ مذہبی تشریحات ان رویوں کی تائید میں یک جان ہیں حالانکہ اسلام کی تعلیمات اس کے برعکس ہیں۔ قرآن حکیم نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے (۲۱،۴) اور مرد کی عورت کو بھی اپنے جیون ساتھی کے انتخاب کا پورا حق دیتا ہے (۱۹،۴)۔قرآن نکاح کے موقع پر لڑکی کو کچھ (مہر) دینے کا حکم دیتا ہے نہ کہ لینے کا، جو ہمارے ہاں جہیز کی صورت میں ہوتا ہے۔ کتنی لڑکیاں ہیں جن کے والدین جہیز کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتے اور وہ بیچاری ایسے ہی بیٹھی رہتی ہیں۔ میاں بیوی کے حقوق ق فرائض کی تعلیمات دیتے ہوئے قرآن حکیم نے اس رشتہ کو حاکم اور محکوم کا رشتہ نہیں کہا بلکہ اسے

سکون، رحمت اور محبت کا تعلق قرار دیا ہے (۳۰،۲۱)۔ مردوں پر معاشی ذمہ داری ڈالتے ہوئے انہیں ذمہ داری سونپی ہے جس کا معانی حاکم نہیں ہے جسے بعض سورہ نساء کی آیت ۳۴ الرجال قومون النساء سے مطلب اخذ کرتے ہیں۔اسی آیت میں قرآن حکیم اس حقیقت کا بھی اعلان کرتا ہے کہ کچھ خوبیاں مردوں میں میں اور کچھ عورتوں میں اور پھر عورتوں کو مردوں کا ہمدوش قرار دیتے ہوئے اُن تمام صلاحیتوں اور خوبیوں کی تفصیل الگ الگ کرکے بیان کردیتا ہے کہ جو خوبیاں مردوں میں ہیں وہی عورتوں میں بھی موجود ہیں (۳۳،۳۵)۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں (۲،۲۲۸)۔جب قرآن حکیم یہ کہتا کہ تمام بنی نوع آدم قابل عزت ہیں (۱۷،۷۰) تواُس میں مر اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ مردوں کو یہ تاکید کہ عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آؤ اور اگر اکوئی بات ناگوار بھی گذرے تو تحمل سے کام لو (۴،۱۹) جس کی وضاحت آقا ﷺ نے یوں کی کہ اگر اپنی عورت کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی تو اسے نظر انداز کرکے اُس کی اچھی بات کو مد نظر رکھو۔ عورت کی اللہ نے یوں عزت افزائی کہ قرآن حکیم کی ایک بڑی سورۃ کا نام النساء رکھ دیا۔

عورت کی ہمارے معاشرہ میں بہت عزت ہے صرف اس وقت جب وہ ماں، بیٹی یا بہن ہوتی ہے لیکن جب یہی عورت بیوی کے رشتہ میں ہوتی ہے تو وہاں صورت حال مختلف ہوجاتی ہے۔ حالانکہ آقا نے بار بار تاکید اور اپنے آخری خطبہ میں بھی یہی

کہا کہ عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آؤ اور اس معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نسبی اور سسرالی دونوں رشتوں کا بتایا ہے اور دونوں کو اہمیت دی ہے (۲۵،۵۴)۔ مگر ہمارے معاشرے کا چلن دیکھیے سسرال کے تمام رشتوں کو گالی بنا دیا گیا ہے یہاں تک کہ ماموں کے رشتہ کو بھی گالی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہمارے جو لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر افسردہ ہوتے ہیں وہ ہمارے سفاک سماجی ریوں کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بیٹی کے والدین کی حیثیت سے پوری عمر اسے بھگتنا ہے۔ داماد اور بیٹی کے سسرال والے جو مرضی کہیں اور کریں بیٹی والوں کا کام برداشت کیے جانا ہے۔ ہندو معاشرہ کے اثرت ابھی بھی ہمارے اندر رچ بس گئے ہیں جہاں بیٹی والے ہمیشہ دبے اور جھکے رہتے ہیں۔ معاشی استحصال کی داستان جہیز سے شروع ہوتی ہے جو پوری عمر جاری رہتی ہے یہاں تک کہ خدانخواستہ اگر داماد کا انتقال ہو جائے تو تجہیز و تکفین سے لیکر مہمانوں کے کھانے کا بھی لڑکی والوں کو انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بیٹیوں کا استحصال بعض اوقات خود اُن کے والدین بھی کرتے ہیں جب وہ بہت سے امور میں بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ خرابی یہیں سے شروع ہوتی ہے جب مرد کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اس کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے۔ اسی رویہ کے باعث مرد عورت کو اپنی طرح کا انسان نہیں سمجھتا اور شادی بعد وہ عورت کو بچے پیدا کرنے، کھانا پکانے اور خدمت گذاری کا ذریعہ سمجھتا ہے اور خود جو چاہے مرضی کرے۔ اس کے ساتھ جیسا مرضی

سلوک کرے اور چاہے تو تین لفظ بول کر اسے بے گھر کر دے۔ عورت کا تو کوئی گھر نہیں اور نہ کوئی عورت کی فریاد سننے والا اور نہ کوئی اس کا مداوا۔ اگر کوئی خاوند اچھا سلوک کر بھی لے تو بڑا احسان جتائے گا اور وہ ایسا کرے کیوں نہ جب اسے بچپن سے تربیت ہی ایسی دی گئی ہے۔ اگر کوئی عورت اپنا حق لینا چاہے تو معاشرہ اور رشتہ دار اسے بُرا سمجھیں گے۔ مرد کے لیے مجازی خدا اصطلاح ہی غلط، غیر انسانی اور غیر اسلامی ہے۔ غیرت صرف عورت کے لیے ہی کیوں؟ مرد کے معاملہ میں غیرت کیوں نہیں۔ اگر لڑکی کوئی جرم کر لے تو وہ گردن زنی کے قابل لیکن اگر وہی جرم لڑکا کرے تو خاموشی۔ عورت کے ساتھ یہ رویہ رکھنے والے مسلمان ہونے کے دعوی دار ہیں جن کے رسولؐ پاک نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ وہ آدمی تم میں سے زیادہ اچھا اور بھلا ہے جو اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہے اور فرمایا کہ میں اپنی بیویوں کے لئے بہت اچھا ہوں۔ آپؐ نے کبھی اپنی کسی بیوی کو نہ گالی دی اور نہ ہی اُس پر ہاتھ اٹھایا۔ اپنے آخری خطبہ میں امت کو تاکید کہ عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے پابند رہو اور اس معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کیذریعے ان کو اپنے لیے جائز و حلال کیا ہے۔ بیوی اور اولاد کو قرآن حکیم نے آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا (۲۵،۷۴) ۔ عورت

کو دنیا میں سب سے پہلے یہ عظیم مقام اور مرتبہ دینے والے نبی رحمتؐ کے ساتھ بد قسمتی سے ایسی رویات جن میں عورتوں کو کم تر، منحوس، کم عقل اور اسی طرح کی اور باتیں منسوب کردی گئیں جو واضح طور پر وضعی اور من گھڑت ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اللہ کے منع کرنے کے باوجود آدمؑ نے حوا کے کہنے پر ہی وہ شجر ممنوع کے پاس گئے اور پھل کھایا جس کی قرآن حکیم نے کھلے الفاظ میں تردید کردی اور کہا کہ وہ دونوں اس کے ذمہ دار تھے (۲،۳۶)۔ مغربی معاشرہ نے عورت کو آزادی تو دی لیکن اسے مقام انسانیت نہیں دیا۔ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک جو عورتوں کے حقوق کے دعوی دار ہیں انہیں نے بھی عورت کو اس کا اصل مقام نہیں دیا۔ عورت کو یہ ذہن نشین کرایا کہ تم مقصود بالذات نہیں ہو بلکہ تم مرد کی تفریح اور تسکین کے لیے پیدا کی گئی ہو اسی لیے عورت کو اشتہار بنا دیا گیا ہے۔ عورت کی حیثیت ایک Commodity اور ایک پر کشش چیز کی بنا دی گئی ہے اور وہ مردوں میں جاذب نظر بننے کے لیے ہر طرح کے جتن کرتی ہے یعنی اسکی اپنی کوئی ذات ہی نہیں۔ مشرق میں عورت کا استحصال جبر کے ساتھ اور مغرب میں مکر کے ساتھ ہو رہا ہے۔ سویڈن اور بہت سے اور یورپی ممالک میں عورتوں کی تنخواہ مردوں کی نسبت کم ہے۔ خواتین کے حقوق کے علمبردار ملک سویڈن میں آج تک کوئی عورت وزیر اعظم نہیں بن سکی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یورپ میں اکیلی عورت اپنی زندگی اپنی مرضی سے بسر کرسکتی ہے، ملازمت اور سفر بغیر کسی خدشہ کے کرسکتی ہے لیکن مشرقی معاشرہ میں یہ ممکن

نہیں اور اس کی وجہ مردوں کا رویہ ہے۔ عورت کا اصل مسئلہ ہی مردوں کا رویہ اور جبر و تسلط ہے اور یہ تب ہی دور ہوگا جب بچپن سے ہی ہم اپنے بچوں کو عورت کی عزت کرنا سکھائیں گے اور انہیں یہ باور کرائیں گے کہ وہ بھی انسان ہے۔ تصویر کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ جب عورت کو موقع ملتا ہے تو بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ساس بھی تو عورت ہی ہوتی ہے جو اپنی بہو کے ساتھ زیادتی کرتی ہے۔ اور بہو بھی عورت ہی ہے کہ بہت سے سسرال والوں کو دن میں تارے دیکھا دیتی ہے۔ عورت کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اپنی حیثیت کا ناجائیز فائدہ نہ اٹھائے اور گھر وہی جنت کا نمونہ ہوتا ہے جس میں سب اپنے حقوق و فرائض کو پورا کریں اور حد سے نہ بڑھیں۔

خورشید ملت۔ کچھ باتیں کچھ یادیں

کے ایچ خورشید صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۴ء میں لاہور ہائی کورٹ کے عقب میں ٹرنر روڈ پر ان کے دفتر میں ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائی طارق محمود چوہدری اُس وقت انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں تھے اور وہاں زیر تعلیم کشمیری طلباء کی تنظیم کشمیر سٹوڈنٹس آرگنائیزیشن کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اُن کا کے ایچ خورشید کے ساتھ بہت قریبی تعلق تھا اور مجھے خورشید صاحب سے ملنے کی خواہش تھی۔ وہ مجھے خورشید صاحب سے ملوانے اُن کے دفتر میں لے گئے۔ خورشید صاحب کے دفتر کے ساتھ ہی پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے صدر سی آر اسلم کا بھی دفتر تھا۔ خورشید صاحب سے ملنے کا اشتیاق اس وجہ سے تھا کہ اُس شخصیت سے ملوں گا جنھوں نے قائد اعظم کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان کے فیصلہ کن دور میں شب و روز کام کیا اور اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھا تھا۔ جاتے وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ انہوں نے برصغیر کے اہم رہنماؤں گاندھی، نہرو، پٹیل اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کو بڑی قربت سے دیکھا ہوگا اور وہ اُن کے بارے میں وہ کچھ بتا سکتے تھے جو عموماً پڑھنے کو نہیں ملتا۔ پرائیویٹ سیکریٹری ہونے کے ناطے وہ قائد اعظم کے ساتھ خلوت اور جلوت میں رہے اس طرح قائد کی شخصیت اور افکار کے بارے میں کوئی

شخص اُن سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔ پھر وہ تحریک آزادی کشمیر کے بھی چشم دید گواہ تھے اور اُن حقائق کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ آزاد جموں کشمیر میں جمہوریت کی داغ بیل انہوں نے ہی ڈالی اور پھر مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے آزاد جموں کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جس سے بہتر حکمت عملی پر کسی اور نہیں غور نہیں کیا اس طرح انہوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے بہترین روڈ میپ دیا۔ انہی سوچوں میں مگن جب ہم اُن کے دفتر میں پہنچے تو انہوں نے خوش خلقی اور بڑی شفقت کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا اور اور گفتگو کی ایک تفصیلی نشست ہوئی اور دوران انہوں نے چائے وغیرہ سے ہماری تواضع بھی کی۔

مجھے بہت سے رہنماؤں کو ملنے کا موقع ملا ہے اور ملنے سے قبل اُن کی شخصیت کا ایک بہتر تصور ذہن میں ہوتا ہے لیکن اکثر کو ملنے کے بعد وہ تصور کا وہ تاج محل زمین بوس ہوجاتا ہے لیکن خورشید صاحب اس کے برعکس تھے اور ملاقات کے بعد میں ان کی شخصیت کا اور بھی معترف ہوگیا۔ مجھے وہ بہت متاثر کن، خوش لباس، پروقار، اور متوازن شخصیت نظر آئے۔اُن کی شخصیت، خوش گفتار اور شفقت بھرے انداز گفتگو نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ بڑے قد کاٹھ کے سیاسی رہنماؤں میں جو رعونت اور احساس برتری عام سی بات ہے، خورشید صاحب اس سے کوسوں دور تھے۔ ہماری ملاقات کافی تفصیلی ہوئی ۔ میں نے اُن سے بہت سے

چھبتے ہوئے سوالات بھی میں نے کیے لیکن انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں جوابات دیئے اور کسی بات کا بُرا نہیں منایا۔ اس طرح وہ مجھے حلم اور متانت کا پیکر نظر آئے۔ انہوں نے اس تصور کر رد کیا کہ قائداعظم آمرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں میں اکثر رہنما بہت تیاری کرکے آتے تھے اور اپنا نقطہ نظر کھل کر بیان کرتے تھے اور جمہوری انداز میں فیصلے کیے جاتے تھے۔ قائداعظم اصولوں کی پاسداری کرتے تھے وہ جھوٹ، منافقت، مفاد پرستی اور بدانتظامی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ خورشید صاحب کا کہنا تھا کہ قائداعظم کے بعد اگر حسین شہید سہروردی کو اُن کا جانشین بنایا دیا جاتا تو پاکستان دولخت نہ ہوتا اور آج پاکستان کے حالات بہت بہتر ہوتے۔ ریاست آزاد جموں کشمیر میں جمہوریت کے آغاز، تعمیر و ترقی اور مسئلہ کشمیر کو نئی جہت دینے کے لیے اپنی جماعت جموں کشمیر لبریشن لیگ کے قیام اور صدر پاکستان ایوب خان سے ان اختلافات پر بھی ہماری بات ہوئی۔ اپنی حکومت کی برطرفی کے ضمن میں بات کرتے ہوئے خورشید صاحب نے خودمختار کشمیر کے بلند و بانگ دعویٰ کرنے والے کشمیری رہنماؤں کا بھی ذکر کیا جو اُن کی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی جس کے بعد اُن سا تھا اور بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس عرصہ میں لاہور کشمیر کے حوالے سے ہونی والی سرگرمیوں اور تقریبات میں کے ایچ خورشید، ڈاکٹر سلام الدین نیاز سابق وزیر قانون آزاد کشمیر، پیر سید نازکی صدر محاذ رائے شماری، ڈاکٹر یوسف بخاری چیئرمین

شعبہ کشمیریات پنجاب یونیورسٹی، اشرف قریشی استاد شعبہ کشمیریات (ہائی جیکر بھارتی جہاز گنگا)، سید عبدالحمید دیوانی (ہائی جیکر بھارتی بوئنگ جہاز) ، معروف صحافی کلیم اختر، مشتاق عاجز کشمیری اور دوسرے بہت سے رہنماؤں سے ملنے اور اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہا۔اسی عرصہ میں لاہور کے ٹاؤن ہال میں مقبول بٹ کے یوم شہادت پر ایک اہم کانفرس منعقد ہوئی جس میں اہم زعماء شریک ہوئے اور مجھے اس کانفرس کی نظامت سونپی گئی۔

خورشید حسن خورشید ریاست جموں کشمیر کی تمام اکائیوں یعنی وادی کشمیر، صوبہ جموں، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور مہاجرین جموں کشمیر میں یکساں مقبول تھے اور سب کے مابین ایک رابطہ تھے یہ امتیاز کسی اور کشمیری رہنماء کے حصہ نہیں آیا۔ مہاجرین جموں کشمیر کے لیے ان کی خدمات مسلمہ تھیں۔ان کے دور حکومت سے مہاجرین جموں کی نمائندگی سیالکوٹ میں مقیم سٹیٹ کونسلر قاضی خورشید عالم مرحوم کیا کرتے تھے وہ بہت مہاجرین جموں کے انتہائی مخلص رہنما، درویش منش انسان اور علامہ اقبال کے گرویدہ تھے۔ اُن سے ملاقات کے لیے میں اکثر پسرور اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ قاضی خورشید نے ہمیشہ کے ایچ خورشید کی خدمات کو سراہا۔کے ایچ خورشید بہت اچھی یاداشت کے مالک تھے اور اپنے کارکنوں کے نام تک انہیں یاد تھے۔ عام لوگوں سے بھی بہت اچھی طرح ملتے تھے اور ان سے مل کر کسی کو بھی کم مائیگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور

اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں ان کی موجودگی میں مجھے تقاریر کرنے کا موقع ملا جو میرے لیے ایک اعزاز ہے۔اُن کی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل ان کا پنجاب یونیورسٹی لاہور میں مسئلہ کشمیر کے حوالے اہم خطاب سُنا اور بعد میں اُن سے ملاقات بھی ہوئی جو شائد آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ ۱۹۸۵ء میں جب میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کشمیری طلباء کی تنظیم جموں کشمیر سٹوڈنٹس آرگنائیزیشن کا جنرل سیکریٹری تھا تو یونیورسٹی میں مسئلہ کشمیر پر ایک سیمنار منعقد کیا جس میں کے ایچ خورشید کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے دعوت دی ۔انہوں نے وہاں بہت اہم خطاب کیا۔ خورشید صاحب نے کہا کہ جب مخلص سیاستدان زندہ ہوتے ہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن جب وہی دنیا سے چلے جاتے ہیں تو قوم ان کی خدمات کا اعتراف کرنا شروع کردیتی ہے۔ اُن دنوں جہاد اور مسلح جدوجہد سے کشمیر کی آزادی کی باتیں ایک بار پھر شروع تھیں جس پر خورشید صاحب کا موقف تھا کہ سیاسی اور سفارتی جدوجہد سے مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنا چاہیے اورآزاد کشمیر حکومت کو پاکستان بھی تسلیم کرے اور دنیا کے دیگر ممالک سے بھی یہ مطالبہ کیا جائے اور اس طرح آزاد کشمیر حکومت خود بین الاقوامی سطح پر اپنی آزادی کی بات خود کرے۔ میرے ذاتی مشاہدہ کے مطابق بھی انہوں نے درست راستہ کی نشاندہی کی تھی ۔جب ہم کشمیر کمیٹی سویڈن کے پلیٹ فارم سے سویڈن میں مسئلہ کشمیر کی لابنگ کے لیے جاتے ہی تو اس کا واقعی احساس ہوتا ہے۔

۱۹۸۷ء میں وہ آزاد کشمیر اسمبلی میں قائد حزب اختلاف تھے۔ میرے برادر محترم طارق محمود چوہدری کے اُن کے دیرینہ تعلقات تھے۔ ہمارے انکل چوہدری محمد شفیع جنہوں نے ہمیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا وہ گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول بھمبر میں سنئیر مدرس تھے اور انہوں نے ایک طویل مدت تک اس علاقہ میں علم کی شمع روشن کئے رکھی۔ اُن کا انتقال خورشید صاحب سے پورے ایک سال قبل ۱۱ مارچ ۱۹۸۷ء میں ہوا۔ ہم نے ان کی یاد میں محمد شفیع چوہدری میموریل سوسائٹی قائم کی تاکہ بھمبر کے ذہین طلباء کی حوصلہ افزائی کی جاسکے۔ اس سلسلہ کے پہلے پروگرام میں ہم نے خورشید صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا۔ اُن کے ساتھ لبریشن لیگ کے اہم رہنماء چوہدری سلیمان، راجہ بسی محمد اور دیگر شریک ہوئے۔ خورشید صاحب نے میٹرک اور پی ٹی سی کے امتحان میں اول دوم اور سوم آنے والے طلباء میں میڈل اور اسناد تقسیم کیں۔ اس موقع پر انہوں تعلیم کے حوالے سے بہت اہم خطاب کیا اور بتایا کہ اُن کے والد سکول میں صدر معلم تھے۔ تقریب کے بعد وہ ہمارے گھر تشریف لائے اور اس طرح ان سے ایک اور یادگار ملاقات ہوئی۔ انہوں اپنی زندگی کا آخری خطاب وکلاء کنوینشن میرپور میں ۱۰ مارچ ۱۹۸۸ء کو کیا۔ انہوں نے وہ تاریخ ساز پیغام دیا جو آج بھی سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسان آتے جاتے رہتے ہیں مگر اُن کے اصول ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو لوگ اصولوں کی خاطر زندہ رہتے ہیں وہ

ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی خاطر جدوجہد کرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ۔ بلاشبہ انھوں نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور اُن کے لیے جو احترام اور عزت ہے وہ شائد کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اُن کے مخالفین بھی اُن کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ ان دامن ہر طرح کی کرپشن، لالچ اور مالی بددیانتی سے پاک رہا جو آج کل کے سیاستدانوں کا طرہ امتیاز ہے۔ قائدِاعظم کے سیکریٹری، آزاد کشمیر کے صدر اور قائدِ حزب اختلاف رہنے کے باوجود بیرسٹر کے ایچ خورشید وہ پوری عمر کرائے کے مکان میں رہے، وفات پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے ہوئے ہوئی اور مرتے وقت جیب سے صرف ۳۷ روپے نکلے۔ کیا آج پورے پاکستان اور آزاد جموں کشمیر میں قومی سطح کا ایک بھی رہنما ہے جو اُن جیسا ہو۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

عورت اپنے خالق کی نظر میں

عورت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا اور کہا جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات ہوں یا شعراء، مذہبی رہنما ہوں یا سماجی شخصیات، سب نے اپنے اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر بہت کچھ کہا ہے۔ مختلف ممالک اور تہذیوں میں عورت کے بارے میں طرح طرح کی کہاوتیں موجود ہیں۔ کہیں عورت کو کم عقل، مسائل کی ذمہ دار اور نجانے کیا کیا کہا جاتا توکچھ نے اسے ایسا پیچیدہ معمہ قرار دیا کہ جسے سمجھنے کے لیے عمر خضر چاہیے لیکن دوسری طرف عورت کے مقام و مرتبہ اجاگر کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ مولانا حالی عورت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے ملکوں کی بستی ہو تم ہی قوموں کی عزت تم سے ہے

ابولاثر حفیظ جالندھری بھی اپنی نظم میں عورتوں کی یوں عزت افزائی کرتے ہیں

یہ ہماری مائیں بہنیں اور بیوی بچیاں ہم سمجھتے ہیں انہیں اتنا مقدس بے گماں

اس قدر پاک اور مقدس اتنی محبوب و عزیز جس قدر عورت کی عفت ہے، نہیں ہے کوئی چیز

عورت کے بارے میں مختلف نوعیت کے تصورات اور نظریات کے پیش نظر ضروری ہے کہ عورت کے خالق کی طرف رجوع کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ اصل حقائق کیا ہیں۔ یہ حقیقت تو سب ہی تسلیم کریں گے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں اُس کو بنانے والا ہی سب سے بہتر بتا سکتا ہے اس غرض سے ہم عورت کے خالق اور اور اسے پیدا کرنے کرنے والے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُس نے جو عورت کی بابت کہا ہے اُس سے آگاہی حاصل کرتے ہیں تاکہ عورت کی اصل حقیقت آشکار ہو سکے۔ رب کائنات نے انسانیت کے نام اپنے آخری پیغام میں انسان کی تخلیق اور اُس کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور کہا کہ ہم نے تمام بنی نوع انسان کو قبل عزت پیدا کیا ہے (۱۷،۷۰) ظاہر ہے اس میں عورت بھی شامل ہے۔ انسان ہونے کے ناطے سے جو پیدائشی خصوصیات مردوں میں ہیں وہی خوبیاں عورتوں میں بھی موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو انسان قرار دیا ہے اس ضمن میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ قرآن حکیم کی روشنی میں انسانوں کی بحیثیت مجموعی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ایک الگ سے کالم لکھا جائے گا سر دست ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ بطور خاص عورت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کیا کہا ہے یعنی عورت قرآن کی روشنی میں میں۔ چونکہ موضوع اہم ہے اس لیے قرآنی آیات کے حوالے بھی ساتھ دیئے جا رہے ہیں تاکہ قارئین مزید تفصیل خود دیکھ لیں۔

ابتدائے آفرینش سے چونکہ عورت معاشی طور پر مرد کی مرہون منت رہی ہے اور اسے اپنے تحفظ کے لیے بھی مرد کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن یہی انحصار مرد کی حاکمیت کا باعث بن گیا۔ قبائلی معاشرہ، رسوم و رواج اور مذہبی تعلیمات نے یہ تصور دیا کہ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یعنی عورت پیدائش کے اعتبار سے اہم نہیں اور اس کی ذات کو پیدا کرنا مقصود نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے اور وہ مرد کی دلجوئی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس تصور کو اسلام نے رد کرتے ہوئے سورہ نساء کی پہلی ہی آیت میں انسان کی تخلیق کے بارے میں بتایا کہ اُسے نفس واحدہ سے پیدا کیا۔ دور حاضر کے مفسرین نفس واحدہ سے مراد ایک خلیہ لیتے ہیں جس سے تمام انسانوں کی تخلیق ہوئی۔ یہی تصور جدید سائنسی تحقیقات کے بھی مطابق ہے گویا تمام انسان یعنی مرد اور عورتوں کی تخلیق کا آغاز ایک سیل سے ہوا تھا لہٰذا پیدائش کے اعتبار دونوں یکساں ہیں۔ اسی حقیقت کو سورہ الاعراف کی آیت ۱۸۹ میں پھر دہرایا کہ تمام انسانوں کو نفس واحدہ (Single Cell) سے پیدا کیا۔ ان دونوں قرآنی آیات سے اس تصور کی نفی ہوجاتی ہے کہ تخلیق کے لحاظ سے عورت کی حیثیت ثانوی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصور بھی عام کہ حضرت آدم نے اپنی بیوی یعنی حضرت حوا کے کہنے پر ہی شجر ممنوع کھایا تھا تھا۔ گویا آدم کے جنت سے نکلوائے جانے کا ذمہ دار عورت کو قرار دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس تصور کو بھی رد کردیا اور بتایا کہ شیطان نے دونوں کو ورغلایا اور دونوں نے غلطی کا

ارتکاب کیا (سورہ بقرہ ۳۶)۔ چونکہ دونوں مشترکہ طور پراس کے ذمہ دار تھے اور دونوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے بیک زبان دونوں نے توبہ کی دعا کی (سورہ االاعراف ۲۳) اللہ تعالٰی نے دونوں کی توبہ قبول کی۔ یہاں یہ امر بھی اہم ہے کہ قرآن مجید میں حوا کا نام تک نہیں آیا۔

خالق کائنات نے بھی واضح کردیا کہ مرد ہو یا عورت جو بھی نیک اعمال کرے گا اُسے جنت ملے گی (۱۹۵ء۳، ۷۱ء۹)۔ اس کی مزید وضاحت سورہ نساء کی آیت ۱۲۴ میں یوں کی، اور جو کوئی نیک اعمال کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت درآنحالیکہ وہ مومن ہے پس وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اوران کی تِل برابر (بھی) حق تلفی نہیں کی جائے گے۔ سورہ النحل کی آیت ستانوے میں یہی اصول پھر دہرایا، جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطافرمائیں گے۔ اوران کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔ اس حقیقت کو تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے وراثت میں عورت کا حصہ نہیں ہوتا تھا اور اسلام نے ہی عورت کو یہ حق دیا۔ قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ، مردوں کے لئے اس مال) میں سے حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور) عورتوں کے لئے (بھی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں سے حصہ ہے۔ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ (اللہ کا) مقرر کردہ حصہ ہے (سورہ نساء آیت ۷)۔ اسلام نے عورتوں کو کام کرنے اور کمانے

کا کی اجازت دیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ عورتیں کما بھی سکتی ہیں اور وہ اپنے مال کی مالک و مختار بھی ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ۳۲ میں اس کی وضاحت یوں کی ، اور تم اس چیز کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا، اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا، اور اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو، بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ عورت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ یعنی شادی اور اپنے جیون ساتھی کو اپنی مرضی سے چننے کا حق بھی اسلام نے دیا اور قرآن حکیم میں واضح کیا کہ عورت کی زبردستی شادی نہ جائے (۱۹؍۴)۔ اسی طرح شادی کے لیے بلوغت کو بھی اہم قرار دیا تاکہ اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلہ کے وقت وہ باشعور ہوں اس طرح کم سنی کی شادی کا راستہ بند کیا (۶؍۴)۔

خالق کائنات نے مرد ور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے (۱۸۷؍۲) یعنی وہ ہیں۔ قرآن حکیم عورتوں کو complementary part ایک دوسرے کا زوج یعنی مردوں کا ہمدوش قرادیتا ہے۔ انہیں نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی ایک دوسرے کا ساتھی اور مددگار کہا ہے۔ سورہ توبہ کی آیت ۷۱ میں ہے اور اہلِ ایمان مرد اور اہلِ ایمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں۔ وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز قائم

رکھتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت بجالاتے ہیں، ان ہی لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا، بیشک اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔ خالق کائنات مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ سورہ احزاب کی آیت ۳۵ کو دیکھیے اور جھوم جایئے کہ کس طرح وضاحت سے یہ بیان کیا ہے کہ جو خوبیاں مردوں میں ہیں وہی عورتوں میں بھی موجود ہیں۔ مردوزن کی تفاوت کے حوالے سے دنیاکے کسی بھی لٹریچر میں ایسی تفصیلی یکسانیت اور ادبی حسن نظر نہیں آئے گا۔ ارشاد ہوتا ہے بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور مومن مَرد اور مومن عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، اور صدق والے مرد اور صدق والی عورتیں، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں، اور عاجزی والے مرد اور عاجزی والی عورتیں، اور صدقہ و خیرات کرنے والے مرد اور صدقہ و خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، اللہ نے اِن سب کے لئے بخشش اور عظیم اجر تیار فرمارکھا ہے۔ غور کریں کہ زندگی کا کون سا گوشہ اور خوبی رہ گئی ہے جو صرف مردوں میں ہو اور عورتیں اس سے محروم ہوں۔ علامہ اقبال نے عورت کی عظمت اور اہمیت کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اسٹریس۔ذہنی دباؤ آپ کا مقدر کیوں ہو

اسٹریس یعنی ذہنی دباؤ صحت انسانی کا خطرناک دشمن ہے اور المیہ یہ ہے کہ دور حاضر کا ہر انسان کسی نہ حوالے سے اس کا شکار ہے۔ ذہنی دباؤ سے مراد کیا ہے، یہ جسم انسانی پر کون سے اثرات اور تبدیلیاں مرتب کرتا ہے اور اس سے نجات کو کیا طریقہ کار ہوگا۔اس کالم میں انتہائی اختصار کے ساتھ قارئین کی خدمت میں وہ معلومات پیش کرنا مقصود ہیں جو اُن لیے مفید اور اہم ہوں۔ اسٹریس یا ذہنی دباؤ کا لفظ عموماً ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ہم مختلف وجوہات کی بنا پر تناؤاور پریشانی کا کا شکار ہوتے ہیں۔یہ ایک قسم کی منفی قوت ہوتی جس سے ہمارا جسم متاثر ہوتا ہے۔ اس کے محرکات بیرونی ہوتے ہیں اور یہ طویل مدت کے بھی ہو سکتے ہیں جیسے بے روزگاری، خانگی مسائل، مستقبل کا فکر وغیرہ اور یہ مختصر دورانیہ کے ہوتے ہیں جیسے ٹریفک میں پھنس جانا یا کسی جگہ وقتِ مقررہ پر نہ پہنچ سکنا۔ اسٹریس ہر وقت بُرا نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مثبت اسٹریس کسی بھی کام کو بر وقت کرنے کے لیے اہم ہے جیسے کسی طالب علم کے لیے امتحان کی تیاری۔ اسٹریس یا ذہنی دباؤ اس وقت مسئلہ بنتا ہے جب وہ دائمی اور لمبے عرصہ کے لیے ہو اور اُسے اپنے آپ پر حاوی کرلیا جائے جس سے جسم انسانی کی کارکردگی بہت متاثر ہوتی ہے۔ یہی اسٹریس بعد میں بے چینی

کی شکل بھی Distress جو بڑھ کر ڈپریشن تک جاسکتا ہے۔ اسٹریس پھر (anxiety) اختیار کرلیتا ہے۔ کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہونے والے حادثہ سے خوف اور پریشانی اور ماضی میں ہونے والے کسی ناخوشگوار واقعہ سے پیدا ہونے والی صورت حال حزن بھی ذہنی دباؤ کا سبب بن جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو ناکام سمجھنا اور مطلوبہ نتائج نہ ملنا، پریشان رہنا، منفی خیالات، خود اعتمادی اور قوتِ فیصلہ کی کمی جیسی صورت حال ظاہر ہوتی ہے۔

اسٹریس جسم انسانی پر بہت نقصان دہ اثرات مرتب کرتا ہے۔ ہمارا جسم اس چیلنج سے نبٹنے کو کوشش کرتا ہے۔ بیرونی محرک سے انسان کا اعصابی نظام اثر لیتا ہے اور دماغ نامی ہارمون CRH کے حصہ ہائی پو تھلمس کو مضر پیغام ملتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ خارج کرنے کے لیے ACTH کو ایک اور ہارمون Pituatry gland خارج کرتا ہے جو مزید ہارمون پید Adrenal Cortex کہتا ہے جس کے نتیجہ میں گردوں میں موجود اکرتے ہیں ۔ اسٹریس کی وجہ سے ایڈرینالین، تھائی رائیڈ ہارمون، انسولین، پرولیکٹن، کارٹی سول اور کچھ اور ہارمون دوران خون میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اس ساری صورت حال کی وجہ سے دوران اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے ۔ خون کا دباؤ اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور جسم کا میٹا بولزم متاثر ہوتا ہے اور جسم پر پریشانی طاری ہوجاتی ہے۔ سانس تیز ہوجاتی ہے اور بعض صورتوں میں ہاتھوں میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوتی ہیں اور متاثرہ شخص سمجھتا ہے کہ وہ بے

ہوش ہونے لگا ہے۔ سر درد، پٹھوں کا کھچاؤ اور کچھ لوگوں کو منہ کے چھالوں کی تکلیف ہو جاتی ہے۔پژمردگی کا دورہ پڑ سکتا ہے اور کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جسمانی مدافعتی نظام بُری طرح متاثر ہوتا ہے اور جلدی انفیکشن ہونے لگتی ہے۔ جدید تحقیق سے یہ بھی سامنے آیا کہ اسٹریس سے وارثتی مادے ڈی این اے کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

اسٹریس جیسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کاغذ اور قلم اٹھایئے اور اُن محرکات کی فہرست بنائیں جو آپ کے خیال میں ذہنی دباؤ کا سبب ہیں تاکہ اُن سے نبٹا جاسکے۔ کسی انجانے خوف اور خواہ مخواہ کے وسوسوں کو ذہن سے نکال دیں۔ ہر وقت منفی اور نقصان دہ نتائج نہ سوچیں۔ نتیجہ آپ کے حق میں بھی آ سکتا ہے اس لیے ابھی سے پریشان نہ ہوں جب مشکل آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ کامیابیاں اور ناکامیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کا ہر وقت رونا نہ روئیں بلکہ اپنی کامیابیوں کی بھی ایک فہرست بنائیں اور پژمردگی کے وقت اُس پر نگاہ ڈالیں۔ اپنا ایک Satisfaction Model بنائیں کہ آپ کے لیے کیا کیا بہت اہم اور ضروری ہیں۔ اب یہ دیکھیں کہ آپ نے اس میں سے کتنا حاصل کر لیا ہے۔ اپنے آپ پر فخر کریں اور اپنی قسمت پر مطمئن رہیں۔ آپ نے اپنے ذہنی دباؤ کی جو فہرست بنائی اس پر بار بار غور کریں ممکن ہے کہ بہت سے وسوسے آپ نے جان بوجھ کر پال لیے ہوں اور وہ آپ کے لیے اتنے

اہم نہ ہوں۔ انہیں فہرست سے نکال دیں۔ ہر ایک کے حالات اور ملنے والے مواقع مختلف ہوتے ہیں۔ ہر سیر پر سوا سیر ہوتا ہے۔ دوسروں نے جو سخت محنت کی ہو ممکن آپ اس سے آگاہ ہی نہ ہوں۔ زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ آپ اپنی پوری کوشش کے بعد نتائج اپنے رب پر چھوڑ دیں جس کا وعدہ ہے کہ کسی کی بھی محنت ضائع کرتا۔ ممکن جو آپ کو نہیں مل رہا اُسی میں آپ کی بھتری ہو۔ اپنے جذبات دبائیں نہیں بلکہ اُن کا اظہار کریں۔ اپنے بہت اچھے دوست سے حال دل کہیں یا گھر کے کسی فرد سے اس بارے میں بات کریں بلکہ اپنے آپ سے بھی مشورہ کریں۔ آپ دیکھیں کہ پریشانی کم ہوتی جائے گی اور آپ ذہنی دباؤ سے نکلتے جائیں گے۔ آپ اکیلے نہیں جو اس صورت حال سے دوچار ہیں۔ دنیا میں لاکھوں لوگ آپ کی طرح ہوں گے۔ یہ سوچیں کی زیادہ سے زیادہ کیا ہوجائے گا۔ انسان کی ضرورت ایک وقت میں دو روٹیاں اور سونے کے لیے ایک بستر ہے باقی سب ہم نے غیر ضروری فہرست بنا رکھی ہے جس کے پیچھے پوری عمر بھاگتے رہتے ہیں لیکن ممکن ہے انہیں کبھی استعمال بھی نہ کرتے ہوں۔ بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے باقی ہر ایک فنا ہونا ہے۔ یہ دنیا بھی ایک دن ختم ہونے والی ہے تو پھر Expiry date ہے اور ہر چیز کی اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔

آپ پر سب سے زیادہ حق آپ کا اپنا ہے۔ اگر آپ کی صحت اچھی ہوگی تو کام

کر سکیں گے اور اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اس لیے سب سے زیادہ توجہ اپنے آپ پر دیں۔ اپنی خوراک، آرام اور سکون کا خود خیال کریں۔ ورزش اور چہل قدمی کے لیے وقت ضرور نکالیں اور اپنے آپ کو Relax رکھیں۔ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے۔ اللہ کے بندوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا تو ذہنی دباؤ اور پریشانی آپ کا مقدر کیوں ہو۔ اپنا تعلق اپنے رب کے ساتھ جوڑیں۔ اللہ نے حضورﷺ کی زندگی کو ہمارے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ کون ایسا دکھ اور غم ہے جو حضورؐ نے اپنی اس دنیاوی زندگی میں نہیں اٹھایا۔ بچپن والدین کے بغیر، دعویٰ نبوت کے بعد شعیب ابی طالب کی صورت میں معاشرتی بائیکاٹ، بیوی حضرت خدیجہ کا انتقال، بیٹوں کی وفات، اپنا شہر چھوڑنا پڑا، بیٹیوں کو طلاق ہوئی، الزامات لگائے گئے اور ہر طرح کی مشکلات سامنے آئیں لیکن ثابت قدمی سے سامنا کیا تو اُن کے نام لیوا کو بھی اس اُسوہ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا سفر زندگی بسر کرنا چاہیے۔ بہت سے تفکرات ہم نے خود ہی اپنے سر لیے ہوتے ہیں اُن سے نجات حاصل کریں۔ دنیا کی فکر میں اپنے آپ کو پریشان نہ ہوں، جو اس کا مالک ہے وہ اس کے راز بہتر جانتا ہے آپ حکیم الامت کا یہ پیغام مد نظر رکھیں کہ

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟ مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

جہاد سے فساد تک

دنیا کی اقوام علم و آگہی اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہمہ وقت تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں۔ سمندر گہرائیاں ہوں یا کائنات کی وسعتیں، مریخ پر کمند ڈالنی ہو یا خلیہ کے اندر ایک جہاں کی کھوج غرض ہر شعبہ زندگی میں نت نئی ایجادات اور دریافتیں سامنے آ رہی ہیں۔ نئے نئے علوم اور بہترین درسگاہیں قائم کرنے میں ایک دوسرے مقابلہ جاری ہے مگر صد افسوس کہ امت مسلمہ کے افراد ایک دوسرے کے گلے کاٹنے اور حکومتیں ایک دوسرے کو نیچا دیکھانے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ غیر مسلم طاقتیں اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں لیکن آلہ کار کون بنا ہوا ہے۔ کیا مسلم دنیا سے دانش اور حکمت بالکل اٹھ گئی ہے اور کسی کو بھی اس کا احساس نہیں۔ نسلی، علاقائی اور مذہبی تعصّبات کے پس منظر میں اپنے سیاسی اور دوسرے مفادات کی خاطر ملت اسلامیہ کو ناکارہ اور دنیا میں تماشہ بنا دیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ علامہ اقبال سے تھوڑی سی معذرت کے ساتھ کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا کہ عرب و ایران کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں۔
غضب ہیں یہ 'مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے! بگاڑ کر تیرے مسلموں کو

یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

اللہ تعالیٰ نے فرقے بنانے سے سخت منع کیا ہے (آل عمران ۱۰۳، الشوریٰ ۱۳) اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو کسی نہ کسی فرقہ سے منسلک کرتے ہیں اور سینہ تان کر اپنے آپ کو سُنی، شیعہ اور سلفی وغیرہ کہتے ہیں۔ غیر مسلم طاقتوں نے مسلمانوں کو تباہ اور آپس میں لڑانے کا راز بھانپ لیا ہے کہ اس کے لیے انہیں خود سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ فرقہ پرستی، عربی و عجمی، علاقائی اور نسلی تعصبات کی موجودگی میں کسی بیرونی دشمن کی ضروت ہی نہیں۔ علاقائی اور فرقہ وارانہ کشیدگی ایک عذاب کی صورت مسلمانوں پر مسلط ہے اور یہ ہو بھی کیوں نہ جب اللہ تعالیٰ نے فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب قرار دیا ہے (آل عمران ۱۰۵) ۔ فرقہ اور گروہ بندی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے الشوریٰ ۱۴) تعصبات اور فرقہ واریت کی بنیاد پر امت مسلمہ کو پارہ پارہ کرنے والے) افراد، رہنما یا حکومتیں وہ یہ ضرور ذہن میں رکھیں کہ روز قیامت خدا اُن سے اس جرم عظیم کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ اور اللہ فیصلہ کردے گا (الجاثیہ ۱۷) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضع کر دیا کہ جنھوں نے بھی فرقے بنائے رسول پاک ﷺ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں (انعام ۱۵۹)۔ پاکستان اور مشرقی وسطیٰ جس آگ میں جل رہا ہے وہ اسی فرقہ واریت کی لگائی ہوئی ہے اور اب نہ بجھی تو سب کا گلستان جل اٹھے گا۔

جہاد جیسی اہم اصطلاح کو بہت غلط معنی پہنائے گئے ہیں۔ جہاد کا لفظ سنتے ہی ایک تصور ابھرتا ہے کہ داڑھی والے مذہبی دیوانوں کا ایک مسلح گروہ نعرہ تکبیر بلند کرتا ہوا آگے بڑھا رہا ہے اور جو بھی مخالف سامنے آئے گا اُن کی گردن اڑا دے گا۔ غیر مسلموں تو ایک طرف خود مسلمانوں میں جہاد کا اسی نوعیت تصور ہے یعنی بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے ۔ حالانکہ جہاد کا معنی جنگ کرنا یا قتل کرنا ہے ہی نہیں بلکہ اس کا معنی کوشش اور مصروف جدوجہد ہونا ہے۔ کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری کوشش اور طاقت استعمال کرنا اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ قرآن حکیم نے اسی مفہوم میں جہاد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی کے اندر ایک گوشہ دین کی سربلندی کے لیے میدان کارزار میں اترنا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کرنا اور جو دشمن دین پر حملہ آور ہوں ان کا خاتمہ کرنا جسے قرآن نے قتال سے موسوم کیا ہے۔ لہٰذا ہر جہاد جنگ یا لڑائی نہیں البتہ قرآنی احکامات کی روشنی میں کی جانے والی جنگ جہاد کے ذمرہ میں آئے گی۔ قرآن مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیتا ہے صرف اس لیے کہ فتنہ اور ظلم ختم ہوجائے اور دنیا میں امن قائم ہو۔ اسلام صرف اپنے دفاع کے لیے جنگ کا حکم دیتا ہے یا پھر ظلم اور زیادتی روکنے کے لیے چاہے یہ کسی کی بھی طرف ہو۔ یہ جنگ بنیادی حقوق انسانی کے لیے ہوگی جس کی کچھ شرائط ہیں۔ جنگ کا مقصد مال غنیمت کا حصول نہیں۔ جنگی قیدی جن میں عورتیں بھی شامل ہیں انہیں فدیہ لے کر یا اپنے قیدیوں کے تبادلہ میں یا

پھر احسان کرکے چھوڑنا ہوگا۔ انہیں غلام یا لونڈی نہیں بنایا جاسکتا (۴:۴۷) پورے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنالو۔ قرآن حکیم میں جہاں یہ ذکر آیا کہ کافروں سے لڑوں اس کا اطلاق دور حاظر کے ہر غیر مسلم پر نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ احکامات اُن مشرکین اور کفار کے بارے میں ہیں جنھوں نے بار بار معاہدے توڑے اور جن سے مسلمان محفوظ نہ تھے۔ سورہ توبہ کا آغاز اسی اعلان سے ہوتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے جہاں بھی قرآن حکیم میں یہ آیا کہ اللہ کی راہ میں لڑو۔ محکوم عورتوں اور بچوں کو آزاد کراؤ وغیرہ۔ یہ احکامات مسلمانوں کی حکومت کے لیے ہیں اور نظام مملکت ہی جنگ کا فیصلہ کرے گا جیسا کہ دور حاضر میں ہر ملک کرتا ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ نہیں ہر مسلمان اٹھے اور جہاں جہاں غیر مسلم دیکھے اُن کو قتل کرتا جائے۔ دور رسالتؐ ہو یا خلفائے راشدینؓ کا عہد ایک بھی ایسی مثال نہیں کہ کسی صحابی نے انفرادی طور پر یا صحابہ اکرامؓ کے کسی گروہ نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کیا ہو اور وہ جہاد کے نام پر از خود مسلح کاروائیاں کی ہوں۔ جب بھی تلوار کے جہاد کی ضرورت پیش آئی اُس وقت کی حکومت نے فیصلہ کیا۔ اس لیے اسلامی ممالک جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہ رہی ہو وہاں صرف حکومت ہی جہاد بسیف کا اعلان کرسکتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان حکومت ایسا اعلان نہیں کررہی لیکن شخص یا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا ضروری ہے تو وہ اس مقصد کے لیے رائے عامہ ہموار کرسکتا ہے لیکن پھر بھی از خود

مسلح جہاد کا نہ اعلان کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی کاروائیاں کرنے کا مجاز ہے۔ البتہ جو مسلمان محکوم ہیں اور اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں وہ باہم متحد ہو کر جہاد آزادی کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ایسے مسلمان جو غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی صورت میں رہ رہے انہیں وہاں کے قوانین کی پابندی لازمی ہے بصورت دیگر وہ پہلے اُن ممالک کی شہریت سے دستبردار ہو جائیں اور پھر جہاں مرضی جائیں کیونکہ قرآن حکیم ہمیں معاہدوں کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔

اپنے بچوں کو نام نہاد جہادیوں کے چنگل میں جانے سے بچایئے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ بچوں کو جہاد کی اصل تعلیمات سے روشناس کروائیں کیونکہ وہ شدت پسند عناصر قرآن کی چند آیات اور کچھ احادیث لیکر بچوں کو اپنا شکار بناتے ہیں۔ جہاد کے نام پر جو فساد ہو رہا ہے اس سے آگہی بہت ضروری ہے۔ چونکہ بچوں ناسمجھ ہوتے ہیں اور یہ عناصر اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بچوں کو جہاد اور قتال کی اصل صورت سے آگاہ کرنے کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اللہ نے ناحق قتل کرنے کو حرام قرار دیا ہے (۳۳، ۶،۱۵۲)۔ اگر فریق مخالف رک جائے تو تم بھی رک جاؤ اور زیادتی نہ کرو (۳۔۱۹۲، ۱۷، ۲)۔ اگر دشمن صلح کی طرف جھک جائے تو تم بھی جھک جاؤ (۸،۶۱)۔ اگر مشرکوں میں سے کوئی پناہ طلب کرے تو انہیں پناہ دو اور امن کی جگہ پہنچا دو (۹،۶)۔ جن لوگوں نے تم سے دین کے

بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ احسان اور منصفانہ سلوک کرو (۶۰،۸)، دشمن سے بھی عدل کرو (۵،۸)، دشمن سے نرمی سے بات کرو ممکن ہے کہ وہ سمجھ جائے (۴۴،۲۰)، جنگ سے پہلے معاہدہ صلح پیش کرو اور دشمن کے سربراہوں کو عزت سے مخاطب کرو (۲۹،۲۷)۔ کیا ایسی تعلیمات دینے والا دین امن کا پیامبر نہیں لیکن نام نہاد جہادی عناصر یہ آیات نہ پڑھتے ہیں اور نہ اپنے پیروکاروں کے سامنے رکھتے ہیں۔ دین نے فتنہ کو قتل سے بھی بدتر قرار دیا ہے چاہیے اس فتنہ کے لیے شمشیر اٹھے یا نعرہ تکبیر، بقول اقبال

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ شمشیر ہی کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر

میرپور کے ضمنی انتخابات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کوئی کامیابی پر فاتح کو مبارکباد پیش کر رہا ہے تو کوئی شکست کی وجوہات کہیں اور تلاش کر رہا ہے۔ مجھے فتح اور شکست سے غرض نہیں بلکہ سوال یہ اہم ہے کہ جس ایوان کی رکنیت اس قدر سخت محنت سے حاصل کہ گئی ہے اسکی اپنی حیثیت کیا ہے۔ جس قانون اسمبلی کی رکنیت ملنے پر جشن مسرت جاری ہے اُس اسمبلی کی اپنی وقعت اور اختیار کتنا ہے۔ کیا وہ واقعی ایک قانون ساز اسمبلی ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی سے قانون سازی کر سکتی ہے اور کیا وہ آزاد کشمیر کے ایکٹ میں کوئی ردوبدل کرنے کی مجاز ہے۔ سوشل میڈیا پر ایک حالیہ ویڈیو گردش کرہی ہے جس میں آزاد جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی کے قائد ایون اور وزیراعظم چوہدری عبدالمجید اپنی پریس کانفرس روک کر کسی شخصیت کو سر سر کہہ کر مخاطب ہیں اور بتا رہے ہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں مذکورہ شخص کو سیکریٹری ہاوسنگ لگا دیا ہے۔ یہ چوہدری مجید پر ہی موقوف نہیں بلکہ جب بیرسٹر سلطان محمود آزاد کشمیر کے وزیراعظم تھے تو وہ پی پی کی ناہید خان کا استقبال کرنے خود مظفرآباد ایئرپورٹ پہنچ جاتے تھے۔ مسلم لیگ ن کے اراکین کو بھی آپ نے وزیر امور کشمیر کا استقبال کرتے اور باریابی کا شرف حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ بالکل اسی طرح مسلم کانفرس کے اراکین اسمبلی جے

اوسی مری کے دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ۲۰۰۱ء میں سرادر سکندر حیات محض چار نشستیں ہونے پر بھی وزیراعظم بن گئے اور سردار عتیق اٹھارہ اراکین ساتھ ہونے کے باوجود منہ دیکھتے رہ گئے۔ اب میرپور کے ضمنی انتخاب میں ن لیگ کے امیدوار کی دستبرداری سے سردار سکندر حیات کو اپنے مزارع ہونے کا احساس ہوا حالانکہ یہ احساس انہیں اس وقت ہی ہو جانا چاہیے تھا جب مقتدر حلقوں نے انہیں مسند اقتدار پر بٹھایا تھا۔ آزاد کشمیر کے تمام سیاستدانوں کو مظفرآباد کی کرسی اقتدار کے مقام و مرتبہ کا بخوبی علم ہے لیکن وہ اپنی خودداری اور عزت نفس بیچ کر بھی اُس کے حصول کے لیے دن رات سرگرداں ہیں اور جب اس پر متمکن ہوتے ہیں تو وزارتِ امور کشمیر کے جوائنٹ سیکریٹری کا ٹیلی فون بھی کھڑے ہو کر سنتے ہیں۔

اس بے اختیار کرسی کے حصول کے لیے آزاد کشمیر کے سیاستدانوں میں کیوں رسہ کشی جاری رہتی ہے۔ حالانکہ اسی ایوان اقتدار سے ماضی میں سرادر ابراھیم، کے ایچ خورشید، سردارر عبدالقیوم، سردار سکندر حیات، ممتاز حسین راٹھور اور دوسروں کو کس قدر بے توقیر اور تضحیک آمیز رویہ اختیار کرتے ہوئے اقتدار سے الگ کیا گیا۔ آزاد کشمیر کے تمام سیاستدانوں کو آپس میں مل کر پہلے آزاد کشمیر کے اقتدار اعلیٰ اور آزاد کشمیر حکومت کے مقام و مرتبہ پر متفق ہونا چاہیے۔ آزاد حکومت کو پوری ریاست کی نمائدہ حکومت کا درجہ حاصل ہو جو

وہاں کے عوام کی حقیقی ترجمان ہو۔ آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی حقیقت میں ایک قانون ساز اسمبلی ہو تو پھر انتخاب پر جشن شادمانی بنتا ہے لیکن بے اختیار اسمبلی کی رکنیت اور بے وقعت اقتدار پر یہ محض جشن بے اختیاری ہے۔ آج مسلم کانفرس غیر ریاستی سیاسی جماعتوں کی آمد پر چیخ رہی ہے لیکن اسے اپنے ماضی پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اُس نے خود پاکستان کی عملی سیاست میں کیوں دخل اندازی کی۔ وہ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کا نواں ستارہ کیوں بنی۔ مہاجرین کی بارہ نشستیں حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ دوسری سیاسی جماعتوں سے مسلم کانفرس ایک قدم آگے بڑھ کر ملٹری ڈیموکریسی کا نعرہ لگا رہی اور ساتھ غیر ریاستی جماعتوں کے آزاد کشمیر وراد ہونے پر بھی معترض ہے۔ مسلم لیگ ن آزاد کشمیر ایک عجیب کشمکش اور تضادات میں مبتلا ہے۔ وہ آزاد کشمیر میں اپنی مرضی کی سیاست بھی نہیں کر سکتی اور نہ عوام کو مطمئن کر سکتی ہے۔ جن سیاسی جماعتوں کے ریموٹ کنٹرول ریاست سے باہر ہوں ان کا یہی حشر ہوگا۔ ن لیگ نے میرپور کے ضمنی انتخابات میں آزاد کشمیر حکومت کے امیدوار کے حق میں اپنا امیدوار بٹھا لیا لیکن چند ہی دن بعد مظفرآباد میں اسی حکومت کی کرپشن کے خلاف ن لیگ کی اراکین اسمبلی نے دھرنا دیا۔ جب حکومتی امیدار کی حمایت کی جارہی تھی تو کیا اُس وقت حکومت کرپٹ نہ تھی۔ ن لیگ آزاد کشمیر کو وزیر اعظم پاکستان کے گلگت میں دیئے گئے حالیہ بیان پر بھی اپنی پالیسی جاری کرنی چاہیے جس میں انہوں نے اس خطہ کے لیے آئینی پیکج کا اعلان کیا ہے۔

وضاحت تو بیرسٹر سلطان محمود کو بھی کرنی چاہیے کہ پی ٹی آئی کی کون سی کشمیر پالیسی ہے جس سے متاثر ہو کر وہ اُس جماعت میں گئے ہیں۔ پی ٹی آئی کو بھی یہ وضاحت کرنی چاہیے کہ ایک شخص شامل ہوتے ہی پارٹی کا صدر کیسے بن گیا۔ جمہوریت اور اصول کہاں ہیں۔

آزاد کشمیر کے سیاسی رہنماء جو آئے دن برطانیہ کے دوروں پر ہوتے ہیں اور یہاں وہ دعوتیں اُڑانیں کے ساتھ پونڈ اکٹھے کرتے ہیں ان سے کسی کبھی یہ سوال بھی کیا کہ یہ سیاسی رہنماء آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں میں عوام کے حالات معلوم کرنے کبھی گئے ہیں۔ آزاد کشمیر کے عوام کے مسائل کے حل کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں۔ آزاد کشمیر سے برطانیہ کا طویل فاصلہ یہ اکثر طے کرتے ہیں لیکن کبھی جھنگ میں مقیم کشمیر مہاجرین کے پاس گئے ہیں۔ کیا کبھی اُن کشمیری مہاجرین کی بھی خبر گیری کی ہے جو تیزاب احاطہ لاہور، سیالکوٹ میں حاجی پورہ کیمپ، پکا گڑھا کیمپ، تلواڑہ، بجوات اور دیگر علاقوں میں کشمیری کہاجرین کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ کیا بھی انہوں نے کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی جارحیت کا شکار کشمیری عوام کی خبر گیری کی ہے۔ مظفر آباد میں مقیم مہاجرین کس حال میں ہیں اور انہیں بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے کیوں احتجاج کرنا پڑتا ہے۔ کیا آزاد کشمیر کی کسی بھی سیاسی جماعت نے اس بات کا نوٹس لیا کہ آزاد کشمیر اور پاکستان سے ۴۷ ۵ کشمیری مہاجرین کے خاندان

واپس مقبوضہ کشمیر کیوں چلے گئے ہیں۔ اُن کے واپس جانے سے سرحد کے اُس کے پار کیا پیغام جائے گا۔ اگر کشمیری عوام نے اپنے سیاسی رہنماؤں کا محاسبہ نہ کیا اور جو محض حصول اقتدار کے لیے کوشاں ہیں اُن سے جان نہ چھڑائی تو مسئلہ کشمیر اسی طرح حل طلب رہے گا۔ ہمیں حریت افکار کی حامل قیادت کی ضرورت ہے نہ کہ غلامانہ ذہنیت کی کیونکہ فرزند کشمیر علامہ اقبال نے خوب کہا ہے کہ

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

بیرون ملک کے سرکاری دورے اور قومی پرچم کی درآمد

یہ خبر پڑھتے ہی قلم اٹھانے پر مجبور ہوگیا کہ چینی صدر شی جن پنگ کے دورے کا ایک اہم اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس دورے میں پارلیمنٹ ہاؤس، وزیراعظم کے دفتر اور دیگر مقامات پر پاکستان اور چین کے جو قومی پرچم آویزاں کئے گئے تھے وہ ترکی سے درآمد کئے گئے تھے۔ چیئرمین سی ڈی اے نے یہ بات بڑے فخر کے ساتھ اسپیکر قومی اسمبلی کو بتائی۔ وہ تو بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور اسپیکر صاحب بھی بڑے اطمینان سے درآمد شدہ قومی پرچموں کے بارے میں سُن رہے تھے مگر مجھے شرمندگی اور افسوس ہو رہا ہے کہ جو ملک اپنا قومی پرچم بھی خود نہیں بنا سکتا وہ خاک ترقی کرے گا۔ ملک بھی ایسا ہو کہ جو دنیا میں کپڑے اور ٹیکسٹائل کی مصنوعات کے لیے نمایاں مقام رکھتا ہو۔ حال ہی میں یورپی یونین کی جانب سے پاکستانی ٹیکسٹائل کی مصنوعات کے کوٹے میں اضافہ سے حکومت اپنی کارکردگی کا ہر طرف راگ الاپ رہی تھی لیکن یہ کیا ہمیں خود اپنا قومی پرچم بنانا بھی گوارا نہیں۔ حالانکہ حکومت پاکستان کی پالیسی ہے کہ غیر ملکی ٹیکسٹائل کی مصنوعات ملک میں درآمد نہ کی جائیں۔ جس چین کی طرف ہم مدد اور سرمایہ کاری کے لیے دیکھ رہے ہیں وہ تو ایسا نہیں کرتا۔ دنیا بھر کے ممالک اپنی بنی ہوئی چیزوں پر فخر کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں غلامانہ ذہنیت ہے کہ بدیشی اشیاء کو اہمیت

دی جاتی ہے اور اب تو بات قومی پرچم تک جا پہنچی ہے۔ قومیں اپنے آپ پر فخر کرکے ہی آگے بڑھتی ہیں۔ جب تک قوم کی قیادت میں خود اعتمادی، وقار اور حمیت نہیں ہوگی دیگر اقوام میں سر فخر سے اٹھا کر نہیں چل سکتے۔ ضرورت اس امر کی احساس کمتری کی بجائے اپنے آپ پر فخر کرنا سیکھا جائے۔ ہمارے ارباب اختیار کو کچھ تو سوچنا چاہیے۔ کچھ باخبر ذرائع کا یہ کہنا ہے کہ یہ سب کمیشن مافیا کی کارستانی ہے وگرنہ وہ پرچم پاکستان میں بھی بن سکتے تھے۔ علامہ اقبال کا یہ پیغام کیوں ارباب اختیارر کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہے کہ

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

یورپ میں موسم بہار اور خوشگوار گرمیوں شروع ہوتے ہی پاکستان سے سرکاری وفود کی یہاں آمد کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ سول اور فوجی بیوروکریسی کا ایک بھاری بھرکم وفد آج کل سویڈن اور فن لینڈ کے دو ہفتے کے دورہ پر ہے۔ وفد نے سویڈش پارلیمنٹ، اہم دفاعی اداروں اور مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ سفیر پاکستان جناب طارق ضمیر نے وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ بھی دیا۔ جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے مذکورہ وفد فن لینڈ میں اپنی سرکاری مصروفیات جاری رکھے ہوئے گا۔ ایک اور وفد ہنگری اور برطانیہ کے دورہ پر ہے اور اسی طرح کے کئی.

اور وفود یورپ کے دیگر ممالک کے دورہ پر ہیں۔ ان دوروں کو اہم مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا نے جو ترقی اور خوشحالی حاصل کی ہے اس سے سبق سیکھ کر پاکستان کو بھی اسی شاہراہ ترقی پر گامزن کیا جائے۔ پینسٹھ سالوں سے سرکاری دورے بھی جاری ہیں۔ حکومتی خرچ پر ہزاروں افراد نے اعلیٰ تعلیم بھی بیرونی ممالک سے حاصل کی ہے۔ سیاستدانوں ، بیوروکریسی، ارباب اقتدار اور طلباء کے وفود بھی غیر ملکی دورے کرتے رہتے ہیں۔ ان دوروں پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ غریب عوام کے منہ سے نوالہ چھین کر ہی یہ سرکاری دورے ممکن بنائے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان دوروں سے آج تک کیا حاصل ہوا ہے۔ کیا وہاں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جو بھی بیرونی دورے پر جاتے ہیں اور وہاں کی ترقی اور بہترین نظام سے متاثر ہوتے ہیں لیکن پاکستان پہنچتے ہی جب وہ گھڑی کی سوئیاں بدلتے ہیں ساتھ اپنا پہلے والا ذہن اور رویہ اختیار کرلیتے ہیں یوں ان دوروں کا عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دوروں کا مقصد واپس جا کر عوامی فلاح و بہبود کے مثبت تبدیلیوں کا آغاز ہونا چاہیے نہ کہ سیر سپاٹے اور وہ بھی اس ملک کے ارباب اختیار کی جانب سے جو بیرونی قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسروں کا دست نگر ہے۔ اگر ان دورں سے ملک اور قوم کو فائدہ نہیں ہورہا تو انہیں بند کرکے وہی رقم سکولوں، ہسپتالوں ، سماجی بہبود اور سائنسی ترقی پر خرچ کی جائے۔ دور جدید میں اب ایسے ذرائع میسر ہیں جن کی مدد سے وہاں رہ کر بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے اور دورے کرنا ہی لازم نہیں۔ یہی بات

سویڈش میڈیا نے ۱۹۷۶ء میں اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو کہی تھی جو ۷۰ افراد پر مشتمل وفد لے کے سویڈن اور کینیڈا کے دورے پر آئے تھے۔ بے نظیر بھٹو اپنی وزارت عظمیٰ میں اس سے بھی بڑا وفد لے کر سویڈن آئیں۔ بیرون ملک کے سرکاری خرچ پر دوروں کا یہ سلسلہ ایسا جاری ہے کہ ہر حکومت سابقہ ریکارڈ توڑ رنے کے لیے سرگرم رہتی ہے۔

سویڈن اور فن لینڈ کے دورہ کرنے والے وفد کے بارے میں معلوم نہیں کہ انہوں نے یہاں سے کیا سیکھا ہے۔ اگرانھوں نے کچھ سیکھنا ہے تو یہ سیکھیں کہ یہاں کے سرکاری اہلکار قومی وسائل کو شیر مادر نہیں سمجھتے۔ یہاں ٹیکس چوری جرم عظیم ہے۔ سرکاری اہلکار صرف قانون کی پاسداری کرتے ہیں اور قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولتیں سب کے لیے برابر ہیں۔ افتتاح، سنگ بنیاد اور سرکاری تشہیر کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ تمیز بندہ وآقایوں ختم کی ہے کہ سرکاری دفتروں میں چپراسی اور گھروں میں بیٹ میں نہیں ہیں۔ سرکاری رہائشوں، گاڑیوں اور ڈرائیوروں کی سہولت کے الفاظ ہی ڈکشنری سے غائب ہیں۔ یہاں عوام کو اپنے مسائل Peon اور Sir نہیں۔ حل کروانے لے لیے دفتروں کے چکر نہیں لگانا پڑتے اور سب کام خط، فون یا ای میل کے ذریعہ ہوجاتے ہیں۔ کیا پاکستان کی بیوروکریسی یورپ کے ان دوروں کے بعد وہاں کے دفتری نظام کو بدل سکے گی۔ کیا سائلوں کے ہاتھوں سے فائلیں چھڑا کر ان کے

کام سویڈن کی طرح حل کرائے جاسکیں گے۔ کب تک ہر کام کی تان ڈی جی اور سیکریٹری پر ہی جاکر ٹوٹے گی۔ کیا پاکستان کے عوام کو افسر شاہی سے نجات مل سکے گی۔ سویڈن میں کوئی سی ایس پی کلچر نہیں۔ عہدِ وکٹوریہ کا دفتری نظام اور کاغذی کاروائی کا دور کب ختم ہوگا۔ صاحب اور آقا کا کلچر کیا ختم ہوسکے گا۔ سویڈن میں صفائی کرنے والا اور ادراے کا سربراہ ایک ہی لنچ روم استعمال کرتے ہیں گویا محمود و ایاز میں فرق نہیں روا رکھا جاتا۔ ان دوروں سے اگر وہاں کا نظام بدل سکے پھر تو یہ واقعی ضروری ہیں بصورت دیگر یہ سرکاری خرچ پر محض سیر و تفریح ہے۔ اگر پاکستانی وفد سویڈش وزیراعظم کا یہ پیغام کہ مستقبل سکول سے شروع ہوتا ہے ہی ساتھ لے جائے تو ملک کی تقدیر بدل جائے۔ سویڈش وزیراعظم کا کہنا ہے کہ طلباء کو بہترین اساتذہ، ماحول اور منصفانہ وسائل مہیا کریں گے تاکہ اگلی نسل ہمیں اچھا مستقبل دے سکے کیونکہ مستقبل سکول سے شروع ہوتا ہے۔ سویڈن میں ایک ہی طرح کا نظام تعلیم اور سکول ہیں۔ پرائیوٹ سکول نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اعلیٰ حکومتی عہدیدار ہوں یا سرکاری ملازمین سب بچے سرکاری سکولوں میں جاتے ہیں۔ جس دن پاکستان کے ارباب اختیار اور بیوروکریسی کے بچے سرکاری سکولوں میں جانا شروع کردیں گے ملک کا ترقی کے طرف سفر شروع ہوجائے گا۔ قومیں علم کی بدولت ہی ترقی کرتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا کہ تعلیم و افکار سے نئے جہاں پیدا ہوتے ہیں نہ کہ سنگ وخشت اور بڑی تعمیرات کرنے سے۔ سیکھنا ہے تو اقوام یورپ سے یہ سیکھو

۔ ممکن ہے یہ نالہ وفریاد کسی پر اثر کرے اور وہ کم از کم اپنے دائرہ اختیار میں جو بہتری لاسکتا ہو لے آئے اور بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو۔ قوموں کی بہتری کا سفر ایسے ہی شروع ہوتا ہے کیونکہ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ۔

اقبال اور داگ ھمار شولد

مشرق اور مغرب کے فلسفیوں کے خیالات اور نظریات میں جہاں کئی اختلافات ہیں وہاں بہت سے مشترکہ تصورات بھی موجود ہیں ۔ علامہ اقبال نے خود اپنا موازنہ مغرب کے مشہور فلسفی گوئٹے کے ساتھ کیا ہے۔ کائنات اور انسان کے بارے میں مغرب و مشرق کے ان دو عظیم فلسفیوں میں بہت سی مشترکہ قدریں موجود ہیں۔
گوئٹے اور اپنا موازنہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں

ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام او برہنہ، من ہنوز اندر نیام

کوپن ہیگن میں مقیم اقبال اکیڈمی اسکینڈے نیویا کے چیئرمین غلام صابر نے ڈنمارک کے معروف فسلفی سورن کیپر کگور اور علامہ قبال کا بہت عملی انداز سے موازنہ اپنی میں کیا ہے۔ علامہ اقبال کے نظریات اور "Kierkegaard and Iqbal" کتاب یورپی فلفسیوں کے ان خیالات و نظریات میں ہم آہنگی اور ان کا تحقیقی مطالعہ بہت دلچسپی کا حامل ہے۔ اسی جستجو میں میری کوشش تھی کہ علامہ اقبال اور کسی سویڈش شخصیت کے نظریات میں ہم آہنگی تلاش کی جائے۔ یہ رہنمائی سویڈن میں پاکستان کے سفیر جناب طارق ضمیر نے یوم پاکستان کی تقریب

میں علامہ اقبال اور سویڈن کے رہنماء داگ ھمار شولد (Dag HammarskjÖld) کے نظریات میں مطابقت پیش کرتے ہوئے کی۔ یوم پاکستان کی اس تقریب میں سویڈن میں موجود دنیا بھر کے سفارتی نمائندے اور اہم سویڈش شخصیات موجود تھیں۔ سفیر پاکستان جناب طارق ضمیر بھی ہماری طرح اقبالی ہیں اور جب انہوں نے داگ ھمار شولد اور علامہ اقبال کے مشترکہ نظریات کے کچھ حوالے پیش کئے تو جستجو ہوئی کہ داگ ھمار شولد کے پیغام کو مزید سمجھا جائے۔ان کی ڈائری جو بعد ازاں ایک کتاب کے نام سے Vägmärken شائع ہوئی جو سویڈش زبان میں Markings بعنوان دستیاب ہے اور یہ اُن کی واحد کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے جو نظریات اور خیالات پیش کئے ہیں اُن میں سے بہت سے علامہ قبال کے نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں۔شائد ان تک کسی صورت میں پیغام اقبال پہنچا ہو کیونکہ داگ ھمار شولد کی پیدائش ۱۹۰۵ء کی ہے یعنی جب وہ زمانہ طالب علمی میں ہوں گے تو ممکن انہوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہو اس لیے اس پر تفصیلی تحقیق کی ضرورت ہے۔

داگ ھمار شولد سویڈن کے اہم رہنما، ماہر اقتصادیات اور سفارت کار تھے۔ وہ اقوام متحدہ کے دوسرے سیکریٹری جنرل تھے جو ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۱ء اس عہدے پر اپنی وفات تک فائیز رہے۔ انہیں ۱۹۶۱ء میں ان کی وفات کے بعد امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ جب وہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل تھے تو اُن کے دور میں

مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کا ایک اہم زیر بحث مسئلہ تھا۔ انہوں نے اس مسئلہ کے لیے اقوام متحدہ کی جانب سے ایڈمرل نمٹز کو ناظم استصواب رائے بھی مقرر کیا تاکہ ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام اپنی مرضی سے آزدانہ رائے شماری سے کر سکیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بھارت کی ہٹ دھرمی اور حکومت پاکستان کی ناقص سفارتی حکمت علمی سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور اقبال کا وطن آج بھی صبح آزادی کا منتظر ہے اور مجبور و محکوم و فقیر ہے۔ داگ ھمار شولد کو دنیا کی بہت سی جامعات نے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا جبکہ مختلف ممالک میں بہت سی اہم عمارتیں اور سڑکوں کے نام بھی اُن سے موسوم ہیں۔ کئی ممالک نے ان کے نام کی یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیے اور خود ان کے اپنے ملک سویڈن میں حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کے سب سے بڑے کرنسی نوٹ یعنی ایک ہزار کرونا پر ان کی تصویر ہوگی۔ یہ وہ خراج عقیدت ہے جو انہیں آج بھی پیش کیا جارہا ہے۔ امریکی صدر جان ایف کینڈی نے اُن کی خدمات کا یوں قرار دیا۔ Statesman اعتراف کیا کہ انہیں اس صدی کا سب سے بڑا

علامہ اقبال نے خودی، عظمت انسان، عزت نفس، اخوت اور بھائی چارے کا جو درس دیا اس کا عکس ہمیں داگ ھمار شولد کی تحریروں میں ملتا ہے۔ جب سویت یونین نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے عہدہ سے مستعفی ہوجائیں تو انہوں نے اس دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ایک

بڑی طاقت کی خواہش کے آگے جھکنا بہت آسان ہے مگر حرف انکار کہنا اور بات ہے۔ دنیا کی وہ اقوام جو تنظیم کی بہتری اور دنیا کے تحفظ کے لیے سرگرم ہیں اگر وہ مجھ سے مطالبہ کریں تو میں ایسا ضرور کرتا۔علامہ اقبال اور داگ ھمار شولد نے منکرین حق کو نقطہ توحید بڑے بین دلائل کے ساتھ سمجھایا ہے۔ وحدانیت اور تلاش حق کی بابت انہوں نے بہت خوبصورت لکھا ہے کہ میں ترجیح دوں گا کہ میں خدا پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی گذاروں بے شک مرنے کے بعد یہ پتہ چل بھی جائے کہ خدا تو تھا ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ کہ میں کہ خدا کا منکر رہ کر زندگی بسر کروں اور مرنے کے بعد مجھے خدا کا سامنا کرنا پڑے۔ دنیا ایک اور بڑے ریاضی دان نے خدا کے موجود ہونے کی کچھ ایسی ہی دلیل دی ہے اور علامہ اقبال نے بھی خوب کہا کہ

بیاں میں نقطہ توحید تو آ سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

داگ ھمار شولد بھی اپنی تحریوں میں عمل اور جدوجہد کا جذبہ محرکہ پیدا کرتے ہیں تاکہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا ترقی کی منازل طے کرے۔ یہی پیغام ہمیں حکیم الامت کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے۔ مشرق و مغرب کے ان دونوں عظیم فلاسفیوں پر تحقیقی کام کرنے کی ضروت ہے اور ممکن ہے کہ یہ کالم اس بڑے کام کا آغاز ہو۔

اسلام اور نفاذ شریعت کا مطالبہ حصہ اول

ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام خدا کی طرف سے آخری دین اور مکمل دین ہے جو انسانیت کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور آج کی سسکتی ہوئی انسانیت کو امن اور سکون کی دولت عطا کرتے ہوئے دنیاوی کامیابی کے ساتھ اخروی نجات کا باعث بن سکتا ہے لیکن ایک عام مسلمان کے لیے بعض اوقات بڑی مشکل صورت حال ہوتی ہے جب ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اسلام میں جائیز ہے جبکہ دوسری یہ آواز آتی ہے کہ یہ اسلام میں جائیز نہیں، یہ حرام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس کو حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ یہ اسلام میں یہ جائیز ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ یہ شریعت کے عین مطابق ہے یا یہ شریعت کے منافی ۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طے کرنا کس کی اتھارٹی ہے کہ یہ شریعت ہے یا یہ شریعت نہیں۔ دین اسلام میں اتھارٹی کس کی ہے یا بصورت دیگر اسلام ہے کیا؟ غیر مسلم تو ایک طرف خود مسلمانوں کے سامنے بھی دین کا واضع تصور نہیں ہوتا۔ ایک عام مسلمان یہ ضرور جاننا چاہتا ہے کہ اسلام کا آئین، قانون اور دستور کون سا ہے جس سے انحراف اور اختلاف ممکن نہ ہو۔ اور جب کبھی بھی کوئی بات سامنے آئے اُسے پرکھنے کے لیے ایک واضع حقیقت کیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دین اسلام کا ماخذ اور منبع کیا ہے اور وہ کون سا ضابطہ حیات ہے جس کی رہنمائی میں ہمیں سفر

زندگی طے کرنا چاہیے۔ دین کیا ہے؟ اسی طرح اگر ایک غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر ایمان لاتے ہوئے مسلمان ہو جاتا ہے تو اُسے اپنی زندگی کو اسلام کے مطابق بسر کرنے کے لیے کس دستور العمل کی ضرورت ہوگی۔ یہ وہ سوالات ہیں جو اکثر ذہن میں گردش کرتے ہیں۔ اسلام عربی زبان کا لفظ ہے جو س ل م سے نکلا ہے کس کے معنی سلامتی ،اطاعت کرنا، سر تعلیم خم کرنا، ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہونا، اعتدا یوں کی Definition ل اور توازن کی راہ اختیار کرنا ہے۔ دین اسلام کی کی تعریف - جا سکتی ہے

اسلام اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف خدا کا بھیجا ہوا دین یعنی ” نظام زندگی ہے جس کا آئین قرآن حکیم ہے، اُس پر مکمل ایمان اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اسلام ہے“ یا دوسرے الفاظ میں ” اسلام مسلمانوں کا دین یا نظام زندگی ہے جس میں اللہ کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اس کی حاکمیت اعلیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری نبی ماننا۔ اسلام کا آئین قرآن ہے ، اس پر مکمل ایمان اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اسلام ہے“

اسلام وہ دین یا نظام حیات ہے جس میں حضور ختم المرسلین ﷺ کی وساطت سے انسانیت کے نام خدا کے آخری پیغام یعنی قرآن مجید کی روشنی میں زندگی بسر کی جائے۔ اُس وحی خداوندی کی روشنی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہوئے

انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لایا جائے۔اُس ضابطہ حیات پر کامل ایمان لاتے ہوئے قوانینِ خداوندی کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرنے کا نام اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے جو نظام اور قانون دیا ہے اس کا نام اسلام ہے۔ اس نظام زندگی کی رہنمائی انبیا اکرام کی صورت میں جاری رہی اور حضور پاکؐ پر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ جس کا اس دین پر دل و دماغ کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ غیر متزلزل ایمان ہو وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ قرآن حکیم کو اسلام میں سپریم اتھارٹی حاصل ہے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے رہنما اصولوں کے مطابق عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ یہی کتاب جائز یا ناجائز کا فیصلہ کرتی ہے اور ایک مسلمان کی آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہے۔ اسوہ حسنہ یعنی پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ بہترین نمونہ ہے۔ قرآن حکیم کے بعد رسول اکرامؐ کی صحیح احادیث رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ سنت خیر الانام ایک مسلمان کے لیے زندگی گذارنے کے لیے بہترین راستہ ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح محض چند رسمی عبادات کا مجموعہ نہیں جس کا مقصد صرف اُخروی نجات ہو بلکہ یہ ایک دین یعنی نظام زندگی ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل دین کو مکمل کر کے گئے تھے۔ اسلام کے پانچ ارکان ہیں ۔ پہلا رکن شہادت ہے یعنی اس بات کی شہادت دل و دماغ کے مکمل اطمینان کے ساتھ دینا کہ اللہ ایک ہے، حضرت محمد ﷺ اُس کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام

نبیوں پر ایمان لانا، اُس کی نازل کردہ تمام آسمانی کتابوں پر ایمان، اللہ کے فرشتوں پر ایمان، حیات آخرت اور روز جزا پر ایمان لانا لازم ہے۔ دیگر چار ارکان اسلام میں صلوٰۃ نماز)، روزہ، زکوۃ اور حج شامل ہیں۔)

دین ہمارے دنیاوی معاملات کو سنوارنے کے لیے آتا ہے جس سے دنیا میں فلاح اور آخرت میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر رسول اکرم ﷺ نے ایک بے مثال اسلامی معاشرہ متشکل کیا جس کا تسلسل خلفاء راشدین کے دور بھی رہا۔ اُس معاشرہ میں نہ کوئی سرمایہ داری کا تصور تھا، نہ رہبانیت کا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا۔ نہ ہی اُس میں مذہبی جبر اور تشدد تھا اور نہ ہی کسی لیے امتیازی قوانین تھے۔ نہ ہی کوئی کسی پر جبراً شریعت نافذ کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی فتویٰ دینے مجاز تھا۔ یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لیے پسند کیا تھا۔ اور ہم آج بھی پھر وہی نظام دہرا سکتے ہیں اگر بالکل اسی طریقہ کار کو اپناتے ہوئے اُسی ضابطہ حیات کو اپنا لیں اور اس کی روشنی میں اپنے لیے طریقہ کار وضع کریں۔ خوش قسمتی سے خدا کی آخری کتاب ہمارے پاس مکمل اور اصل حالت میں موجود ہے اب یہ ہم پر کہ ہم اُس سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ کتاب جو سمجھنے میں آسان اور جس کے احکام آج بھی قابل عمل ہیں جس بارے میں اُس کے مصنف نے سورہ القمر میں چار بار واضح طور پر اعلان کر دیا کہ یہ آسان کتاب ہے تاکہ کوئی کل کو یہ نہ کہے کہ یہ

کتاب مشکل ہے، اسے سمجھنا آسان نہیں یا اس کے سمجھنے کے لیے پہلے بہت سے علوم کا جاننا ضروری ہے یا پھر یہ کہ اس کے سمجھنے کے لیے کسی مزید گائیڈ کی ضرورت ہے۔ ہر گز نہیں بلکہ واضع طور پر اعلان کردیا کہ ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کردیا ہے تو کوئی ہے سچے سمجھے ((17/54، 22، 32، 40۔ قرآن حکیم کو سمجھنے کا اصول اور طریقہ بھی خود قرآن نے بتادیا ہے کہ تصریف آیات یعنی کسی ایک موضوع کے بارے میں تمام آیات کو پڑھاااور سمجھا جائے۔ مضامین کے اعتبار سے قرآن فہمی کے لیے بہت سی کتب دستیاب ہیں جن سے عام آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔قرآن اپنی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے،آیات متشبہات اور آیات محکمات۔

متشبہات کی آیات کائنات اور دیگر حقیقتوں کے بارے میں ہیں جس کی مختلف انداز میں تشریح ممکن ہے اور جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا چلا جاتا ہے اُن کی آیات کے سمجھنے میں وسعت آتی جاتی ہے۔ مگر آیات محکمات کا مفہوم روز اول سے ایک ہی ہے اور وہ احکامات کی آیات ہیں جن میں واضع طور پر کہا گیا ہے کہ یہ کام کرو یا نہ کرو۔ قرآن مجید انہیں اصل کتاب قرار دیتا ہے اور ایک عام مسلمان کے لیے ضروری یہی ہے کہ وہ ان آیات جو تقریباً آٹھ سو کے قریب ہیں یعنی قرآن کا آٹھواں حصہ، ان کی روشنی میں اپنی زندگی کی گاڑی کو رواں رکھے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کتاب عظیم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم یہ نہ کریں گے تو روز قیامت حضورؐ ہماری خدا سے شکائیت کریں گے کہ میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا

جیسا کہ سورہ فرقان کی آیت تیس میں ہے۔قرآن سے رہنمائی اہل عقل لیتے ہیں۔قرآن اور عقل کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے آنکھوں اور روشنی کا ہے۔ قرآن بار بار غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ایک بڑی حیران کن حقیقت ہے کہ قرآن میں جنہیں ہم عمومی طور پر عبادات کہتے ہیں اُن کے بارے دو فی صد سے بھی کم آیات ہیں جبکہ کائنات کے غور وفکر کے بارے میں گیارہ فی صد سے زیادہ آیات ہیں۔ قرآن ہی سے ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین ہوتی ہیں اور یہی ایک سپریم اتھارٹی ہے۔اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فیصلہ دے دیا کہ جو قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں (5/44)۔ (جاری)

اسلام اور نفاذ شریعت کا مطالبہ حصہ دوم

قرآن کے بعد حدیث نبویؑ کو اہمیت حاصل ہے اور صحیح احادیث رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ سنت خیر الانامؐ ہر مسلمان کے لیے مشعل راہ ہے۔ جب تک حضورؐ سے بے پناہ محبت نہ ہو وکوئی مومن ہی نہیں ہو سکتا۔ محبت کا یہ تقاضا ہے کہ آپؐ کے اسوہ حسنہ سے روشنی حاصل کرکے زندگی بسر کی جائے۔ قرآن میں جب یہ کہا گیا ہے کہ رسول پاکؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضورؐ کا ہر عمل قرآن کے مطابق تھا۔ قرآن مجید میں کم از کم تیرہ مختلف مقامات پر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضورؐ خود وحی یعنی قرآن مجید کی پیروی کرتے تھے اس لیے اگر ہم بھی قرآن مجید کی پیروی کریں تو حضور پاکؐ کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں۔ سورہ مائدہ کی تیسری آیت جو کہ آخری وحی تھی وضاحت کردی کہ آج دین کو مکمل کردیا گیا ہے۔ پھر حضورؐ نے اپنی زبان مبارک سے اپنے آخری خطبہ میں امت پر اسی حقیقت کو واضح کردیا۔ چونکہ آپؐ پر نبوت کو سلسلہ ختم ہوگیا اس لیے قرآن انسانیت کے نام خدا کا آخری پیغام ہے۔

اسلامیان ہند کے عظیم رہنماء قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے اسلام کا تعارف

اور وضاحت بہت ہی مختصر مگر جامع انداز میں کی جو شائد کسی بڑے سے بڑے عالم نے بھی نہ کی ہو۔ انہوں نے کہا کہ اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہء زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا، ان سب کے لیے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لیے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن حکیم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ اسلامی حکومت کی کا تصور واضع کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے کہا کہ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاََ نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اسلام میں اقتدار اعلیٰ اور قانون سازی کو حق صرف خدائے بزرگ و برتر کا حاصل ہے۔ ختم نبوت کے بعد اب کسی بھی اور رسول یا نبی کی آمد ممکن نہیں۔ خدا نے جو کچھ کہنا تھا وہ سب کہہ دیا اور وہ سب قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس میں دیئے ہوئے اصول و ضوابط مستقل نوعیت کے ہیں مگر قرآن وہ طریقے اور تفصیلات خود متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام کی شکل دی جاتی ہے۔ یہ طریقے حالات کے تقاضوں کے مطابق ہر دور کی ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ یہ جزئی احکامات By Laws امت مسلمہ اپنے لیے قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کرتی ہے جنھیں شریعت کہا جاتا ہے۔ اصول شریعت میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مگر احکام شریعت میں اجتہاد کے ذریعہ تغیر و تبدل ممکن ہے۔ مختلف زمانے میں جو شریعت کے احکام یا فقہ کی رو سے مسائل کا حل پیش کیا گیا اگر تو وہ ہمارے دور کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ قابل عمل ہے بصورت دیگر اُن پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے کیونکہ اُن کی حیثیت الہامی نہیں ہے۔ بنو عباس اور دوسرے ادوار میں وضع کیے گئے فقہی احکام ایسے شرعی احکام نہیں کہ اُن پر دور جدید کے تقاضوں کے مطابق نظر ثانی نہ کی جا سکے اور نہ وہ قرآنی احکامات کی طرح مقدس ہیں۔ اسلامی نظام کے سمجھنے میں جو الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں اور عام لوگوں نے بھی ان طریقوں کو جو کسی زمانے میں، اس وقت کی ضرورت کے مطابق بنائے گئے تھے قرآنی قوانین کی طرح مستقل اور غیر متبدل ،

سمجھ لیا ہے۔ وہ وضع کردہ قوانین اس زمانے کے اگر تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہمیں ان کے نفاذ پر زور دینے کی بجائے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے نئے قوانین وضع کر لینے چاہیے۔ لیکن جب انہی قوانین کو شریعت کا نام دے کر نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو آج کے ضروریات کو حل نہیں کر سکتے تو اسلام کے متعلق یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام دور حاضر کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا یہی وہ ایک اہم حقیقت ہے جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط تصور پرورش پاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی متعین کردہ حدود میں کوئی بھی کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ ایک عام مسلمان کے لیے روزمرہ کے عام مسائل کے لیے فقہا کی جانب سے کی گئی تشریح رہنمائی کرتی ہے اور اس سے ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دور جدید کے نے نئے مسائل کا حل کسی ایک فقہ میں نہیں بلکہ اس کے لیے ایک فقہی پیراڈائم سے نکل کر دوسرے فقہی پیراڈائم میں داخل ہونے کی ضرورت ہے۔ اس طرح بہت آسانی سے کئی مسائل کا حل نکل سکتا ہے اور جو رہ جائیں ان کا حل اجتہاد کی روشنی میں تلاش کیا جا سکتا ہے جو دور حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ایک غیر مسلم اسلام قبول کر لے اور پھر یہ سوال کرے کہ مجھے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ضابطہ حیات دے دیں جس کی روشنی میں اپنا سفر زندگی طے کروں۔ تو اُسے قرآن حکیم دیا

جائے کہ اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے تم ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکتے ہو۔ دین کا مطالبہ یہی ہے کہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے شب و روز بسر کرو۔خلاصہ کلام یہ کہ قرآن حکیم کی سپریم اتھارٹی کے تابع عقل، اسوہ حسنہؐ اور عشق مصطفےٰ ﷺ کی روشنی میں سفر زندگی طے کرنا ہی اسلام پر کاربند ہونا ہے۔ حضورؐ کی وساطت سے ملنے والا خدا کا آخری پیغام ہی ہمارا دستورالعمل اور رہنما ہے بقول علامہ اقبالؒ

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است وقدیم
نوع انساں را پیام آخریں حاصل او رحمۃ اللعالمینؐ

ضرورت اس امر کہ ہے ہم اس کتاب عظیم سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے اپنی زندگی کے تمام سائل کے لیے رہنمائی حاصل کریں اور اس کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کریں۔ ہمارے سامنے اس کے روشن اصول ہمیشہ رہنے چاہیے اور ہمارا اس سے تعلق کبھی بھی منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ
تجھے کتاب سے فراغ نہیں ممکن کہ تو قرآن خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں

مستقبل سکول سے شروع ہوتا ہے

پاکستان کے نظام تعلیم کے بارے میں اکثر گفتگو اور میڈیا میں اظہار خیال ہوتا رہتا ہے۔ تعلیمی مسائل اور کارکردگی کے بارے ماہرین سے لے کر عام آدمی تک سب اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو دنیاکے دیگر ممالک میں جانے اور وہاں تعلیم وتدریس کا موقع ملا ہو، وہ تقابلی جائزہ لے کر نظام تعلیم کی اصلاح کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ پاکستان کے نظام تعلیم کا بنیادی مسئلہ تدریسی نظام کی بنیاد یعنی سکول سسٹم کی خرابی ہے۔ سویڈن جو کہ اعلیٰ تعلیم میں دنیا میں نمایاں مقام رکھتا ہے اور اس کی تین جامعات دنیا کی ایک سو بہترین یونیوسٹیوں میں شامل ہے۔ طب، انجنیئرنگ اور دوسرے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے دنیا بھر سے طالب علم یہاں کا رخ کرتے ہیں لیکن یہ پھر بھی یہ اپنے سکولوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دے رہا ہے اور موجودہ حکومت نے سکولوں کے لیے ایک خطیر اضافی رقم مختص کی ہے۔ سویڈش وزیراعظم نے اس مقصد کے لیے ایک قومی پلان دیا ہے کہ ملک کا مستقبل سکول سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان اور سویڈن دونوں کے تعلیم اداروں سے تحصیل علم کا موقع ملا ہے اور میرے خیال میں بھی پاکستان میں سکول کے نظام تعلیم کو بہت بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ جن بچوں کی سکول سے بنیاد مضبوط ہو گی انہیں اعلیٰ تعلیم کے میدان

میں مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔

اس وقت سویڈن کے ہمسایہ ملک فن لینڈ کا سکول سسٹم دنیا بھر میں بہترین قرار دیا گیا ہے۔ سویڈن اور فن لینڈ کا سکولوں کا نظام تعلیم تقریبا ایک جیسا ہے۔ یہاں بچے سات سال کی عمر میں سکول شروع کرتے ہیں۔ نظام تعلم کی سو فی صد ذمہ داری حکومت پر ہے اور نجی سکول بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی حکومتی سرپرستی اور مالی امداد پر ہیں اس لیے سرکاری اور نجی سکولوں میں کوئی خاص فرق نہیں بلکہ عوام کی غالب اکثریت سرکاری سکولوں کو ترجیح دیتی ہے۔ بچوں کو کتابیں، کاپیاں، پنسلیں اور دوسری تمام چیزیں مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ سکولوں میں بچوں کو دوپہر کا کھانا مفت ملتا ہے۔ نہ بچوں پر غیر ضروری مضامین کا بوجھ نہیں لادا جاتا ہے اور نہ ہی انہیں چھٹیوں کا لکھنے کے لیے کام دیا جاتا ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خوب مزے کریں البتہ مطالعہ ضرور کریں۔ ہر بچے کی انفرادی جانچ پڑتال ہوتی ہے اور ہر سال نہ سالانہ امتحانات ہوتے ہیں اور ہی اول دوم سوم آنے والوں کا اعلان ہوتا ہے۔ تعلیم میدان میں کمزور بچوں کو سکول کی جانب سے مفت ٹیوشن پڑھائی جاتی ہے۔ہر جماعت اور مضمون کے لیے محکمہ تعلیم نے ایک نصاب بنایا ہوا ہے جس پر سکول عمل کرتے ہیں۔ ملک میں ایک ہی طرح کے سکول ہیں اور محمود وایاز کے بچے ایک ہی صف میں بیٹھے علم حاصل کرتے ہیں۔

اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں

اور معاشرہ میں قابل عزت مقام کے حامل ہیں۔ اساتذہ کی تعلیم و ترقی کے لیے بھی ایک منصوبہ ہوتا ہے تاکہ وہ مزید موثر انداز میں بچوں کو پڑھا سکیں۔

پاکستان اور سویڈن کے سکول کے نظام تعلیم میں جو سب سے بڑا فرق مجھے نظر آیا ہے وہ یہ کہ سویڈن میں بچوں کی تخلیقی صلاحتیں اجگر کی جاتی ہیں۔ کسی بچے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا، اُس کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا ہے اور اس کی شخصیت کو مزید نشوونما دی جاتی ہے۔ انہیں سوچنے سمجھنے اور معلومات حاصل کرکے انہیں اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا انداز اپنایا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں اس کے برعکس ہے اور بچوں کو رٹا لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ سویڈن بلکہ پوری دنیا میں ذریعہ تعلیم مقامی زبان ہے لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہے جس وجہ سے بچے ساری عمر مشکل میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہاں سویڈن میں تارکین وطن کے بچوں کو حکومت کی طرف سے ان کی مادری زبان سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور تاکید کی جاتی ہے کہ بچوں کے ساتھ گھروں میں مادری زبان میں ہی بات کریں تاکہ ان کی صلاحتیں بہتر نشوونما پاسکیں اور اس طرح وہ دوسری زبانیں اور علوم بہتر سیکھ سکیں گے۔ انگریزی دوسری اور پانچویں جماعت سے کوئی ایک یورپی زبان پڑھائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانچ سال بعد بچہ متعلقہ یورپی زبان میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ بات چیت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے مگر سوچنے کا مقام ہے کہ پاکستان میں بچے پانچ

سال سکول میں عربی پڑھتے ہیں لیکن وہ میٹرک کے بعد عربی کے پانچ جملے بھی نہیں بول سکتے۔ کیوں؟ چلیں عربی کو ایک طرف رہنے دیں انگریزی جو کہ اب ہمارے سکولوں کا ذریعہ تعلیم بن چکا ہے اور دس سال تک بچوں کو اسی میں تعلیم دی جاتی ہے مگر میٹرک کے بعد بھی طالب علم کیوں انگریزی میں اعتماد کے ساتھ بات نہیں کر سکتے جو یہاں کے طالب علم کر سکتے ہیں۔ اگر کسی بچے کو کہا جائے کہ کسی موضوع پر دو صفحات لکھو تو یہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوگا۔ وجہ ناقص نظام تعلیم اور رٹا لگانے پر زور ہے کیونکہ جو رٹا لگالے اچھے نمبر حاصل کرلے گا۔ سویڈن سے ہمارے ایک دوست نے اپنے بچوں کو پاکستان منتقل کردیا اور وہاں ایک نجی تعلیم ادارے میں داخل کروایا جو پاکستان میں بہترین تصور کیا جاتا ہے لیکن بچوں نے چند ہی ماہ بعد وہاں کے نظام تعلیم سے بے زاری کا اظہار کردیااور واپس سویڈن چلے آئے۔ میرے پوچھنے پر بچوں نے بتایا کہ وہاں رٹا لگاکر جواب نہ دیا جائے تو استاد فیل کردیتے ہیں اور اگر اپنے الفاظ میں کوئی جواب دیا جائے تو کہتے ہیں کہ تم قائد اعظم بننے کی کوشش نہ کرو۔ وہاں بڑی فیس لینے والے نجی سکولوں میں بھی انگریزی اردو میڈیم میں پڑھائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ کہ بچوں کو نہ اردو میڈیم رہا نہ انگریزی بلکہ دونوں زبانوں کا ملغوبہ بن گیا ہے۔

پاکستان نے اگر ترقی کرنی ہے تو سکول کے سسٹم کو بہتر کرنا ہوگا۔ اعلیٰ

تعلیم یافتہ استاد جنہیں اچھی تنخواہ دی جائیں اور بچوں کو تعلیمی سہولتیں دینا ہوں گی۔ رٹا لگانے کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی اور بچوں کو اپنے الفاظ میں جواب دینے کی تربیت دی جائے۔ ذریعہ تعلیم مقامی زبان ہونا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر پورے ملک میں ایک طرح کا نظام تعلم اور ایک جیسے سکول ہوں جن میں بالا دست طبقہ اور عام عوام کے بچے ایک ساتھ حصول تعلیم میں مصروف ہوں۔ جب تک اس طرف نہیں سوچا جائے گا ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔ قوموں کی ترقی تعلیم سے ہوتی ہے عمارتیں کھڑی کرنے سے نہیں۔ شائد ارباب اختیار اس حقیقت کو سمجھ لیں۔

مسئلہ کشمیر کے حل میں سب بڑی رکاوٹ

کشمیری عوام اپنی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھے ہوئے اور اکثر و بیشتر مسئلہ کشمیر کے حوالے سے گفتگو اور بحث میں اُن عوامل کا ذکر کیا جاتا ہے جو مسئلہ کشمیر کی آزادی میں رکاوٹ ہیں۔ کشمیری عوام خود بھی جاننا چاہتے ہیں چھ دہائیوں سے زائد وقت گذر جانے کے باوجود کیوں آج بھی کشمیر چاراور کشمیری پانچ حصوں میں منقسم ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کیوں تاج آزادی نہ پہن سکی اس کی مختلف وجوہات اور عوامل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کوئی اس کی وجہ بھارتی ہٹ دھرمی اور جبر کو قرار دیتا ہے تو کوئی اقوام متحدہ اور عالمی ضمیر کی بے حسی۔ کوئی اسی حکومت پاکستان کی ناقص سفارتی حکمت عملی اور کوئی بین الاقوامی حالات کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن آزادی کشمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ کشمیری قیادت اور خود کشمیری اس کے ذمہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اندھیرے کو کوسنے کی بجائے اپنے چراغ کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تقسیم ہندوستان اور مسئلہ کشمیر کے آغاز سے دور حاضر تک کشمیری قیادت کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کشمیر کی غلامی کی سب سے بڑی وجہ وہ کشمیری رہنماء ہیں جو منظر عام پر رہے اور جن کی نااہلیوں کا خمیازہ آج بھی کشمیری عوام بھگت رہے ہیں۔

.بر صغیر کی تقسیم کے بعد حد متارکہ کے اس طرف چونکہ صرف مسلم کانفرس ہی کشمیری عوام کی نمائندہ سیاسی جماعت تھی اس لیے ذمہ داری بھی.براہ راست اسی جماعت پر عائد ہوتی ہے۔آزاد جموں کشمیر کا قیام آزادی کے بیس کیمپ کی حیثیت سے عمل میں لایا گیا لیکن اسے آزادی کا بیس کیمپ بنانے کی بجائے اسے اقتدار کی شرمناک کشمکش کا میدان بنا دیا گیا۔ مسلم کانفرس کے قائدین وزارت امور کشمیر سے وظائف کھانے لگے۔ جنہیں حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنا تھی وہ پلاٹوں، کوٹھیوں اور پرمٹوں کی الاٹمنٹ کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اصلی اور جائیز مسلم کانفرس کا تصدیقی سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے کے لیے وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکریٹری کی چاپلوسی شروع ہو گئی۔ چوہدری غلام عباس اور سرادر ابراہیم ایک دوسرے کو نیچا دکھانے لگے اور پھر سرادر عبدالقیوم بھی میدان میں کود گئے۔ وزارت امور کشمیر جس پر ہاتھ رکھتی وہی اصل مسلم کانفرس قرار پاتی۔ سری نگر اور جموں کی آزادی کا عزم رکھنے والے قائدین مظفر آباد کی بے اختیار کرسی کے حصول کے لیے دست و پا ہونے لگے۔ اب حالات میں کشمیری قوم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگی۔ جس کو جو ملا جہاں سے ملا سب سمیٹنے لگے۔ مقبوضہ کشمیر کی قیادت بھی بھارتی تسلط کے تحت وہاں کے اقتدار کے لیے آپس میں ویسے ہی لڑنے لگے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ جس کا خمیازہ ٦٧ سال گذر جانے کے بعد نہ صرف کشمیری عوام بلکہ.برصغیر کے لوگ بھی بھگت رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے یہی سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ریاست کے تینوں حصوں میں متحرک سیاسی رہنماؤں کا واحد مقصد صرف صرف اقتدار کا حصول ہے چاہے یہ اقتدار انہیں کسی کے ذریعہ بھی ملے۔ماسوائے چند ایک کے آزاد کشمیر کے بیشتر رہنماؤں نے حصول اقتدار کے لیے متعدد بار اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیلیاں اور کئی نے تو ایک ہی جماعت میں ایک سے زائد بار شمولیت اور اخراج کیا۔آج بھی آزاد کشمیر میں کوئی نظریاتی سیاسی جماعت فعال نہیں رہی بس وہ رہ گئی ہیں جنھیں ہر قیمت پر صرف اقتدار ملنا چاہیے۔آزاد کشمیر کی کوئی بھی سیاسی جماعت بدلتے ہوئے عالمی اور خطہ کے حالات کے پیش نظر کوئی بھی منصوبہ یا حکمت عملی پیش نہ کرسکے۔آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں میں اس پر اتفاق ہے کہ محض بیان بازی پر اکتفا کیا جائے۔ جہاں کشمیری لیڈر شپ میں مفادات کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے تو وہاں کشمیری عوام بھی اس میں شامل ہیں۔ وہ اپنے ان سیاسی رہنماؤں کی خوشامند اور آؤ بھگت میں لگے ہوئے اور جو مفاد مل سکتا ہے وہ لے رہے ہیں۔کیا حصول آزادی میں مصروف اقوام ایسا کرتی ہیں۔ یوکے اور یورپ میں مقیم کشمیری عوام کو ہی دیکھیں وہ اپنے انہی رہنماؤں کے استقبال، خیر مقدم اور جلسوں کی رونق بنتے ہیں۔ وہ اپنے رہنماؤں سے یہ نہیں پوچھتے کہ انہوں نے آزادی کشمیر کے لیے کیا عملی اقدامات کیے ہیں اس کی بجائے وہ انہیں دعوتیں اور نذرانے دیتے ہیں۔
چارج شیٹ طویل بھی ہوسکتی ہے لیکن باشعور

کشمیری اس سے اتفاق کریں گے کہ آزادی کی راہ میں ہمارے رہنماء ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور جب تک یہ ڈرائیونگ سیٹ پر رہیں گے تو آزادی کی منزل دور ہوتی جائے گی۔ کشمیری عوام کو اپنی قیادت کا احتساب کریں اور ایسے رہنماؤں کو مسترد کردیں جن کا مطمۂ نظر اقتدار ہے آزادی نہیں۔

بنا محنت دعا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں

کراچی میں سخت گرمی کے موسم میں پانی کے شدید بحران کو حل کرنے کے لیے حکومت وقت نے بہت آسان حل تلاش کرتے ہوئے سندھ اسمبلی میں دعائیں کیں۔ اس پر مجھے ظفراللہ جمالی یاد آگئے جب وہ وزیراعظم تھے تو کسی نے اُس سے سوال کیا کہ ملک میں بدعنوانی بہت بڑھ گئی اور اس کرپشن کو روکنے کے لیے آپ کی حکومت کیا اقدامات کررہی ہے تو انہوں جواب دیا کہ کرپشن تو اللہ تعالی ہی ختم کرسکتا ہے لہٰذا دعا کریں کہ خدا کرپشن کو ختم کردے۔ کیا خوب انداز حکومت ہے اور کیا اچھا طریق ہے کہ اپنی ذمہ داری اللہ تعالی پر ڈال دی جائے اور یہی کیا سندھ حکومت نے۔ پانی کے بحران میں بدانتظامی، منصوبہ بندی، ٹینکر مافیا کی کارستانیوں اور اس میں ملوث افراد کے خلاف کاروائی کرنے کی بجائے دعاؤں سے کام چلانے کا آسان نسخہ استعمال کیا۔ عوام کے سامنے اپنی گلوخلاصی کراتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ ہم نے تو اسمبلی میں دعا کروادی ہے اب یہ اللہ قبول کرلے گا تو مسئلہ حل ہوجائے گا۔ اس آسان نسخہ سے ملک کے تمام مسائل بڑی آسانی سے حل کیے جاسکتے ہیں چاہے دہشت گردی کا مسئلہ ہو یا بے روزگاری کا۔ ملک سے جہالت دور کرنی ہو یا پولیو کا خاتمہ، سب کے لیے یہ نسخہ کارآمد ہے اور اسمبلی کا کام بھی آسان ہوجائے کہ قانون سازی کی بجائے دہاں دعائیں کی جائیں اور بعد میں اسمبلی

سالانہ کارکردگی رپورٹ شائع کی جائے کہ انہوں نے کتنی دعائیں کی ہیں۔ قوم کے ٹیکسوں پر عیاشی کرنے والے جن اراکین اسمبلی نے پانی کے بحران کے لیے دعاؤں کا راستہ اپنایا ہے انہیں عوام کی مشکلات کا کیا علم ہو۔ اگر ان کی خواتین اور بچے بھی ہاتھ میں برتن پکڑے پانی کی بوند بوند کے لیے تگ و دو کر رہے ہوں تو پھر انہیں علم ہو جائے گا کہ دعا کی ضرورت ہے یا دوا۔

ہم جن بہت سی اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیر و تشریح کرکے اپنی مرضی کا عمل کرتے دعا بھی انہی میں سے ایک ہے۔ دعا کا معنی مانگنا نہیں بلکہ پکارنا ہے اور قرآن حکیم میں ہے کہ جب بھی کوئی اللہ کو پکارتا ہے یعنی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ قابل غور ہے کہ خدا کی طرف سے ہماری پکار کا جواب دینا کیا ہے اور کیا کبھی کسی نے پکار کا جواب سُنا۔ اس کی وضاحت بھی کتاب عظیم میں کردی کہ جب کوئی دعا کرتا ہے یعنی پکارتا ہے تو اس کا جواب قرآن حکیم میں رہنمائی کی صورت میں موجود ہے۔ انسان جو رہنمائی اور مدد طلب کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے نام اپنے آخری پیغام میں دے دی ہے۔ یہ ہے پکار کا جواب۔ ساتھ ہی یہ اصول بھی دے دیا کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا۔ وہ انسان شنستا رام ہو، محمد دین یا ڈیوڈ، اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا مگر عمل کسی کا بھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ وہ قوانین و ضوابط اٹل ہیں، ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اور انہیں سنت اللہ

قرار دے کر واضح کردیا کہ تمہاری آرزو، پکار یا دعا وہی قبول ہوگی جو اُن قوانین کے مطابق ہوگی اور جو اُن قوانین سے متصادم ہوگی اس کی قبولیت بھی ممکن نہیں۔ خالق کائنات نے کشش ثقل کا قانون بنایا ہے جس کی رو سے زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور زمین کی اس کشش سے نکلنے کے لیے اس سے زیادہ قوت درکار ہوگی۔ یہ ایک اٹل اور غیر متبدل قانون ہے۔ اب اس قانون کے برعکس اگر ایک گیند کو ہوا میں اچھال دیں اور پوری دنیا کے مسلمان دعا کرنا شروع کردیں کہ یا اللہ یہ نیچے نہ آئے لیکن گیند نیچے ضرور آئے گا۔ اسی طرح اگر شنتا رام زراعت کے جدید اصولوں کو مد نظر رکھ اچھے بیج، کھاد اور بروقت پانی کا استعمال کرتا تو وہ اچھی فصل برداشت کرے گا جبکہ محمد دین یہ سب نہیں کرتا تو محض دعاؤں سے اچھی فصل کا حق دار نہیں ہوگا۔ بچپن میں ایک لطیفہ سنتے تھے کہ ایک طالب علم دعا کررہا ہوتا ہے کہ یا اللہ لاہور کو پاکستان کا دارالحکومت بنا دے۔ اُس کا باپ سُن کر پوچھتا ہے کہ یہ دعا کیوں کررہے ہو تو بیٹا جواب میں کہتا ہے کہ وہ امتحان میں لاہور کو پاکستان کا دارالحکومت لکھ آیا ہے۔ ایسی دعائیں کب پوری ہوسکتی ہیں۔

ہم نے قرآن حکیم کی تعلیمات اور اسوہ حسنہ سے دعا کا درست سمجھا ہی نہیں۔ غزوہ بدر اور دیگر غزوات کو ہی لیں، آپؐ نے اپنی پوری تیاری اور حکمت عملی کے بعد دعا کی، یہ نہیں مدینہ میں بیٹھ کر دعا کرتے رہے کہ یا اللہ کفار کو

نیست و نابود کر دے۔ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں جب ایک شخص بھیک مانگنے آیا تو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اسے کلہاڑا تیار کرکے دیا اور کہا کہ جاؤ لکڑیاں کاٹو اور اپنا گذارا کرو۔ آپؐ نے اُسے عمل کا درس دیا نہ کہ عملیات کا۔ دعا کی اہمیت مسلمہ ہے اور کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ دعا کی ہی نہ جائے بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنی پوری کوشش اور جدوجہد کرکے رپھراور دعا کی جائے اور اُس دعا سے نفسیاتی طور پر مزید جذبہ محرکہ اور عمل کی قوت ملے گی جو راستے کی مشکلات کو آسان کر دے گی۔ دعا کرتے وقت اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو مد نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ دعا اللہ اور بندے کے مابین تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ میری یہ کوشش ہوگی کہ تمہاری دعاؤں کو اللہ تک نہ پہنچنے دوں۔ کسی نے کہا یہ آپ نے کیا کہا۔ تو جواب دیا کہ تم دعا اُسی وقت کروگے جب تمہیں مشکلات پیش آئیں گی اور یہ درحقیقت خدا کے حضور میری شکایت ہوگی اس لیے میری کوشش ہوگی کہ تمہیں دعا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اس طرح میں تمہاری دعاؤں کو آگے جانے نہیں دوں گا۔ پاکستان میں ہر کوئی ہمہ وقت دعا کر رہا ہوتا ہے کہ یااللہ بجلی آجائے، یااللہ گیس آجائے، یا اللہ پانی آجائے، ہاسپٹیل سے دوا مل جائے، فلاں شخص دفتر میں مل جائے، فلاں کام ہو جائے لیکن ترقی یافتہ ممالک کے عوام کو اس طرح دعائیں

نہیں کرنا پڑتی کیونکہ وہاں کی حکومتیں حکمت فاروقی پر کابند ہیں اور عوام کے مسائل حال کرتی ہیں نہ اسمبلیوں میں دعائیں۔ حکمرانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے کہ عوام نے انہیں کس لیے منتخب کیا ہے۔ عوام پانی کی ایک ایک بوند کو ترسییں اور حکمران طبقہ اپنی عیاشیوں میں مگن رہے۔ کیا یہ کسی المیے سے کم ہے کہ ملک کے سب سے بڑے شہر کے باشندے پینے کے پانی کے لیے خوار ہو رہے ہیں۔۔بڑے بڑے بیانات اور عمارتیں کھڑے کرنے سے خوشحالی نہیں آتی بلکہ عوام کی بنیادی ضروریات ان کی دہلیز پر پہنچانے سے ہی ایک پرسکون معاشرہ اور خوشحال مملکت وجود میں آتی ہے۔ عوام کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ آخر کب تک وہ اپنا استحصال کرواتے رہیں گے اور کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

سوشل میڈیا اور غلط معلومات کا فروغ

یہ دور بالا شبہ میڈیا کا دور ہے اور آج کل پوری دنیا میں کوئی بھی میڈیا سے لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ اخبارات، ٹیلی وژن، آن لائن ویب سائیٹس اور دوسرے ذرائع سے خبریں اور معلومات اتنی زیادہ موجود ہیں کہ نہ تو ہم سب سے تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس اتنا وقت ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ میڈیا کی ہی بدولت عام عوام کو ہر شعبہ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ دنیا کے کسی خطہ میں کچھ بھی ہو وہ چشم زدن میں روئے زمین کا ہر شخص اس سے آگاہ ہو رہا ہے جبکہ دور ماضی میں اس کے لیے بہت وقت درکار ہوتا تھا۔ میڈیا ہی کہ بدولت عوام الناس کو سیاست، صحت، تعلیم، مذہب، کھیل، سماجی امور غرض ہر ایک شعبہ کے بارے میں نت نئی معلومات باآسانی میسر ہیں ۔ یہ میڈیا کا بہت ہی مثبت اور اہم کردار ہے لیکن ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے کہ بعض اوقات میڈیا اپنی ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کرتا اور غلط معلومات کو بھی پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔ مستند اخبارات اور ٹی وی چینل اگرچہ بہت محتاط ہوتے ہیں لیکن سب ایسے نہیں ہوتے۔ روایتی میڈیا میں ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جن کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خبروں اور معلومات کی تصدیق کے بعد ہی اسے جاری کریں لیکن سوشل میڈیا بے لگام ہوتا ہے کیونکہ پرنٹ میڈیا میں

ایڈیٹر اور اس کا عملہ نگرانی کے فرائض سرانجام دیتا ہے لیکن سوشل میڈیا میں ایسا کوئی انتظام نہیں۔ سوشل میڈیا سے ہر طرح کی معلومات، خبریں اور مواد بغیر کسی تصدیق کے ایک سیلاب کی طرح پھیلتا جاتا ہے اور کوئی تصدیق و تحقیق کی زحمت گوارا ہی نہیں کرتا جس سے وہ غلط اطلاعات وائرس کی طرح پھیل جاتی ہیں۔

انٹرنیٹ کی سہولت عام ہونے اور سمارٹ فون کی بدولت لوگوں کا انحصار اب سوشل میڈیا کی طرف زیادہ ہوگیا ہے اور سمارٹ فون نے لوگوں کے ہاتھ سے بھی کتاب چھڑا دی ہے اور اب ریل گاڑیوں، بسوں اور انتظار گاہوں میں بیٹھے لوگ انٹرنیٹ استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے کتاب بینی کا شوق بہت کم ہوا ہے۔ سمارٹ فون میں چونکہ ہر طرح کی دلچسپیاں اور سہولتیں موجود ہوتی ہیں اس لیے یہ دور جدید میں ہر شخص کی ضرورت بن چکا ہے۔ گھر میں کھانا نہ بھی پکا ہو تو بچے صبر کرلیں گے لیکن اگر WiFi میں خلل ہے تو وہ آسمان سر پر اٹھالیں گے۔ اسی سمارٹ فون کی بدولت معلومات کی فراہمی اور سوشل میڈیا کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کے جہاں مثبت پہلو ہیں وہاں اس کے منفی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسروں سے ملنے والی معلومات کو آگے پہنچانے اور مزید پھیلانے کے لیے صرف ایک بٹن کو دبانا پڑتا ہے۔ معلومات درست ہوں یا غلط کوئی اس جھنجھٹ میں پڑتا ہی نہیں بطور خاص جب مذہبی قسم کی معلومات ہوں

جن میں بہت سے ثواب کی نوید یا پھر شیطان کے روکنے کا ذکر کیا گیا ہو۔ اس صورت حال میں سوشل میڈیا استعمال کرنے والے بغیر تحقیق اور تصدیق کے بس شئیر کیے جارہے ہیں۔ مذہب، صحت عامہ، سماجی شعبہ اور دیگر امور کے بارے بہت سی غلط معلومات باقاعدگی پھیلائی جارہی ہیں اور قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی اسی رو میں بہے چلے جارہے ہیں حالانکہ ہمارے رسول اکرمؐ نے بغیر تصدیق کے بات اگے پھیلانے سے منع کیا ہے اور اسے جھوٹ قرار دیا ہے۔اس صورت حال کا تدارک کرنے کو کوشش ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

چند دن قبل سوشل میڈیا کے ذریعہ ایک پیغام گردش میں تھا کہ رات ساڑھے بارہ بجے کے بعد موبائل فون بند کردیں کیونکہ خلا سے بہت خطرناک قسم کی تابکاری اور دوسری لہریں زمین پر آرہی ہیں جو موبائل فون کے ذریعہ انسان کو نقصان پہنچائیں گی۔ پیغام پڑھتے ہی اس کی تصدیق کرنے کی کوشش کی تو یہ غلط ثابت ہوا۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک پتھر کی تصویر گردش میں تھی جو کہ ہوا میں معلق تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ جب رسول پاکؐ معراج پر جارہے تھے تو انہوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا اور تب سے وہ پتھر اسی جگہ زمین سے اوپر ہوا میں معلق تھا جو کہ فوٹو شاپ کی کارستانی تھی لیکن اسے غلط طور پر رسول پاک ﷺ سےمنسوب کیا جارہا تھا۔اسی نوعیت کی اور بہت سی معلومات اور اطلاعات آئے روز گردش میں رہتی ہیں جنھیں لوگ بغیر تصدیق کے Share کرتے

چلے جاتے ہیں۔ کہیں معجزانہ طور پر پتھر ہوا میں معلق، کہیں کوئی اور خود ساختہ کرامت کہیں ضعیف اور وضعی روایات کو پیش کیا جاتا ہے اور کہیں ناقص معلومات اور، فضولیات کو پھیلایا جارہا ہوتا ہے۔ ایک اور انتہائی خطرناک عمل صحت کے بارے میں غلط معلومات پھیلانا ہے جہاں ذیابیطس، بلڈ پریشر، سرطان اور بہت سی دوسری بیماریوں کا مستقل علاج تجویز کیا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ دنیا میں انبیماریوں کا کوئی مستقل علاج نہیں اور اگر کسی کی دی گئی غلط معلومات کی بنا پر کوئی مریض عمل کرے اپنی صحت اور خراب کر بیٹھا تو کون ذمہ دار ہے۔ خدارا لوگوں کی صحت سے کھیلنا بند کردیں۔

ذیابیطس کے علاج کے لیے دیسی انڈوں کو نمک میں دبا کر کھانے کا مشورہ بھی سوشل میڈیا میں گردش میں ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کی معلومات کو دوسروں سے شئیر بھی کیا۔ دوسروں کی صحت تباہ کرنے والی غلط معلومات کو ثواب سمجھ کرآ گیپھیلایا جا رہے۔ معمولی سائنس کا طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ ذیابیطس کا تعلق جسم میں شکر کے میٹابولزم سے ہے جس کے لیے انسولین یا شوگر کی ادویات سے ہی علاج ممکن ہے اور کوئی ایسی دوا موجود نہیں کہ اسے کچھ عرصہ کھالیں تو ذیابیطس ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ انڈے اور نمک کھانے سے تو شوگر کا مرض اور بڑھ جائے گا کیونکہ ذیابیطس کے اکثر مریضوں کو بلڈ پریشر اور خون میں کلیسٹرول کی زیادتی بھی ہوجاتی ہے جبکہ نمک اور انڈے ان دونوں

میں اور زیادتی کا باعث بنیں گے۔۔برائے مہربانی معالج مت بنیں ، یہ جن کا کام ہی انہی کے سپرد رہنے دیں۔ سوشل میڈیا استعمال کرنے والے اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں۔ آج کے دور میں معلومات بہت جلدی کے ساتھ آگے پھیلتی ہیں اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ بغیر اطمینان اور تصدیق کے کوئی بھی سوشل میڈیا پر دی گئی معلومات کو Like نہ کریں بلکہ اس طرح کی معلومات اور پیغام دینے والے کو اپنی رائے شئیر یا سے آگاہ کریں کہ ایسی چیزیں آگے پھیلانے سے گریز اور نظر انداز کر دیں۔ اگر سوشل میڈیا میں Like اور Share کے ساتھ Dislike کی بھی سہولت تو بہتر ہے تاکہ فضول اور غلط معلومات والی پوسٹ کو Dislike کیا جاسکے۔ اسی طرح لوگ Like کا استعمال بھی غیر ضروری کرتے ہیں۔ کوئی بیمار ہے، یا پریشان ہے یہاں تک کہ کسی کا انتقال بھی جائے تو لوگ Like کر رہے ہوتے ہیں ۔ جو لوگ محض یہ بتانا چاہیں کہ انہوں نے یہ پوسٹ پڑھ لی ہے ان کے لیے seen کا آپشن ہونا چاہیے جب تک ایسا آپشن نہیں تو کچھ نہ کرنا بہتر ہے۔ موجودہ صورت میں ہر ایک اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے صرف مصدقہ اور مستند معلومات ہی آگے دوسروں کو بھیجیں۔ ضروری نہیں کہ ہر پوسٹ کو Share کیا جائے بلکہ انہیں نظر انداز کر دیں۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔

علامہ اقبال اور میاں محمد بخش

پنجابی برصغیر کی ایک بڑی زبان ہے اور اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس زبان کے بہت سے شعراء ہیں جن کا کلام ہر دور میں عوام میں مقبول رہا ہے۔ برصضیر میں آنے والے صوفیا اکرام جب خطہ پنجاب میں آئے تو انہوں نے یہاں کی زبان کو اپنی رائے کا اظہار کا ذریعہ بنایا جن کا کلام آج بھی وجد آفرین ہے ۔اُن کے کلام میں انسان دوستی، محبت و یگانگت ، برداشت ، صلح جوئی اور احترام باہمی کا پیغام ملتا ہے جسے دورحاضر میں پھیلانے کی بہت ضرورہے۔ انہی صوفی شعراء میں ایک میاں محمد بخش ہیں جن کا تعلق ریاست جموں کشمیر کے علاقہ کھڑی ضلع میرپور سے ہے۔ یہ علاقہ چونکہ پنجاب سے ملحق ہے اس لیے یہاں کی زبان پنجابی ہے جس پر پوٹھواری کا بہت اثر ہے۔ میاں محمد بخش کی ولادت ۱۸۳۰ء کو میاں شمس الدین کے ہاں ہوئی جو قبیلہ گوجر پسوال کے ایک معزز شخص اور صوفی منش تھے ۔ میاں محمد بخش کے دادا میاں محمد دین پیرا شاہ غازی دمڑی والی سرکار کے سجادہ نشین تھے بعد ازاں آپ کے والد اور پھر خود میاں صاحب نے یہ منصب سنبھالا۔ انہوں نے زمانے کے دستور کے تحت عربی، فارسی اور دینی علوم سیکھے ۔آپ کا دور ریاست جموں کشمیر کے مسلمانوں کے لیے بہت پر اشوب تھا کیونکہ ۱۸۴۶ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے عہد نامہ امرتسر کے تحت انگریزوں سے ریاست کو خرید لیا تھا اور

مطلق العنان حکمران بن گیا۔ برصغیر کے مسلمان بھی جنگ آزادی میں شکست کے بعد محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ میاں صاحب کے کلام میں جابجا ان حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ریاست جموں کشمیر کے معروف محقق ڈاکٹر غلام حسین نے آپ کی پندرہ تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں سیف الملوک، سوہنی مہینوال، تحفہ میراں، نیرنگ خیال، تحفہ رسولیہ، سیریں فرہاد، مرزا صاحباں، ہیر رانجھا، شاہ منصور اور ہدایت المسلمین شامل ہیں۔ میاں صاحب نے عوام الناس خصوصاً کم تعلیم یافتہ طبقہ کو عشق حقیقی کی طرف لے جانے کے لیے مجاز کی مثالوں سے سمجھایا ہے۔ انھوں نے پنجابی کے اہم صوفی شعراء کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے جن میں سلطان باہو، بابا فرید شکرگنج، بلھے شاہ، وارث شاہ اور شاہ مراد شامل ہیں۔ میاں محمد بخش کے بارے میں بہت کتب لکھی گئی ہیں جن میں معروف ادیب اور صحافی کلیم اختر کی اقبال اور مشاہیر کشمیر، پروفیسر نذیر احمد تشنہ کی مطالعہ کشمیر اور ڈاکٹر غلام حسین اظہر کی میاں محمد شخصیت اور فن شامل ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے ان تینوں شخصیات کی شاگردی اور صحبت حاصل رہی ہے۔

میاں محمد بخش کا دور علامہ اقبال سے کچھ ہی عرصہ پہلے کا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ جب ان کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا علامہ اقبال کی شاعری کا وہ دور شروع ہوا جس نے انہیں حکیم الامت کے مرتبہ پر فائز کیا۔ علامہ اقبال کی چونکہ مادری زبان پنجابی تھی اس لیے انہیں میاں محمد بخش کا کلام بہت پسند تھا۔

بقول صوفی تبسم علامہ اقبال پنجابی کے مشاہیر شعراء کے بہت مداح تھے۔ ایک دفعہ لاہور میں علامہ اقبال نعت خوانی کی ایک محفل میں شریک تھے جہاں کسی نے میاں محمد بخش کی تصنیف سیف الملوک کا کلام پڑھنا شروع کیا

ملک عبادت خاصی اندر دائم رہن کھلوتے پر عشقے دی لہرے دے اندر مانہ سکدے غوطے

یہ سننا تھا کہ علامہ پر رقت طاری ہو گئی او آنکھیں پر نم تھیں بعد میں فرمایا کہ میاں صاحب اگر آج زندہ ہوتے تو میں اُن کے ہاتھ چوم لیتا۔ میاں صاحب کی اسی شعر کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے کہ مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں انہیں کاکام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ

میاں محمد بخش اور علامہ اقبال دونوں بہت.بڑے عاشق رسول تھے اور انسانیت کے ترجمان تھے۔ دونوں کا تعلق خطہ جموں کشمیر سے ہے۔ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ جا بسے لیکن اقبال کشمیر کو ہی اپنا وطن کہتے رہے جبکہ میاں محمد تو رہنے والے ہی کھڑی شریف میرپور کے تھے۔ علامہ اقبال نے فارسی اور اردو کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا جبکہ میاں صاحب نے یہی کام پنجابی میں کیا۔ دونوں کے کلام میں بہت اشتراک پایا جاتا ہے جس ایک وجہ دونوں کا مولانا روم سے متاثر ہونا ہے۔ دونوں حضرات کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ علامہ اقبال نے قاضی سلطان محمود کے ہاتھوں پر بیعت کی اور سلسلہ

قادریہ سے وابستہ ہوئے۔ قاضی سلطان محمود اور میاں محمد بخش ہم عصر تھے اور دونوں میں اکثر ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا تھااور ایک دفعہ جب قاضی صاحب ملنے بعد جانے لگے تو میاں صاحب نے اُن کے رخصت ہونے پر ایک رباعی بھی لکھی۔ اس اعتبار علامہ اقبال کی میاں محمد بخش سے الفت قدرتی امر ہے۔ تصوف میں غیر اسلامی تعلیمات کے اثرات کے بارے میں علامہ اقبال سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ خواجہ نقشبندی سرہند کی میرے دل میں بہت عزت ہے مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں، میں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔علامہ قبال اور میاں محمد بخش کے کلام میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی تناظر میں میاں محمد بخش اور علامہ اقبال کے وہ چند اشعار پیش ہیں جن کا پیغام ایک ہی ہے۔

میاں صاحب لوئے لوئے بھر لے کڑیئے جے توں بھانڈاں بھرناں شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نے ڈرنا

علامہ اقبال عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے یہ ناری ہے

میاں صاحب بال چراغ عشق دا میرا روشن کردے سیناں دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زمیناں

علامہ اقبال خدایا آرزو میری یہی ہے میرا نور بصیرت عام کردے
میاں صاحب دل وچ کرے دمیل شہزادہ کیہہ کم کرسن تارے آپ تخت توں ڈھیندے جاندے او غریب وچارے

علامہ اقبال ارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار وزبوں
میاں صاحب سچے مرد صفائی والے جو کچھ کہن زبانوں مولا پاک سنیدا اوہو کی خبر اسانوں

علامہ اقبال ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب وکار آفرین کار کشا کار ساز
میاں صاحب جے لکھ واری عطر گلابوں دھوئیے نت زباناں نام انہاں دے لائق ناہیں کی کلمے داکاناں

علامہ اقبال چوں بنام مصطفیٰؐ خوانم درود از خجالت آب می گردو وجود

سید نذیر نیازی جو بہت عرصہ علامہ اقبال کی صحبت میں رہے اور علامہ کے خطبات کا اردو ترجمہ بھی کیا، ان کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کچھ لوگ علامہ اقبال سے ملنے آئے اور دوران گفتگو علامہ نے اپنے کچھ شعر پڑھے تو ان لوگوں نے میاں محمد بخش کے اشعار سنائے جن میں وہی پیغام تھا تو علامہ نے فرمایا کہ میاں سو دانا اور ایک ہی بات ۔

روح رمضان المبارک

رمضان المبارک اپنی تمام تر رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ ہم پر ایک بار پھر سایہ فگن ہے۔ یہ دین سلام کی منفرد خصوصیت کہ اس نے اپنے پیرکاروں کے لیے ایک سالانہ عملی تربیت کا پروگرام رکھا ہے جس سے ان میں نظم و ضبط اور مجاہدانہ تربیت پیدا ہوتی ہے۔ اکٹھے سحری و افطاری کرنے سے مضبوط سماجی روابط اور قربت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جب گھر کے افراد دونوں اوقات میں ایک ہی جگہ بیٹھ کر خورد و نوش کرتے ہیں تو خوشگوار گھریلو زندگی نظر آتی ہے۔ رمضان میں دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور عبادات کے ماحول میں دین کے طرف مزید قربت بڑھتی ہے۔ دین کے روحانی پہلو کا احساس انہیں بھی ہوتا ہے جس کا احساس شائد عام دنوں میں نہ ہوسکے۔ واقعی رمضان کی صورت میں اللہ نے انسانوں کی تربیت کی جو نعمت عطا کی ہے اس پر جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ روزہ جہاں انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتا ہے وہاں جسم انسانی کو افعال پر بھی بہتر اثرات مرتب کرتا ہے اور ساتھ انسانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے جس سے صبر و برداشت، ایثار و قربانی اور ضبط نفس کے اعلیٰ اوصاف کی تکمیل ہوتی ہے۔ روزہ قدرتی صبریوں بھی دیتا ہے چونکہ ہمارا دھیان کھانے اور پینے کی طرف نہیں ہوتا اس لیے ہمارے دماغ میں موجود Hunger Center کو

کوئی محرک نہیں ملتا اور اس طرح ہمیں بھوک اور پیاس کا ویسا احساس نہیں ہوتا جیسا عام دنوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہاں کام کرنے والے یورپین ہمیں روزے رکھتا دیکھ کر محو حیرت ہوتے ہیں اور وہ اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔

شمالی یورپ کے ممالک جن میں سویڈن، فن لینڈ، ناروے اور آئس لینڈ شامل ہیں وہاں روزے کا دورانیہ بیس گھنٹوں سے زائد ہے۔ قطب شمالی کے اس خطہ کے کچھ علاقوں میں تو ان دنوں دن رات کا تصور ہی نہیں۔ ان لمبے روزوں کی بابت اکثر لوگ سوال کرتے ہیں اور مختلف قسم کے فتوے بھی گردش میں ہیں کہ مکہ یا استنبول کے قوت کے مطابق روزہ رکھ لیا جائے یا پھر سولہ گھنٹے کا روزہ رکھیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ روزہ فاقہ کشی کا نام نہیں کہ سولہ گھنٹے یا کسی اور شہر کے وقت کے مطابق رکھا جائے۔ نماز اور روزہ کے اوقات مقامی ہوتے ہیں اور روزے کا دورانیہ خود اللہ تعالیٰ نے صبح صادق سے رات تک مقرر کیا ہے (۲:۱۸۷) پھر کون اسے تبدیل کر کتا ہے۔ اجتہاد اس معاملہ میں ہو سکتا ہے جو قرآن میں موجود نہ لیکن جو قرآن میں واضح طور ہو اسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لمبے روزوں کا حل بھی قرآن میں موجود ہے اور اگر قرآن حکیم میں تدبر کیا جائے تو سورہ بقرہ میں بیماروں، مسافروں اور بہت مشکل سے رکھنے والوں کو قضا کی سہولت دی گئی ہے۔ جن ممالک میں دن رات کا تعین مشکل ہے، یا بہت لمبے روزے ہیں یا موسم کی وجہ سے کوئی بہت ہی مشقت سے سیے رکھتا ہے کہ

کوئی کام ہی نہ کرےکے تو وہ اس زمرے میں آجاتا ہے اور یورپی فتویٰ کونسل جس میں یورپ مین رہنے والے بہت سے علماء شامل ہیں انہوں نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔

یہاں ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اگرچہ شمالی یورپ کے ان ممالک میں بہت لمبے روزے ہیں لیکن چونکہ موسم گرم نہیں ہوتا تو یہاں رہنے والے بڑے تو ایک طرف اکثر بچے بھی روزہ دار ہیں۔ اگر انسان نے کوئی کام کرنا ہو تو وہ کرلیتا ہے لیکن اگر فرار کی راہ تلاش کرنا ہو تو ہو وہ پھر کٹھ حجتوں پر اتر آتا ہے۔ لوگ کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ روزے فرض ہوتے ہی اسی سال یعنی سن ۲ھ میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر جنگ لڑنا پڑی تھی اور موسم بھی گرمیوں کا تھا لیکن انہوں نے روزے رکھ کر کفار سے جنگ لڑی اور فتح مبین حاصل کی۔ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے کہ احکامات پر عمل کرنے میں پوری صدق دل سے کوشش کرنی چاہیے۔

اس پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ روزوں کا مقصد کیا ہے۔ جب ہم رمضان المبارک کی روح کو سمجھ جائیں گے تو پھر ہی اس کی رحمتوں سے استفادہ کرسکیں گے۔ رمضان اور قرآن دونوں لازم املزوم ہیں۔ اسی ماہ مبارک میں انسانیت کے نام خدا کے آخری پیغام اور ہدایت کا نزول ہوا تھا اسی لئے رمضان کے اختتام پر جو عید الفطر منائی جاتی ہے وہ قرآن ملنے کی خوشی کی صورت میں جشن نزول قرآن منایا جاتا ہے جس کا ذکر سورہ یونس میں ہے۔ کسی اور مذہب میں رمضان کے

روزوں کی صورت میں مجاہدانہ تربیت کا اس قدر اہم نظام موجود نہیں جیسا کہ دین اسلام میں ہے مگر بد قسمتی یہ ہے کہ ہم محض فاقہ کشی کو روزہ سمجھ لیتے ہیں اور ایک حدیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق برائیوں کو ترک نہ کرنے پر صرف بھوک اور پیاس ہی ملتی ہے۔ جس قوم میں رمضان کی صورت میں بہترین سپاہیانہ سالانہ ٹریننگ کا نظام ہو اس قوم کا کردار اور خوبیاں سب سے اعلیٰ وارفع ہونی چاہئیں تھیں۔ روزہ کی روح اور اس کے اصل مقصد کو نہ ہی ہم سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی رمضان کے بعد اس حاصل تربیت کو باقی گیارہ مہینوں میں اپناتے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال ہم دیگر عبادات کے ساتھ کرتے ہیں جنہیں ہم نے رسمی انداز میں ادا کرنے کو ہی تمام غرض غائیت سمجھ رکھا ہے۔ علامہ اقبال بھی اس حقیقت کو یوں اجاگر کرتے ہیں۔

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں

کیا وجہ ہے کہ ہمارے لاکھوں کے اجتماع، مساجد میں قیام الیل اور دیگر رسمی عبادات نتیجہ خیز نہیں ہیں۔ جس قوم کا ہر سال لاکھوں افراد کا کئی دنوں تک عالمگیر اجتماع ہو مگر اس قوم کی تقدیر نہ بدلے تو ضرور سوچنا چاہیے کہ وجہ کیا ہے۔ ہماری پانچ وقت نماز بھی ہمیں برائیوں سے نہیں روکتی حالانکہ یہ نماز کا دعویٰ ہے۔ وجہ بھی قرآن حکیم سورہ الماعون میں خود بتاتا ہے۔ جو صلوٰۃ کی حقیقت سے ناآشنا ہوں اور صرف ظاہری حرکات وسکنات کو ہی حقیقت

صلوٰۃ سمجھ لیں وہ بجائے اس کے کہ برائیوں سے بچائے اور بہتر نتائج پیدا کرکے وہ ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمیں رمضان کے روزوں کی روح اور فرضہونے کی غرض و غائیت کا علم ہونا چاہیے۔ ماہ رمضان کے روزے رکھنے، نماز باقاعدگی سے ادا کرنے اور قرآن حکیم کی تلاوت کے باوجود اگر ہماری ذاتی اور اجتماعی زندگی میں بہتری پیدا نہیں ہورہی تو ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ اس کی وجہ کیا ہے قرآن حکیم بھی ہمیں حکم دیتا ہے کہ تتفکرون یعنی سوچا کرو۔

چانکیہ کے پیروکار

آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر کا خطاب ملنے والے شخص نے مسلم قومیت کا نعرہ لگایا اور برصغیر کی تقسیم کا علمبردار بن گیا۔ ان سے قبل کیوں سرسید نے یہ واضع کردیا کہ ابہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اور خاک وطنکے ہر ذرہ کو دیوتا کہنے والا اقبال کیوں مسلم ہیں وطن ہیں سارا جہاں ہمارا اور وطنیت کو تازہ خدا کہنے پر مجبور ہوا۔ یہ سوالات ذہن میں اس لیے بھی ابھرے کہ حالیہ دنوں میں بھارتی قیادت کے بیانات اور رویہ نے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ ایک طرف اُن کا طرز عمل ہے اور دوسری طرف خود ہمارے کچھ لوگ یہ برملا کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بھارت سے خطرہ ہی کیا ہے اور ساتھ امن کی آشا بھی کا بھی چرچا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امن اور سلامتی اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک انصاف نہ ہو اور فریق ثانی کو برابر کا مقام نہ دیا جائے۔ ظلم رہے اور امن بھی ہو یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔جب تک دوسروں کو اپنا مطیع بنائے رکھنے ،علاقائی چوہدراہٹ اور ناانصافی کی پالیسی ترک نہ کیا جائے امن کی آشا صرف سوچ کی حد تک رہتی ہے۔

دراصل قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی نوجوان نسل کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو ہے کیا اور ہندو ذہنیت ہوتی کیا ہے کیونکہ ان کے ساتھ ان کا پالا جو

نہیں پڑا۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے جس کا نام ہے چانکیہ اور اس کا لقب ہے کوٹلیا جس کے معنی مکار اور فریب کار خود وضاحت کر رہے ہیں مزید تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔ چانکیہ نے اصول سیاست پر سنسکرت میں ایک کتاب لکھی جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ اپنی کتاب میں چانکیہ نے جو اصول سیاست دیئے ہیں اس کے مطابق ہمسایہ ریاستوں سے دشمن کا سا سلوک روا رکھا جائے دوستی خود غرضی پر مبنی ہو دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کردے۔ مجھے بھارتی قیادت کے بیانات اور طرز عمل سے کوئی حیرانی نہیں اپنے روحانی باپ چانکیہ کی تعلیمات عمل پیرا ہو ہے۔

چانکیہ کے ان نظریات کو گاندھی جی نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر جاری رکھا۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور عدم تشدد کا پرستار کہہ کر پکارا جاتا ہے مگر قائداعظم محمد علی جناح جن کا دن رات گاندھی سے واسطہ رہتا ہے ایک مختصر بیان میں ساری حقیقت بیان کردی کہ مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا در، حقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ قائداعظم نے ایک موقع پر گاندھی کے بارے میں کہا کہ وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اسی پالیسی پر نہرو کاربند

تھے کہ جسے ختم کرنا پہلے اس کے ساتھ دوستی کرو۔ گلے مل کر اسے چھرا گھونپ دو اور پھر اس پر بین کرو اور رورہ کر اپنی ہمدردی جتاؤ۔ یہ اس محاورے کی عملی تفسیر ہے جو ہندوؤں کے لئے مشہور ہے کہ بغل میں چھری منہ میں رام رام۔

ہندو قیادت کے طرز عمل کی وجہ سے کہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور وطن پرست سر سید احمد خان، علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر مسلم اکابرین دو قومی نظریے کی بنیاد پر الگ وطن کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مطالعہ تاریخ سے عیاں ہے وجہ صرف ایک ہی ہندو ذہنیت تھی اگر ہندو رواداری کا مظاہرہ کرتا اور مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے سے گریزاں نہ ہوتا تو پاکستان کبھی بھی معروض وجود میں نہ آتا۔ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لئے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں کے جلسوں میں اسلام مخالف اشتعال انگیز تقریریں اور نعرے لگتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ

اٹھا اپنا تو ملا مصلی یہ بلٹی عرب کو پہنچانی پڑے گی
جہاں ہے کعبہ ہوگا شیوجی کا مندر اسلام کی ہستی مٹانی پڑے گی

یہ ہے ہندو ذہنیت کا اصل چہرہ۔ موجود بھارتی قیادت نے اعلان کیا تھا کہ اقتدار میں آ کر تین ہزار مساجد جو بقول ان کے مندروں پر بنی ہیں مسمار کر کے ان پر مندر تعمیر ہوں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کو کس کے

ایماء پر قتل کیا گیا۔ تاریخ اس پر بھی شاہد ہے کہ قیام پاکستان کے اعلان سے قبل ہی ہندوؤں نے آسام اور بنگال میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا جو پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ آزادی کے بعد بھی بھارت میں اب تک ہزاروں مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں لیکن آج تک کسی کو سزا نہیں دی گئی۔ مسلم کش فسادات کے لئے ہندوؤں کا حربہ یہ ہوتا ہے کہ خود ہی کسی ہندو جلوس یا مندر پر معمولی سا حملہ کر کے الزام مسلمانوں پر عائد کر دیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس پر اسی حکمت عملی کے تحت خود آگ لگائی اور سزا مسلمانوں کو دی۔ بھارت کا کون سا ایسا علاقہ ہے جہاں خونِ مسلم آبیاری نہیں ہوئی۔ گجرات، احمد آباد، بھوانڈی اور ہر وہ شہر جہاں مسلمان آباد ہیں ان پر قیامت نہ ڈھائی گئی ہو۔ بھارتی مسلمانوں کو، ہر جگہ اور ہر وقت اپنی وفاداری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں کو اپنا مسلم نام تبدیل کر کے ہی تعلیمی اداروں میں داخلہ ملتا ہے۔ پاک بھارت جنگ میں پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دیکر غداری کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اکثر مقامات پر دیواروں پر یہ نعرہ لکھا گیا کہ ، مسلمانوں جاو پاکستان یا قبرستان۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کی کمر توڑنے کے لئے زمین داری ایکٹ نافذ کیا گیا اور مسلمانوں سے ان کی زمینیں ہتھیا لی گئیں۔ ہندوں انتہا پسند تنظیموں جیسے آر ایس ایس کو صوبائی فورسز میں تبدیل کر دیا گیا جنھوں نے مسلم آبادی کے خلاف کھلم کھلا تعصب برتا اور اسی آر ایس

ایس کے رکن آج بھارت کت وزیر اعظم ہیں۔ ابھی تک بھارت میں مسلمانوں کی وفا داری پر شککیا جاتا ہے اور ایک مرتبہ ایک مسلمان لیفٹینٹ جنرل کو آرمی چیف بننے کے استحقاق کے باوجود نہ بنایا گیا اور اسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ بعض مسلمان بھی گاندھی جی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادیتے ہیں اور انہیں سچائی ،انصاف اور سیکولرازم کا علمبردار قرار دیتے ہیں مگر حقیقت وہی جو قائد اعظم نے گاندھی کے بارے میں کہی تھی ان کا سیکولرازم محض دکھاوا تھا۔جب نہرو کی بہن ایک مسلمان کے ساتھ شادی کرنے لگی تو گاندھی نے اس کو روک دیا۔ پھر گاندھی کا اپنا بیٹا ہری لال مسلمان ہوا تو اس کا دہرا معیار کھل کر سامنے آگیا۔پورے خاندان نے اس کے ساتھ قطع تعلق کرلیا اور اسے پھر ہندو بنوا کر گمنامی کی موت سے دوچار کیا۔ بھارت نے چانکیہ کی پالیسی کو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رکھا۔ایک طرف اثاثوں میں سے پاکستان کے پانچ کروڑ روپے ہڑپ کرلئے اور دوسری جانب کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔جو ناگڑھ اور مناور کے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے باوجود اس پر قبضہ کیاور حیدر آباد کی خود مختاری کو اپنی جارحیت اور فوج کشی سے روند ڈالا۔ مشرقی پاکستان میں اندرونی غلفشار سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو دولخت کرکے جشن فتح منایا اور آج ان کا وزیر اعظم اپنے شریک جرم ہونے کو کہانی سُنا رہا

ہے۔سیاچن میں پاکستان پر دنیا کی مہنگی ترین جنگ مسلط کر رکھی ہے اور جس وجہ سے آئے روز ہمارے کئی جوان جام شہادت نوش کرتے ہیں۔پاکستان کے دریاؤں سے پانی چرا کر ہمیں بنجر بنانے کا عمل شروع کر دیا ہوا ہے۔پاکستان میں دہشت گردی کے تانے بانے سرحد پار ہی سے ملتے ہیں اور اسی تناظر میں سری لنکا کی ٹیم پر حملہ کرکے پاکستان کی کرکٹ کو تنہائی کا شکار کردیا ہے۔پاکستان کو سبق سکھانے اور نشان عبرت بنانے کے منصوبہ پر وہ عمل پیرا ہے۔بلوچستان اور کراچی کے امن کو کون تباہ کر رہا ہے اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں۔

بھارتی ذہنیت صرف وہاں کی حکومت ،سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں تک ہی محدود نہیں بلکہ عام عوام بھی اسی پر کاربند ہیں۔اگرچہ ایک بہت ہی قلیل تعداد خلوص دل کے ساتھ امن کی آشا کی حامی ہیں مگر بدقسمتی سے اکثریت ایسا کرنے کی بجائے اپنی حکومت کے نقش قدم پر چلتی ہے۔اکثر بھارتی عوام پاکستانی مصنوعات خریدنے سے گریز کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس پاکستانی عوام بھارتی اشیاء خریدنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

برصغیر میں امن اور سکون سے ہی وہاں بسنے والے عوام کے مسائل حل ہو سکتے ہیں جو خطیر رقم فوجی مقاصد اور ہتھیاروں پر خرچ ہو رہی ہے اسے تعلیم ،صحت ،آمدورفت سائنسی ترقی اور دیگر شعبوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔مگر امن کی آشا اسی وقت،

مل سکتی ہے جب انصاف، برابری اور دوسروں کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ بھارت بڑا ملک ہونے کے ناطے اس کا آغاز کر سکتا ہے اور بھارت نواز حلقوں کو بھی چاہیے کہ وہ یہ بات بھارت کو باور کرائیں اور اس کا آغاز اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو تسلیم کرنے سے کرے اور کشمیر میں آزادانہ استصواب کرا کے امن کی آشا کو عملی موقع دے اور پاکستان میں دہشت گردی کے منصوبے ختم کرے۔

بیرون ملک مطالعاتی دورے یا سیر سپاٹے

گذشتہ پانچ سالوں کی طرح اس سال بھی حکومت پنجاب کی جانب سے میٹرک اور ہائر سیکنڈری سکول کے بورڈ کے امتحانات میں اول آنے والے طلبا و طالبات اس وقت برطانیہ، سویڈن اور جرمنی کے دورہ پر ہیں۔ یہ طلبا و طالبات پنجاب کے تمام تعلیمی بورڈز سے منتخب کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ دیگر صوبوں کے ساتھ آزاد جموں کشمیر اور گلگت بلتستان سے بھی ایک ایک طالب علم کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ان دوروں کا اہم مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا نے جو ترقی اور خوشحالی حاصل کی ہے اُس کا مشاہدہ کریں اور وہ اپنے ملک کے لیے اسی ترقی کی خاطر کام کریں۔ طلبہ کے لیے مطالعاتی دوروں کی اہمیت ہو سکتی ہے لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو قابل غور بھی ہے اور نا قابل تردید حقائق کا حامل ہے۔ہر سال لگ بھگ چالیس رکنی وفد کو یورپی ممالک کے دورے پر بھیجا ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر دورہ پر ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے اس طرح اب تک چھ کروڑ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر خطیر رقم خرچ کرنے کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ جس صوبے کے بہت زیادہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کے لیے چھت بھی میسر نہیں اور وہ موسم کی شدت میں بھی کھلے آسمان تلے تعلیم حاصل کرتے ہوں۔ جہاں لڑکوں کے سکول تو ایک طرف

بچیوں کے سکولوں میں بھی ٹائیلٹ تک نہیں ہوں وہاں ان دوروں کو ترجیح کیوں؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس چھ کروڑ روپے سے پنجاب کے بہت سے سکولوں میں ٹائیلٹ بنادیئے جاتے تاکہ طلبہ کو بنیادی سہولت میسر آتی۔ لیکن حکومت یہ کیوں کرے گی کیوں کہ اس سے اُسے وہ تشہیر نہیں مل سکتی جو اس طرح کے دوروں سے مل رہی ہے۔
ہر سال دورہ کرنے والے وفد میں طلبہ تو بدلتے رہتے ہیں لیکن سرکاری اہلکار وہی رہتے ہیں۔ اپنے منظور نظر اور خوشامندی افسر ہی کیوں دورے کا لازمی حصہ ہیں۔کیا دیگر سرکاری اہلکاروں کا حق نہیں کہ وہ بھی اس مطالعاتی دورہ کا حصہ ہوں۔ دورے کے ساتھ آنے والے سرکاری اہل کاروں نے تمام طلبہ کو وزیر اعلیٰ کی تعریف کرنے پر لگایا ہوتا ہے اور وہ خود بھی یہی کر رہے ہوتے ہیں۔ پورے دورے میں وفد جہاں بھی جاتا ہے وہاں وزیر اعلیٰ شہباز شریف کی اس قدر تعریف و توصیف ہوتی ہے کہ اس دورے کو شہباز شریف شو کہنا بے جانہ ہوگا۔ طلبہ کے یہ دورے مطالعاتی کی بجائے خادم اعلیٰ کی عالمی تشہیر کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وزیر اعلیٰ اپنی ذاتی رقم سے وفد کو دورہ پر بھیجتے ہیں۔ یورپ میں ایسے دوروں میں حکومتی سربراہوں کی خوشامد کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یورپی لوگوں کی موجودگی میں جب بار بار وزیر اعلیٰ کی خوشامدی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں تو یہاں کے میزبان سوچتے ہیں کہ یہ قوم ذہنی غلامی سے کب نکلے گی۔ سویڈن میں موجودہ وزیر اعظم نے سکولوں کو مزید بہتر بنانے کے لیے بہت بڑی اضافی رقم رکھی ہے لیکن اسے

وہ اپنی ذاتی تشہیر کے لیے استعمال نہیں کر رہے اور کہیں وزیر اعظم کی ذات کی تعریف نہیں ہوتی۔

حکمران اگر واقعی مخلص ہیں تو وہ بجٹ کا کم از کم دس فی صد تعلیم کے لیے مختص کریں۔ وہ ذاتی تشہیر کی بجائے قومی تعلیمی پالیسی اس انداز میں بنائیں کہ تعلیم اداروں کی حالت بہتر ہو۔ طلبہ کو تعلیمی سہولتیں اور مواقع مہیا کریں۔ اساتذہ کی تربیت پر توجہ دی جائے اور انہیں بہتر مراعات دی جائیں۔ اٹھارہ کروڑ کی آبادی سے پینتیس طلبہ یورپ کا دورہ کرکے کیا کیا تبدیلی لائیں گے ۔جب گذشتہ اڑسٹھ سالوں کے لا تعداد سرکاری دوروں سے کیا حاصل ہوا ہے؟ وزیر اعظم ، وزیر اعلیٰ اور دیگر تمام بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بہت عرصہ یورپ میں گذار کر کیا سیکھا ہے ؟انہوں نے ملک میں کیا تبدیلی لائی ہے۔پاکستان کی ٹاپ بیوروکریسی بھی تواتر سے غیر ملکی دورے کرتی ہے۔ ان دوروں سے عوام کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ کیا اس سے وہاں کے دفتری معاملات میں کوئی بہتری آئی ہے اور عوام کو سہولتیں ملی ہیں۔ کیا افسر شاہی کے رویے ،برتاؤ اور اخلاق میں وہ جھلک نظر آتی ہے یو یورپی سول سرونٹس میں وہ دیکھ کر جاتے ہیں۔ جب اُن کو کوئی فرق نہیں پڑا تو یہ بچارے طلبہ کیا کرلیں گے ہاں البتہ غریب عوام کے منہ سے نوالہ چھین کر وہی رقم سیر سپاٹے پر ضائع کی جارہی ہے۔ موجودہ ہوں یا ماضی کے حکمران ، انہیں

تشہیر کا اس قدر شوق ہے کہ طلبہ کی درسی کتابوں کے شروع میں اپنی تصویر اور پیغام دے کر آنے والے نسلوں کو ذہنی غلام بنانے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ طلبہ کو دورے پر بھیجنے کا یہ مقصد بھی بتایا جاتا ہے ان ملکوں کے تعلیمی نظام سے کچھ سیکھا جائے۔ تو اگر سیکھنا ہے تو سویڈن کے تعلیمی نظام سے یہ سیکھیں کہ یہاں میٹرک، ہائر سیکنڈری اور یونیورسٹی کی سطح پر ٹاپ پوزیشن بتانے کا کوئی رواج ہی نہیں۔ سب طلبہ بورڈ کا امتحان دیتے ہیں لیکن یہ کبھی اعلان نہیں ہوتا کہ اول دوم اور سوم کون سے طلبہ آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہاں کے ماہرین تعلیم یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح پوزیشن لینے والے طلبہ میں گھمنڈ اور نہ لینے والوں میں حسرت اور افسوس کا جذبہ پیدا ہے اس لیے ٹاپ پوزیشن کسی سطح پر بھی نہیں بتاتے۔ کیا سویڈن سے یہ نہیں سیکھا جاسکتا۔ پھر یہاں اضافی وسائل ذہین طلبہ پر لگانے کی بجائے کمزور طلبہ پر لگائے جاتے ہیں۔ انہیں سکول میں مفت اضافی ٹیوشن پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے لیے مزید وسائل مہیا کیے جاتے ہیں اور مزید اساتذہ مہیا کیے جاتے ہیں۔ تعلیم کارکردگی میں پیچھے رہ جانے والے سکولوں کو زیادہ امداد دی جاتی ہے۔ اس پالیسی سے پاکستان کے ارباب اختیار کیوں کچھ نہیں سیکھنا چاہتے۔ ہماری یونیوسٹیوں کی عمارتیں تو سویڈن کی جامعات سے کہیں بڑی اور بلند و بالا ہوسکتی ہیں لیکن سویڈن کی چھ جامعات دنیا کی پہلی دو سو بہترین یونیورسٹیوں میں شامل ہیں لیکن پاکستان کی ایک بھی یونیورسٹی اس فہرست میں شامل نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کون سوچے

گا البتہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن جو ملکی جامعات کی بہتری کے لیے کوشاں تھا اس کے پر کاٹ دیے گئے ہیں۔ مشرف دور میں پاکستان میں یورپی ممالک کی مدد سے نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا منصوبہ کدھر گیا۔

ایک اور پہلو یہ بھی ہے یہ دورے غیر مؤثر اور محض سیر سپاٹے کے علاوہ کچھ نہیں کس کی بڑی وجہ دوروں کے لیے غلط وقت کا انتخاب ہے۔ وفد تعلیم وفد کو یورپ کے دورے پر اس وقت بھیجا جاتا ہے جب یہاں گرمیوں کی چھٹیوں کی تعلیمی ادارے بند ہوتے ہیں۔ سویڈن میں جون کے دوسرے ہفتے سے لیکر اگست کے تیسرے ہفتے تک تمام تعلیمی ادارے بند ہوتے ہیں۔اس طرح پاکستانی طلبہ کا وفد کسی تعلیم سرگرمی، سیمینار، یہاں کے طلبہ کے ساتھ میل جول، تعلیمی مذاکرات اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ طلبہ کے دوروں کو مربوط بنا کر اوراسے تعلیمی سرگرمیوں کا حصہ بنا کر ہی مؤثر کیا جاسکتا ہے۔ وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جائیں، وہاں کلاسوں میں شرکت کریں، مقامی طلبہ سے ملیں، ان سے تبادلہ خیال کریں۔ سیمناروں میں شرکت کریں ، یہاں کے اساتذہ سے سولات کریں تو پھر کہیں جا کر دورے کو مطالعاتی دورہ کہا جاسکتا ہے لیکن جب یہاں گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے کوئی تعلیمی سرگرمی ہی نہیں تو دورے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مطالعاتی دورہ کے نام پر طلبہ کا وفد عمارتوں، شہروں اور بازاروں کی سیر کرتے ہوئے پاکستانی سیاسی ، سماجی اور سفارت

خانوں کے استقبالیوں میں شرکت کرکے تصویریں بنوا کر ایک بقول خود کے، ایک کامیاب مطالعاتی دورہ مکمل کرکے واپس جائے گا اور لاہور ایئرپورٹ کوئی وزیر وفد کا استقبال کرکے میڈیا کو کامیاب دورے کی نوید سنائے گا۔ وزیراعلیٰ وفد کے اعزاز میں استقبالیہ دیں گے اور اپنی کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ سوال پھر وہی کہ وفد نے تعلیمی میدان میں کیا حاصل کیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے علاوہ رمضان المبارک میں وفد دورے پر بھیجنا بھی ناقابل فہم ہے کیونکہ وفد کے اراکین روزہ نہیں رکھتے۔ گذشتہ سال بھی ایک ایسا ہی وفد گرمیوں کی چھٹیوں اور رمضان میں دورے پر آیا تھا۔ اگر دورے کرنا ناگزیر بھی ہے تو کیا اسے رمضان اور گرمیوں کی چھٹیوں کے علاوہ نہیں کیا جاسکتا تھا؟ ایسے دوروں سے آج تک کچھ حاصل نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی واضع تبدیلی آئی ہے۔ اگر ان دوروں سے ملک اور قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تو انہیں بند کرکے وہی رقم اسکولوں، ہسپتالوں، پینے کے صاف پانی، سماجہ بہبود اور سائنسی ترقی پر خرچ کریں۔ خدارا ذاتی تشہیر کی بجائے ادارے مضبوط بنائیں۔ جو قیادت بھی اچھا کام کرے گی عوام اسے یاد رکھیں گے۔ اگر حکومت ذہین بچوں کو ان کی محنت کا کوئی صلہ دینا چاہتی ہے تو انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دے۔ دوروں پر بھیجنے کی بجائے Students Excahnge پروگرام شروع کیے جائیں۔ دور حاضر میں دوسروں کی ترقی دیکھنے کے دورے ہی کرنا ناگزیر نہیں بلکہ اپنے ملک

میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھا جاسکتا ہے اور ایسے ذرائع موجود ہیں، شرط یہ ہے کہ نیت
سیکھنے کی ہو۔

پاکستانی عوام کی حالت کیوں نہیں بدلتی

جب بھی دو پاکستانی آپس میں ملتے ہیں تو وہ ملکی حالات کا رونا روتے ہیں ۔ سماجی تقریبات ہوں یا کوئی بھی اجتماع ہر جگہ لوگوں کا یہی موضوع ہوتا ہے۔ٹی وی پروگرام ہوں، اخبارات کے صفحات ہوں، سوشل میڈیا ہو یا نجی ملاقاتیں ہر جگہ عوام کی گفتگو کا محور پاکستان کی صورت حال ہوتا ہے۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی اس کرب کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ۔ بیرون ملک پاکستانی جب دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اقوام اور وہاں کے خوشحال معاشرہ دیکھتے ہیں جہاں بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتااس پر اُن کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کے اپنے ملک میں بھی اسی سماجی ترقی اور خوشحالی کا راج ہو۔ پاکستانی کی سیاسی جماعتیں اور اُن کے قائدین عوام کو نوید دیتے آرہے ہیں کہ ہم اقتدار میں آکر دودھ اور شہد کی نہریں بہادیں گے اور یہ کردیں گے وہ کردیں کردیں لیکن عوام کی حالات تو نہیں بدلتے یہ ضرور ہے ان کے اثاثوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ نیب کی جانب سے سپریم کورٹ میں میگا کرپشن کی پیش کی جانے والی رپورٹ نے تو سب کچھ صاف ثاہر کردیا ہے کہ ملک کے ۱۵۰ کرتا دھرتا دراصل کرپشن کے بڑے مگرمچھ ہیں۔ عوام جنھیں اپنا مسیحا سمجھتے ہیں وہی ان کے استحصال کا باعث بن جاتے ہیں یعنی بقول میر

میر بھی کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

دیکھنا یہ ہے کہ اصل مسئلہ کی جڑ کہاں ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ قبل اس کے اس بارے میں بات کی جائے اس بات سے ہر ذی شعور اتفاق کرے گا کہ ایک خوشحال، پر سکون اور مثالی معاشرہ ہو یا ملک اس کے لیے تین شعبے نہایت ضروری ہیں۔ وہ تین شعبے تعلیم، صحت اور عدل کے ہیں۔ یہی ترقی اور خوشحالی کی مثلث ہے اور جس ملک اور معاشرہ میں یہ تینوں عوام کے لیے فعال اور دستیاب ہوں وہاں لوگوں کو ذہنی سکون اور بلند معیار زندگی میسر ہوگا۔ اگر صرف عدل ہی موجود ہو تو پھر بھی مملکت کا نظام اس ڈگر پر چلتا ہے کہ پر سکون معاشرہ تشکیل پاتا ہے کیونکہ جہاں عدل نہیں ہوگا وہاں جدل ہوگا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں عدل ہو تو کسی خرابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ عدل کا معنی ہے جو چیز جہاں ہونی چاہیے وہ وہیں ہو۔ کوئی بھی عہدہ ہو یا اختیارات کا استعمال یا زندگی کا کوئی سا بھی شعبہ، ہر جگہ عدل کی حکمرانی ہو۔ اس عدل کا اطلاق عوام پر بھی ہو کہ صرف اہل نمائندے ہی منتخب کریں کیونکہ نااہلوں کو منتخب کرنا عدل کے منافی ہے جسے ظلم سے تعبیر کیا جائے گا۔ ظلم عدل کا متضاد ہے جس کا معنی ہے کہ جس کو جہاں نہیں ہونا چاہیے وہ وہاں ہو۔ جب عوام نااہلوں کو منتخب کریں گے تو وہ خود ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں جس کا نتیجہ انہیں بھگتنا

پڑ رہا ہے لیکن اس کا شکوہ انہیں نہیں کرنا چاہیے اس لیے یہ انھوں نے خود ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔ بات ساری واضع ہو گئی ہے۔اگر عدل اور ظلم کا تصور اچھی طرح سمجھ کر اسے پنا لیا جائے تو معاشرہ کے بڑے بڑے مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ جب عدل اور احتساب کا نظام ہوگا تو نہ ہی کرپشن ہوگی اور نہ ہی اختیارات کا ناجائز استعمال۔ نہ اہل منتخب ہوں گے، نہ لوٹ کھسوٹ، ناجائز دولت اور قتل و غارت ہوگی۔ اب یہ پاکستان کی سپریم کورٹ کا بھی امتحان ہے کہ وہ میگا کرپشن کے اس اسکینڈل پر کیا فیصلہ کرتی ہے۔ عدل ہوتا ہوا نظر آنا چاہیے۔ عدل اس قدر اہم ہے کہ قرآن حکیم میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں عدل، قانون سب کے لیے ایک، بلا امتیاز احتساب، سب کے لیے ایک جیسی صحت عامہ کی سہولتیں، تمام بچوں کے لیے ایک جیسا نظام تعلیم اور مواقع میسر ہوں تو ایک مثالی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ حکومت وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان تینوں شعبوں کی ذمہ داری لے تاکہ عوام کو بنیادی ضروریات میسر ہوں۔ پاکستان میں بھی اگر عوام کو حکومت کی جانب سے صحت اور تعلیم کی یقین دہانی ہو اور ملک میں عدل ہو تو عوام کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوگا۔ حکومت وقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے تعلیم اور صحت کی تمام ذمہ دداری خود لے اور اگر کہیں نجی شعبہکو اس میں مدد بھی لینا پڑے تو وہ بھی حکومت کی ذمہ داری ہو اور عوام پر کوئی بوجھ نہ پڑتا جیسا کہ سویڈن اور اسکنڈے نیویا میں ہے۔

آج کرپشن کے بارے میں بڑی باتیں ہوتی ہیں اور حالیہ میگا کرپشن رپورٹ نے توسب کو ننگا کردیا ہے۔ یہ سب سامنے آنے کے بعد بھی عوام کو پھر بھی عدل کی توقع نہیں کیونکہ ماضی جو ان کے سامنے ہے۔ سال ہا سال مقدمے عدالتوں میں رہنے کے باوجود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ شاہکار رسالت حضرت عمرؓ نے ایک جملہ میں اس کی وضاحت یوں کردی کہ دولت کیسے حاصل کی اور کہاں خرچ کی۔ ان کے اس تاریخی جملہ کو اگر قانون کی شکل دے دی جائے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن حل ہوتا کیوں نہیں ہوتا ۔آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا حکمران اور بالا دست طبقہ ہے جو ان مسائل کو حل کرنا ہی نہیں چاہتا بلکہ اس طرح کے حالات ان کے اپنے مفاد میں ہیں۔ پاکستان کا بالا دست طبقہ ملک میں کبھی تبدیلی نہیں آنے دے گا۔ جس میں ملک کے حکمران، اسٹیبلشمنٹ، Class Elite بالا دست طبقہ سے میری مراد Status quo اعلیٰ عہدوں پر فائز بیوروکریسی، سرمایہ دار، جاگیر دار شامل ہیں جو کے نظام کا حصہ ہیں اور اسے چلارہے ہیں۔ یہ سب مل کر بالا دست طبقہ کی تشکیل کرتے ہیں اور ان کے باہمی مفاد آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طبقہ میں بھی چند ایک لوگ ایسے ضرور ہیں جو باکردار ہیں اور درد دل رکھتے ہیں لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی درست ہے کہ ساری اعلیٰ بیوروکریسی میں سب ایک جیسے نہیں اور ان میں بھی باکردار لوگ ہیں لیکن ان کی حیثیت بحر بیکراں

کے سامنے قطرے کی سی ہے۔ قطرہ سمندر میں مل کر اسی کا حصہ بن جاتا ہے۔ انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس مشین کا حصہ بنناپڑتا ہے جو نظام چلا رہی ہوتی ہے۔یہ وہ طبقہ ہے جو انگریز کے دور کا اشرافیہ تھا اور قیام پاکستان کے بعد سے اب تک عوام پر مسلط ہے۔ عوام روٹی پانی علاج معالجہ اور دوسری بنیادی ضرویات کے لیے ترس رہے ہیں لیکن ملک کا بالادست طبقہ بے حس ہے وہ اس لیے کہ یہ ان کے مسائل ہی نہیں۔ پوش علاقو ں میں رہنے والوں کا پسماندہ علاقوں کے مسائل کیوں حل کریں اس لیے کہ انہیں یہ مسائل تو درپیش نہیں۔ اس طبقہ کو عوام کے مسائل کا علم ہے لیکن وہ اس کا حل نہیں کریں گے۔ یہ طبقہ اس سے بھی آگاہ ہے کہ یورپ میں عوام کو کیا سہولتیں میسر ہیں لیکن یہ طبقہ عوام کے مسائل حل کرنا ہی نہیں چاہتا۔ انہوں نے پاکستان میں اپنے لیے ایک متوازی نظام وضع کر رکھا ہے۔ ان کی رہائش گاہیں ، بچوں کے لیے سکول، علاج کے لیے ہسپتال اور خریداری کے لیے شاپنگ مال الگ ہیں۔ قانون اُن کے گھر کی لونڈی ہے ۔ چھٹیاں گذارنے اور طبّی معائینہ کے لیے وہ بیرون ملک جاتے ہیں۔ عوام ان کے محکوم ہیں اور وہ ان کے حاکم ہیں۔ انہوں نے عوام کے ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ وہ اپنے لیے ان سے بھیک مانگتے رہیں اور وہ یہ تصور راسخ کرنے کے لیے کبھی کبھار ان کی جھولی میں خیرات ڈالتے رہتے ہیں۔ قومی خزانے سے کچھ خرچ کرکے اپنی ذاتی تشہیر کرکے یہ باور کرائیں گے کہ وہ عوام کے بڑے ہمدرد ہیں۔ لوگ لوڈ شیڈنگ اور بنیادی ضروریات کے لیے جتنا چاہیے سراپا

احتجاج بنیں، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس ساری صورت حال کا حل کیا ہے۔ حل ایک ہی عوام اس طبقہ کو ای طرح اپنے سر سے اتار پھینکے جیسے اہل یورپ نے کیا۔ ایک وقت تھا کہ جب یورپی ممالک میں بھی یہی صورت حال تھی جہاں جاگیر داروں، سرمایہ داروں، حکمران طبقہ اور مذہبی پیشوائیت نے تسلط جمایا ہوا تھا جسے یہاں کے عوام نے اتار پھینکا اور آج وہاں سماجی بہبود کا معاشرہ ہے جس کا حصہ بننے کے لیے دنیا بھر کے لوگ امڈھے چلے آتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے عوام کو عدل کی روشنی میں اہل قیادت کو منتخب کرنا ہوگا۔ عوام ان کو منتخب کریں جو عوام کے اپنے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ جو اُن میں سے ہوں، جن کا رہن سہن اور بو دوباش ان جیسی ہو۔ جب تک عوام یہ فیصلہ نہیں کریں گے ان کی حالات کبھی نہیں بدلیں گے اور نہ ہی انہیں اس استحصالی نظام سے نجات ملے گی۔ اگر اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے والوں، قومی دولت کو شیر مادر کی طرح حلال سمجھنے والوں، کرپشن میں تمام حدیں پھلاگنے والوں، خاندانی آمریت چلانے والوں اور عوام کو اپنے محکوم سمجھنے والوں کو منتخب کرتے رہیں گے تو عوام کے حالات کبھی نہیں بدلیں گے۔ فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔

جشن مسرت

دنیا کی ہر قوم اور مذہب کے ماننے والوں نے اپنے لوگوں کے لیے کوئی خاص ایام مقرر کیۓ ہوتے ہیں جنہیں وہ بھرپور طریقے سے مناتے ہیں۔ دور جدید میں ہر مملکت کا قومی دن اور دیگر تہوار اس مملکت کیااہم ایام تصور ہوتے ہیں۔ یہ مذہبی اور قومی تہوار دراصل کسی بھی قوم و ملک کی شناخت اور ملی جذبے کا اظہار ہوتے ہیں۔ کوئی ملک، مذہب یا قوم دنیا میں ایسی نہیں ہوگی جو اس طرح کے مخصوص ایام کی حامل نہ ہو۔ کیا اسلام نے بھی اپنے پیرکاروں کے لیے کوئی تہوار یا ایام مقرر کیۓ ہیں تاکہ مسلمان بھی دیگر مذہب کے ماننے والوں کی کوئی بڑی تقریب مناسکیں۔ ہمارے عیدین کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ اسی تناظر میں مخصوص ایام کی طرح منائی جاتی ہیں۔ عید کی اہمیت اور اس کے شرعی احکام تو بڑے تفصیل کے ساتھ بیان کیۓ جاتے ہیں لیکن یہ وضاحت نہیں کی جاتی کہ ہم عید مناتے کیوں ہیں؟ قبل اس کے ہم دیکھیں کہ قرآن حکیم اس ضمن میں کیا تعلیم دیتا ہے پہلے عید کے لفظ پر غور کرتے ہیں۔ عید بنیادی طور پر عود سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے پلٹ کرآنا یعنی عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا دن۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے اور وہ ہے سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۴ میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے آپ سے عرض کہ اللہ سے التجا کریں کہ

ہمارے لیے آسمان سے ہمارے لیے رزق اتارے جو ہماری جسمانی نشو ونما کے ساتھ اطمینان قلب کا بھی باعث بھی ہو جس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی۔ اس لیے علاوہ عید کے لیے قرآن حکیم میں کوئی اور ذکر نہیں تو پھر وہی سوال کہ ہم عید کیوں مانتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں ارشاد ہے کہ اے نوع انسان ! تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو تمام نفسیاتی امراض کا علاج ہے اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے منزل تک پہنچنے کی رہنمائی ہے۔ اس کے ساتھ اگلی آیت میں فرمایا کہ اے رسول م ﷺ ان کو کہہ دیں کہ اللہ کے فضل اور رحمت سے ایسا ضابطہ حیات ملا ہے کہ تم کیا ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس طرح کا ضابطہ نہیں بنا سکتے لہٰذا اس قدر عظیم نعمت ملنے پر جشن مسرت مناؤ اور یہ اس ساری مال و دولت سے کہیں بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ گویا اس دن منانے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دیا ہے اور اس کی وجہ قرآن حکیم کا ملنا ہے۔ اسی حکم کی کی تعمیل میں ہم نزول قرآن کی خوشی میں رمضان کے بعد عید الفطر مناتے ہیں اور چونکہ قرآن اور صاحب قرآن کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا اس لیے صاحب قرآن کی تشریف آوری پر ربیع الاول میں جشن مناتے ہیں جسے عید میلاد النبی ﷺ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ جشن بھی حکم الہی کی تعمیل ہے۔ عید الفطر یعنی جشن نزول

قرآن اس لیے رمضان کے اختتام پر منایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۵ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو رمضان میں نازل کیا ہے۔ نزول قرآن کا ذکر کرتے ہوئے سورہ قدر میں فرمایا کہ ہم نے اس کتاب مبین کو عظمتوں والی رات میں نازل کیا ہے۔ اس طرح پورا رمضان اس قرآن کی تلاوت، سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں گذرتا ہے اور بعد میں اس کے نازل ہونے کی خوشی میں جشن مسرت عید الفطر کی صورت میں مناتے ہیں۔

یہ ضابطہ حیات جو کہ خدا کا آخری کلام ہے واقعی انسانیت کے لیے بیش بہا اور گراں قدر نعمت ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ یہ کیسے اس قدر اہم ہو سکتا ہے یا کوئی غیر مسلم یہ کہے کہ اس میں تمام نوع انسانی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور اس کے نازل ہونے کو احسان ہے تو مسلمانوں پر ہوگا، غیر مسلم اسے کیوں تسلیم کریں۔ سوال واقعی بہت اہم ہے۔ اس کے جواب کے لیے قرآن حکیم پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ کوئی مذہبی کتاب نہیں جس میں رسمی عبادات کی تفصیل اور ان کا طریقہ کار بیان کیا گیا ہے بلکہ قرآن ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جس کا موضوع انسان ہے اور یہ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرتی ہے۔ اسے یہ باور کراتی ہے کہ یہ کائنات تیرے لیے مسخر کی گئی ہے اور تو مسجود ملائکہ ہے۔ تو اس دنیا پر خدا کی بہترین تخلیق ہے اور کائنات تیرے لیے بنائی گئی ہے تو نہیں جہاں کے لیے۔ انسان نے جب اس

انقلاب آفرین پیغام پر غور کیا تو اُس نے اس دنیا کا انداز ہی بدل ڈالا اور وہ کائنات کی وسعتوں کی تسخیر کرتا چلا گیا۔ تو کیا پھر یہ تمام انسانوں کے لیے عظیم نعمت نہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ وحی انسان کو وہ سب رہنمائی فوری طور پر پیش کر دیتی ہے جس تک انسانی عقل کو پہنچنے میں لاکھوں سال لگیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

اس کتاب عظیم پر عمل کرنے والوں کے علم کی بدولت یورپ کو تاریک دور سے نجات ملی اور مسلمانوں کے سائنسی انداز فکر اور علم سے فیض یابی کرتے ہوئے وہ ترقی کی اس شاہراہ پر گامزن ہوئے جس پر سفر طے کرتے ہوئے وہ آج اس مقام پر موجود ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف خود اہل یورپ کرتے ہیں۔ یورپ کے بادشاہوں اور کلیسا کے پاپاؤں نے قرآن پڑھا اور 788-1200 تک اس کا طرز جہاں بانی اختیار کر کے زمینوں، سمندروں، ہواؤں اور فضاؤں پر چھا گئے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے پانچ سو سال بعد تک عربی یورپ کی علمی زبان اور قرآن یورپ کا ضابطہ حیات رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عربی ہی نوع بشر کی سائنسی زبان رہی ہے۔ اور وہ عربی زبان سیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ بارہویں صدی عیسوی کے فضلائے یورپ کی سوانح عمریوں سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان سب

نے قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ اہل امغرب خود اعتراف کرتے ہیں کہ عظمت کے اعتبار سے کوئی زبان قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی برتری اس کا ذخیرہ الفاظ اور اسلوب ہے۔ اس کی صرفی و نحوی خصوصیات کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں ۔جدید سائنس اور علوم و فنون کو اپنے فہم کے اظہار کے لیے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ عربی میں عبرانی اور آرامی زبانوں سے بہت بہتر تھی ۔ان کے اہل علم مانتے ہیں کہ ہم سائنس کا قرآن سے تعلق قائم کیے بغیر اس کا صحیح ادراک کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ زندگی کا شائد ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس میں قرآن نے مغربی روایات کو مالا مال نہ کیا ہو۔ سائنس طب، صنعت و حرفت، تجارت وایجادات بلکہ سارے علوم کا علمی و فنی ذوق قرآن سے حاصل ہوا ہے۔ اگر جدید سائنسی اصطلاحات سے صرف نظر کر بھی لیا جائے تو قرآن کا زندگی میں جو علمی حصہ ہے اس کی حوالہ جاتی فہرست ہی کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے اور پھر بھی وہ نامکمل رہے گی۔

سائنسپر قرآن کے احسانات کا اہل یورپ اعتراف کرتے ہیں ۔ قرآن نے ایسے سائنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی تصورات دیئے ہیں جس کا ان کی زبان پر اثر پڑا ہے۔

انگریزی زبان میں آج بھی ایک ہزار سے زائد عربی کے الفاظ کی موجودگی اس کامنہ بولتا ثبوت ہے ۔یورپی سائنسدان نے اہل یورپ کو نصیحت کی سائنسی ترقی کے لیے عربی زبان سیکھیں اور مسلمان سائنسدانوں کی کتب پڑھیں۔قرآن سے تمام انسانوں نے بھر پور فائیدا اٹھایا ہے اس لیے ان واضح دلائل کے بعد اب ہونا

تو چاہیے کہ قرآن جیسی عظیم نعمت ملنے پر تمام انسانوں کو مل کر جشن مسرت منانا چاہیے۔

اہل امغرب خود اعتراف کرتے ہیں کہ عظمت کے اعتبار سے کوئی زبان قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی برتری اس کا ذخیرہ الفاظ اور اسلوب ہے۔ اس کی صرفی و نحوی خصوصیات کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کے اہل علم مانتے ہیں کہ ہم سائنس کا قرآن سے تعلق قائم کیے بغیر اس کا صحیح ادراک کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

زندگی کا شائد ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس میں قرآن نے مغربی روایات کو مالا مال نہ کیا ہو۔ سائنس طب، صنعت و حرفت، تجارت وایجادات بلکہ سارے علوم کا علمی و فنی ذوق قرآن سے حاصل ہوا ہے۔ اگر جدید سائنسی اصطلاحات سے صرف نظر کر بھی لیا جائے تو قرآن کا زندگی میں جو علمی حصہ ہے اس کی حوالہ جاتی فہرست ہی کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے اور پھر بھی وہ نامکمل رہے گی۔ سائنس پر قرآن کے احسانات کا اہل یورپ اعتراف کرتے ہیں۔ قرآن نے ایسے سائنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی تصورات دیئے ہیں جس کا ان کی زبان پر اثر پڑا ہے۔ انگریزی زبان میں آج بھی ایک ہزار سے زائد عربی کے الفاظ کی موجودگی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یورپی سائنسدان Roger Bacon نے اہل یورپ کو نصیحت کی سائنسی ترقی کے لیے عربی زبان سیکھیں اور مسلمان سائنسدانوں کی کتب پڑھیں۔ مسلمان سائنس کے میدان

تھے اور آج کی سائنسی ترقی ان کی مرہون منت ہے۔ یہ بات یقین سے Pioneer میں کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کے بغیر انسانی تہذیب اس حد تک نہ پہنچتی جس پر پہنچ کر وہ ارتقاء کی تمام سابقہ حالتوں پر سبقت لے گئی۔قرآن میں ایسے محکم اصول موجود ہیں جن کی بنیاد پر پوری دنیا کے ملکوں اور قوموں کی تشکیل نو ہو سکتی ہے۔ دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ جدید سائنس کا موجد یونان تھا لیکن جدید تحقیقات سے یہ نا قابل تردید حقیقت سامنے آئی کہ یونان نے بعض نظریات ضرور قائم کیے تھے لیکن تجرباتی علم کو عمومی طور پر اختیار کرنا یونانی مزاج کے خلاف تھا۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے معروضی تحقیقات اور تجربی معلومات کو لازم قرار دیا ہے۔

اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن سے صرف مسلمان ہی فیض یاب نہیں ہوئے بلکہ غیر مسلمانوں نے بھی اس فائدہ اٹھایا ہے اس لیے اس کتاب عظیم کے نازل ہونے کی خوشی میں تمام انسانوں کو جشن مسرت منایا چاہیے۔

باب کشمیر

کشمیر جانے کے تاریخی راستہ پر واقع بھمبر شہر جسے بابِ کشمیر بھی کہا جاتا ہے یہ آزاد کشمیر کا سب سے زیادہ میدانی علاقہ رکھنے والا شہر ہے۔ ضلع بھمبر آزاد کشمیر، مقبوضہ کشمیر اور پاکستان کے سنگھم پر واقع ہے اور اپنے اندر صدیوں کی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ یہاں سے گزرنے والے قافلوں کی صدائے بازگشت ابھی بھی فضاؤں میں موجود ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی مشہور توزکِ جہانگیری میں بھمبر کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔وادی کشمیر کو پنجاب سے ملانے والی اہم تاریخی شاہراہ پنجاب کشمیر مغل شاہراہ جسے شاہراہِ نمک بھی کہا جاتا تھا اور بھمبر اُس پر اہم پڑاؤ تھا۔ پنجاب کو وادی سے ملانے والی یہ سڑک بھمبر سے نوشہرہ، راجوری، علی آباد اور شوپیاں سے ہو کر سری نگر پہنچتی تھی۔ مغل اِسی راستے سے کشمیر آتے تھے۔ مغلوں نے اکبرِ اعظم کے دور میں کشمیر پر اپنا تسلط قائم کیا تو ۱۵۸۸ء میں اکبرِ اعظم بھمبر کے راستے ہی پہلی بار کشمیر آیا اور کشمیر کے قدرتی حسن کا اسیر ہو گیا۔ بھمبر کی تاریخی سرائے کو راجہ غنی نے تعمیر کرایا تھا اور اُسے اکبر کے نام سے موسوم کیا۔ گذشتہ دس صدیوں سے آباد اِس شہر میں بہت سی تاریخی عمارتیں اور آثار موجود ہیں جن میں سے اکثر زمانے کی شکست و ریخت اور ہماری لاپرواہی کا شکار ہو چکی ہیں اور اب بس بچے کھچے نشان باقی

ہیں اگر یہی تاریخی ورثہ کسی یورپی ملک میں ہوتا تو مرجع خلائق ہونے کے ساتھ اُن کا انتظام بھی بہت عمدہ ہوتا۔ بھمبر شہر میں مغلیہ دور کی سرائے کے تو آثار بھی ختم کردیے گئے ہیں جبکہ شہر کے مغرب میں واقع مغلیہ دور کی یادگار باولی ایک کوڑے کرکٹ کا مرکز بن چکی ہے یہ وہی تاریخی باولی ہے کہ ہمارے بچپن میں جب بھی کوئی مہمان باہر سے بھمبر آتا تھا تو ہم اُسے یہ دیکھانے کے لیے ضرور لے جاتے تھے۔ بھمبر کی دوسری تاریخی عمارتوں اور دورِ ماضی کے دیگر آثار کی بھی تقریباً یہی صورتِ حال ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار میٹر بلندی پر واقع باغسر کے قلعہ کی بابت معلوم نہیں کہ وہ کس حال میں ہے کیونکہ بھمبر سے مجھے سویڈن آئے ایک مدت ہو چلی ہے اور اِس دوران زیادہ تفصیل سے اُن جگہوں پر جانا نہیں ہو سکا۔

بھمبر کثیر النسلی آبادیوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جہاں ریاست جموں کشمیر کے مختلف علاقوں اور پاکستان سے بھی آئے ہوئے لوگ باہمی محبت و مودت کے تحت آپس میں شیر وشکر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مختلف نسلوں، قبائل اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے ایک پُر امن معاشرہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ بھائی چارہ، برداشت اور تحمل کی جو فضا آج بھی بھمبر میں نظر آتی ہے وہ ملک کے دوسرے علاقوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اگرچہ یہاں کے کچھ سیاسی عناصر نے ماضی میں اپنے سیاسی مفادات کے لیے برادری ازم کے تعصب کو ہوا دیکر اپنے مذموم

مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر انتخابی سیاست کے رخصت ہوتے ہی تعصبات کے وہ بادل بھی چھٹ جاتے رہے اور اب تو لوگوں کو اِس بات کا ادراک بھی ہو چلا ہے کہ یہ محض اُن عناصر کی ذاتی مفاد کے پھیلائی ہوئی نفرت ہے اور اب لوگ اِن تعصبات کے حصار سے نکل رہے ہیں جس سے بھمبر کے معاشرہ میں اور بھی خوبصورتی پیدا ہوگی۔ غمی اور خوشی کے مواقع پر اہلیانِ بھمبریوں اکھٹے ہوجاتے ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے فرد ہوں خصوصا دکھ، غم اور افسوس کے مواقع پر پورا شہر یوں امنڈ آتا ہے جیسے یہ دکھ اُن کا اپنا ہو۔ نفسا نفسی کے اِس دور میں ایسی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی بھمبر ایک شاندار ماضی رکھتا ہے۔ گورنمنٹ پائیلٹ ہائی سکول بھمبر اور ڈگری کالج بھمبر کی مثالی درسگاہوں سے ہزاروں فارغ التحصیل طلبا نے نہ صرف آزاد کشمیر، پاکستان بلکہ دنیا بھر میں عملی زندگی کے مختلف شعبہ جات میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور جب بھی اِن اداروں کے سابق طلبا آپس میں ملتے ہیں ہیں تو اپنے اُس یادگار دور کی یادیں ضرور تازہ کرتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک کے پائیلٹ ہائی سکول بھمبر کی حسین یادیں جب میں وہاں چھٹی سے دسویں کا طالب علم تھا اب بھی نہ صرف ذہن میں تازہ ہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ تڑپا دیتی ہیں۔ یہ امر قابل فخر ہے کہ میرے سکول دور کے ہم جماعت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبہ جات میں نمایاں

کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ میرے ان ہم جماعتوں میں سے ایک قاضی شاہد مقصود ہیں جو پاکستان اٹامک انرجی کمیشن سے وابستہ ہیں اور چند سالوں سے چین میں پاکستانی سفارت خانہ میں سائنٹفک اتاشی کی اہم ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں جبکہ محمد سلیم الیکٹرانکس انجینئر کی حیثیت سے عرب امارات میں ایک اہم ادارے میں فرائض منصبی ادا کررہے ہیں۔ سید اعجاز حیدر بخاری کوپن ہیگن کی بلدیہ عظمٰی کے منتخب کونسلر ہیں اور ساتھ بچوں کو قرآن حکیم کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ مرزا خالد الرحمٰن پاکستان ایئر فورس میں آفیسر ہیں۔ اعجاز بٹ ایک عرصہ دراز سے لیڈز برطانیہ مقیم ہیں اور وہاں ایک اہم ادارہ میں ملازمت کے ساتھ میڈیا میں لکھتے بھی ہیں اس طرح اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ جاوید اقبال طویل عرصہ سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ ایک اور کلاس فیلو راجہ اظہر اقبال ہیں جو آزاد کشمیر پولیس میں ڈی ایس پی ہیں۔ دیگر دوستوں جن میں مدثر بخاری، رانا عبدالحمید، راجہ جاوید اقبال، اظہر حبیب، جاوید اکبر راجہ اور دوسرے کلاس فیلو بھی اپنے اپنے شعبوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ اساتذہ اور ہم جماعتوں میں کئی ایک اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں جن کے لیے مغفرت کی دعا ہے۔ بھمبر ایک مردم خیز سرزمین ثابت ہوا ہے اور اس شہر سے تعلق رکھنے والے سول اور مسلح افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور ملک وملت کا حقیقی سرمایہ ثابت ہوئے ہیں۔ سرزمین بھمبر کو اپنے ان سپوتوں پر فخر ہے۔

نظریہ پاکستان ہے کیا

نظریہ یا آئیڈیالوجی وہ بنیادی تصورات ہوتے ہیں جن پر کسی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔آئیڈیالوجی اپنے اندر شدید قوت محرکہ رکھتی ہے۔اس میں بموں سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔جب ہم نظریہء پاکستان کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ تصورات اور آئیڈیالوجی ہے جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔حصول مملکت کے لیے جس نظام کو منتخب کیا گیا تھا اور نظریہء پاکستان کی وضاحت بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے مارچ انیس سو چوالیس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے یوں کی کہ پاکستان کی بنیاد تو اسی دن پڑ گئی تھی جس دن ہندوستان کا پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔ظاہر ہے جو شخص مسلمان ہوا ہو گا وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر اور اس پر ایمان لا کر اور دائرہء اسلام میں داخل ہوا ہو گا۔چنانچہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد کلمہ طیبہ ٹھہری یہی وجہ تھی کہ قیام پاکستان کے دنوں ہر طرف ایک ہی آواز گونجتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ ۔ یہ کوئی بچوں کا نعرہ نہیں تھا بلکہ بانی پاکستان نے خود اس کی وضاحت کی تھی۔ پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے قائد نے پھر کہا۔میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خود ہندوؤں

سے ایک الگ قوم ہیں۔ہم دونوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں بلکہ ہماری تاریخ اور ثقافت بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ایک قوم کے ہیرو دوسری قوم کے ولن ہیں۔ مسلمان دیگر مذہب کے ماننے والوں سے الگ قوم ہیں۔اس کا عملی اعلان رسول پاک نے اعلان نبوت کے بعد کر دیا تھا۔ کہ ابو جھل اور ابو لہب زبان و نسل ،وطن ثقافت اور کئی ایک جیسی چیزوں کے اعتبار رسول پاک سے الگ قوم کے افراد تھے۔ جبکہ سلمان فارسی صہیب رومی اور بلال حبشی مختلف زبان و نسل اور کلچر رکھنے کے باوجود اسی قوم کے فرد تھے۔جس کے ابو بکر اور حضرت علی تھے۔اسی دو قومی نظریہ کا اظہار جنگ بدر کے موقع پہ ہوا۔اور یوم فرقان نے واضح کر دیا کہ دنیا میں قوم کی بنیاد رنگ نسل اور کلچر پہ نہیں بلکہ مشترکہ نظریات تصور حیات اور دین پر ہے۔ اسی تصور کو سر سید احمد خان نے برصغیر میں واضح کیااور قیام پاکستان کی پہلی اینٹ انہوں نے 24 مئی 1875 میں رکھی ۔ پھر سر سید نے یہ شمع سیالکوٹ کے فرزند اقبال کے ہاتھوں میں دی۔ یہ وہی اقبال تھا جو پہلے خاک وطن ہر ذرے کو آفتاب کہتا تھا۔اور اپنے نیشنلسٹ ہونے پر نازاں تھا پھر اسی اقبال نے اس نظریے کو رد کر دیا اور کہا کہ

ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن ہے جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

جب عالمگیر انسانیت کو وطن کی بنیاد پر تقسیم کیا جانے لگا تو علامہ اقبال نے واضح طور پر رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ور انہوں نے قومیت کا وہی واضح تصور دیا جس پر ایمان لا کر کوئی مسلمان کہلاتا ہے۔

انہں نے مزید کہا کہ

اپنی ملت سے قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ایک طرف سر سید اقبال اور جناح دین کی بنیاد پر قومیت کی وضاحت کر رہے تھے تو دوسری طرف کچھ نام نہاد مسلمان رہنماء جن میں علماء بھی شامل تھے اس نظریہ کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے ہندوؤں کی ہمنوائی میں قوم کی بنیاد وطن کو قرار دے رہے تھے۔اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ہی قوم کا فرد کہہ رہے تھے۔انہی میں سے ایک مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے۔ جو کہہ رہے تھے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔علامہ اقبال اس وقت بستر مرگ پہ تھے اور انہوں نے اپنا آخری معرکہ وہیں سے لڑا۔جب انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی آواز سنی تو ان کے دل سے ایک چیخ نکلی اور کہا کہ

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود.بر سر ملت کہ منبر از وطن است چہ بے خبر از مقام محمد عربی است

مصطفیٰ.برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

نہائیت قابل غور الفاظ ہیں۔علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ رسول پاک کے مقام سے بے خبر ہو کر یہ کہا جا رہا ہے کہ ملت یعنی قوم وطن کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔حالانکہ یہ رسول پاک کی نسبت سے بنتی ہے۔اور ابھی تک وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں پائے۔یہی نظریہ قیام پاکستان کی بنیاد بنا اور قرآن حکیم نے تو یہ اعلان کر دیا ہے کہ جب مومنین کو زمین پر اختیار ہوتا ہے تو نظام صلواۃ وزکواۃ قائم کرتے ہیں۔(24 / 11)اس سے مراد وہ مملکت ہے جو اسلامی نظریہ سے تشکیل پاتی ہے۔ورنہ نماز ادا کرنے اور زکواۃ دا ہونے کی اجازت تو ہر غیر مسلم ملک میں بھی ہے۔اس لیے زمین پر اختیار کی ضرورت نہیں۔قیام پاکستان کے بعد قائدا عظم نے بھی بہت سے مواقع پر یہ کہا کہ ہمیں قرآن حکیم سے رہنمائی لینی چاہیے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظریہ کو پھر سے اجاگر کیا جائے تاکہ نوجوان نسل اس سے آگاہ ہو سکے کیونکہ بہت سے عناصر مملکت خداداد کی نظریاتی بنیادوں کو مسمار کرنے کے درپے ہیں۔اور بانی پاکستان کو سیکولر شخصیت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جسے وہ سیکولر جناح کہتے ہیں اور ان کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ کی تقریر کی غلط تعبیر لیتے ہیں۔میں ان پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تقریر کے بعد قائدا عظم تیرہ ماہ زندہ رہے۔اس کے بعد کی تقریروں میں قائد بار بار قرآن سے رہنمائی اور نظریہ پاکستان کی وضاحت کرتے رہے لیکن قائدا عظم نے کسی ایک موقع پر بھی یہ نہیں کہا تھا کہ

پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگی۔ کوئی اس بارے میں ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔
اگست 1947 میں انہوں نے اقلیتوں کے حقوق کا کرتے ہوئے انکے تحفظ کا یقین 11
دلایا تھا مگر اسکا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ اپنے اس نظریہ سے روگردانی کر چکے تھے
جس کے تحت انہوں نے جدو جہد کی۔ بعض ناقدین یہ بھی کہتے ہیں کہ قائد اعظم نے
حصول پاکستان کی خاطر اس نظریے کو اپنایا اور بعد میں اسے ترک کر دیا۔ یہ بھی حقائق
کے منافی ہے۔ چودہ اگست انیس سو اڑتالیس کو پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے
پیغام میں انہوں نے پاکستان کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کہا۔ پھر اس سے پہلے
جولائی انیس سو اڑتالیس میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے
اپنے خطاب میں قرآن سے رہنمائی لے کر مملکت کا نظام چلانے کی پالیسی بیان کی اور یہ
تقریر آج بھی اپنے الفاظ کے ساتھ محفوظ ہے۔ سیکولرازم کے پیامبروں سے میری یہ
درخواست ہے کہ کیا وہ کوئی ایسی تحریر یا اسٹیٹ منٹ پیش کر سکتے ہیں جس میں جناح
نے یہ کہا ہو کہ وہ ایک سیکولر اسٹیٹ کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں یا یہ کہ پاکستان ایک
سیکولر اسٹیٹ ہے۔ دراصل ان لوگوں کو سیکولرازم کے معنی ہی معلوم نہیں۔ انہیں
چاہیے کہ پہلے لغت میں سیکولرازم کے معنی پڑھیں۔ سیکولرازم میں وحی، رسالت اور
حدود اللہ نہ کوئی تصور ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اہمیت تو پھر ایک مسلمان کیسے سیکولر
ہو سکتا ہے۔ مشہور مسیحی رہنماء

مسٹر جوشوا فضل دین نے اپنے پمفلٹ Rational of pakistan constitution میں قائدِ اعظم کی گیارہ اگست انیس سو اڑتالیس کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کہہ دینا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائدِ اعظم نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے کہ جس سے اس بات کا مکان ہے کہ پاکستان کی بنیاد مہندم ہو جائے گی بالکل پاگل پن ہے قائد اعظم نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ مختصر الفاظ میں نظریہء پاکستان اور قائد کے اقوال کے مطابق ایسی مملکت تھی جس میں آزادی اور پابندی کی حدود قرآن کی رو سے معین ہوں گی۔جس میں کوئی قانون قرآن کے منافی نہ ہو اور نہ ہی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری ہوگی اور نہ ہی تھیا کریسی۔ مملکت کا جمہوری اور معاشی نظام سچے اسلامی اصولوں اور اسوہء حسنہؐ کے مطابق ہوگا۔ قوم کے جس تصور کی تشریح سر سید، اقبال، چوہدری رحمت علی اور جناح نے کی اس کے مطابق قوم کی بنیاد خطہ زمین کی نسبت سے نہیں بلکہ مشترکہ نظریہء حیات کی بنیاد پر بنتی ہے۔ لہٰذا پاکستانی قوم کی اصطلاح بھی دو قومی نظریہ اور نظریہء پاکستان کے منافی ہے۔ پاکستان میں رہنے والے اس کے شہری ہونے والے اس کے حقوق اور مراعات تو لے سکتے ہیں۔وہ پاکستان کے شہری تو ہیں لیکن تمام پاکستانی ایک قوم کے فرد نہیں۔اگر ہم آج تمام پاکستانیوں کو ایک قوم مان لیں تو نظریہء پاکستان خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نوجوان نسل کو قومیت کی بنیاد اور مملکت خداد کے

نظریہ سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان عناصر کا سدباب کیا جاسکے جو حقائق اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔

عدلیہ جمہوریت اور دوٹوک باتیں

پاکستان میں مروجہ سرکاری ملازمت کے نظام میں اگر کوئی اپنا نہ صرف دامن بچا کر نکل جائے بلکہ فرض شناسی، حب الوطنی، ایمان داری، قانون کی پاسداری اور بااصول ماضی پیچھے چھوڑ کرجائے تو یہ واقعی قابل صد تحسین ہے۔ مزید یہ کہ کوئی عام ملازمت نہ ہو بلکہ محکمہ پولیس ہو جس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اور اس میں ایک طویل عرصہ مختلف اہم ذمہ داریوں پر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے سب سے بڑے عہدے آئی جی تک پہنچنے تک ایک بے داغ عرصہ ملازمت رکھتا ہو تو تعریف تو کرنا ہی پڑے گی۔ یہ کوئی اور نہیں ذوالفقاراحمد چیمہ کی شخصیت ہے۔ پولیس سروس میں درخشاں مثال قائم کرنے کے بعد جب کالم نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے وہ اس میدان میں سکہ بٹھانے چلے آئے ہیں۔ اسلام، رسول پاک ﷺ، علامہ اقبال اور پاکستان سے محبت اُن کی ہر تحریر میں جھلکتی ہے۔ جب اُن کی کتاب دوٹوک باتیں شائع ہوئی توپڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ پاکستان سے آنے والی اپنی ایک عزیزہ سے کتاب کی فرمائش کی جو وہ اپنے ساتھ لے آئیں۔ میرے دوست زمان خان نے میرے مطالعہ کرنے سے سے پہلے ہی کتاب پڑھ ڈالی۔ پوچھا کیسی کتاب ہے۔ کہنے لگے بہت اچھی کتاب ہے لیکن اس کا نام دوٹوک باتیں نہیں، سفرنامے ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پوچھا وہ کیوں۔ کہا کہ میں تو دوٹوک

باتوں کی جستجو میں ورق گردانی کرتا رہا مگر اس میں دو ٹوک باتیں تو کوئی نظر نہیں آئیں۔ مصنف نے واقعات میں عام لوگوں کا نام اور تفصیلات تو لکھ دی ہیں لیکن جب کسی واقعہ میں کوئی بڑی شخصیت کا نام ہے ہے وہاں سے وہ کنی کترا کر نکل گئے ہیں اس لیے اس کتاب کا عنوان دو ٹوک باتیں مناسب نہیں لگتا۔

بحر حال جب کتاب پڑھنی شروع کی تو محسوس ہوا کہ ذوالفقار چیمہ نے یہ کتاب بڑے درد دل کے ساتھ لکھی ہے جس میں ایک عام محب وطن پاکستانی کے دل کی آواز سُنی جا سکتی ہے۔ انہوں نے خود اپنے محکمہ کی خامیوں، سرکاری ادراوں کی بے عملی، اقربا پروری، لوٹ کھسوٹ اور دوسری کئی برائیوں اور مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں امید کا پیغام دیا ہے۔ اپنے دین، مذہب، ملک اور اچھی روایات پر فخر کا درس دیا ہے۔ فکر اقبال اُن کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے جس کا عکس ان کی تحریروں میں دیکھائی دیتا ہے۔ معاشرہ میں عزت کا جو معیار بن چکا ہے اس حوالے سے جو مختلف واقعات انہوں نے پیش کیے ہیں وہ بھی برملا ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ہونے والی فضولیات اور میڈیا کی مادر پدر آزادی کو انہوں خوب آڑے ہاتھوں لیا جس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ البتہ اعتراض ان کے صفحہ ٦٠ پر تحریر کردہ تجزیئے سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے ملک میں عوام کو اپنے حکمران بنانے اور ہٹانے کا حق حاصل ہے

ہمارے ملک میں عدلیہ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد اور طاقتورادارہ ہے، اور اسے حکم ’’
‘‘سے بڑے بااثر بشمول وزیر بھی گرفتار ہو رہے ہیں

میں یہ تجزیہ پڑھ کر حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا کہ کیا پاکستان میں واقعی ایسا ہوگیا۔ اگر وہاں عوام کو اپنے حکمران بنانے اور ہٹانے کا اختیار حاصل ہے تو پھر سیاسی بے چینی، دھرنے، آمرانہ حکومتیں، انتخابی دھاندلیاں اور جو ہر روز رونا رویا جاتا ہے وہ کیا ہے۔ عوام کہاں اپنا حق استعمال کرتے ہیں اور کس طرح حکومت بناتے اور ہٹاتے ہیں سمجھ سے بالاتر ہے۔ عوام تو سیاسی جماعتوں کو بھی خود نہیں بناتے۔ پاکستان کی کس سیاسی جماعت میں جمہوریت ہے۔ پاکستان کی کس جمہوری حکومت نے بلدیاتی انتخابات کرائے۔ کیا انتخابی امیدواروں کو ٹکٹ کی عوام کی مرضی سے ملتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہوتی کہ پاکستان میں عوام کو اپنے حکمران بنانے اور ہٹانے کا اختیار ہوتا تو آج ملک کی تقدیر مختلف ہوتی۔ فاضل مصنف بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں اسی لیے کتاب کے آخر میں صفحہ ۲۸۴ پر وہ اس کے بالکل برعکس اور متضاد لکھتے ہیں اور یہاں انہوں نے حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض اُن کا یہ لکھنا کہ ’’ہمارے ملک میں عدلیہ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد اور طاقتورادارہ ہے، اور اسے حکم سے بڑے بااثر بشمول

وزیر بھی گرفتار ہو رہے ہیں'' ممکن ہی سرکاری ملازمت آڑے آ رہی ہو اور وہ ایسے لکھ گئے ہوں لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کاش ایسا ہی ہوتا جو انہوں نے لکھا ہے ۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو پاکستان آج ایسا نہ ہوتا جو ہمارے سامنے ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان کے حالات کی ابتری کی سب سے بڑی وجہ وہاں کی عدلیہ ہے۔ اگر وہاں کا عدالتی نظام ہی عدل پر مبنی ہوتا تو آج کا پاکستان بہت مختلف ہوتا۔ عدالتی فیصلوں میں تاخیر، عدل کے منافی فیصلے اور عدم عمل درآمد نے سسٹم کو ناکارہ اور عوام کے لیے پریشان کن بنا رکھا ہے۔ پاکستان میں عدلیہ سے انصاف لینے کے لیے عمر خضر، صبر ایوب اور دولت قارون چاہیے۔ پارلیمنٹ کی جانب سے فوجی عدالتوں کے قیام اور خود سپریم کورٹ کی جانب سے اس پر مہر تصدیق ثبت ہونے سے وہاں کے عدالتی نظام پر عدم اعتماد ثابت ہوگیا ہے۔ اگر پاکستان کی عدالتیں بغیر دباؤ کے فیصلے کرتیں تو فوجی عدالتوں کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کی تقرری کا طریقہ کار خود انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ ماضی بعید کو چھوڑیے حال ہی میں عدلیہ میں جو مقدمے گئے ہیں اُن کا کیا بنا ہے۔ ایان علی، سانحہ ماڈل ٹاؤن، نندی پور، میمو گیٹ اسکینڈل، رینٹل پاور، این آئی سی ایل، حدیبیہ پیپر مل، اصغر خان کیس، ارسلان افتخار کیس اور نیب کی جانب سے ۱۵۰ کرپٹ ترین افراد کو عدلیہ نے کون سی سزا دی۔ عدلیہ کے بارے تفصیلات تو اتنی زیادہ ہیں کہ ایک کالم کیا کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں ۔

یہاں بھی چیمہ

صاحب نے آگے جا کر صفحہ ۱۶۳ اپنے موقف پر نظر ثانی کر لی ۔ توقع ہے کہ اہ اگلے ایڈیشن میں وہ اس تجزیہ کو کتاب سے حذف کر کے اپنے اس موقف کو اپنائیں گے جو انہوں نے بعد میں تحریر کیا ہے۔

متناسب نمائندگی، بلدیاتی انتخابات، پارلیمنٹ کی چار سالہ مدت، صوبائی خود مختاری، ایف آئی اے کو غیر جانبدار بنانا اور بیرون ملک پاکستانی سیاسی جماعتوں کی شاخیں کھولنے پر پابندی جیسی تجاویز بالکل درست ہیں لیکن دوہری شہریت کے حامل پاکستانیوں کو اپنے آبائی ملک میں Public Office کے لیے نااہل قرار دینے کے تجویز قانون اور عدل کے تقاضوں کے منافی ہے۔ جب دوہری شہریت والوں پر وطن ثانی میں ایسی کوئی پابندی نہیں تو آبائی وطن میں ایسی پابندی Discrimination ہے۔ جب پاکستان پر کوئی آفت آتی ہے تو انہی دوہری شہریت والوں کو کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستانی ہیں آگے آئیں اور مدد کریں لیکن جب دینے کا وقت آتا ہے تو کہا جاتا کہ آپ غیر ملکی ہیں۔ جب پاکستان کو ضرورت ہوتی ہے اُس وقت ہمیں کیوں غیر ملکی نہیں کیا جاتا بلکہ ایک کام کریں دوہری شہریت کا قانون ہی منسوخ کردیں تاکہ جو جہاں رہ رہا ہے وہ وہیں کا ہو کر رہے اور دو کشتیوں کی سواری کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔

فرض اور نفل

کسی بھی لکھنے والے کے لیے قارئین کی طرف سے ستائش اور پذیرائی نہ صرف حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہے بلکہ وہ مزید توانائی اور جذبہ محرکہ کا باعث ہوتی ہے جس سے نہ صرف لکھنے میں تسلسل رہتا ہے بلکہ مزید بہتری آتی ہے۔ اور اگر یہی ستائش علم و ادب کی دنیا کے کسی معروف نام کی طرف سے ہو تو پھر اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ میرے لیے یہ امر باعث مسرت و اطمینان ہے کہ بہت سے معروف کالم نگاروں اور اہل علم نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے لکھنے کا یہ سلسلہ اپنی تمام تر پیشہ وارانہ اور دیگر مصروفیات کے باوجود جاری ہے۔ انہی میں سے ایک نام پروفیسر محمد شریف بقا کا ہے۔ ان کے علمی و تحقیقی کام کی بدولت کون ہے جو انہیں نہیں جانتا۔ قرآنی تعلیمات، تحریک پاکستان، فکر اقبال، حیات قائد اعظم اور دوسرے بہت سے موضوعات پر اُن کی ساٹھ سے زائد کتابیں نہ صرف چھپ چکی ہیں بلکہ انہیں مقبولیت عام حاصل ہے۔ ان کی کئی کتب اور اخبارات میں کالم پڑھنے کے بعد میری خواہش تھی کہ اُن سے رابطہ ہوسکے تاکہ اُن کے علم سے مزید استفادہ کیا جاسکے کہ اچانک ایک دن ان کا فون آگیا جو میرے لیے باعث حیرت اور خوشی تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اخبارات میں میرے کالم پڑھنے کے بعد

انہوں نے خود ہی اخبار کے دفتر سے میرا ٹیلی فون نمبر لیا اور اب بات کر رہے ہیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی ستائش اور ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔

پروفیسر محمد شریف بقاایک ہمہ جہت شخصیت اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ بلا شبہ نابغہ عصر ہیں۔ ایسا شاذو نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص میں بہت سی صلاحتیں اور خوبیاں یکجا ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں محقق، قرآنِ حکیم کے عالم، تاریخ دان، شاعر، بچوں کے مصنف، بلند پایہ صحافی، عالمِ دین، ماہرِ اقبالیات، تحریک پاکستان کے مستند مورخ، کالم نگار، مقرر، دانشور اور ادیب ہیں۔ علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک طالب علم اُن کی شخصیت اور کام کے بارے میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے اور اس نے اپنا تحقیقی مقالہ جمع کرادیا ہے۔ یہ میرے لیے بہت بڑی سعادت ہے کہ میں اُن کے لیے کچھ الفاظ ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔ متذکرہ بالا تمام خوبیوں ایک طرف سب سے بڑھ کر کہ وہ بہت ہی انسان دوست، مہمان نواز، ملنسار اور درویش انسان ہیں۔ بہت سے معروف لوگوں کو جب قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے تو اکثر اوقات اُن کی نجی زندگی میں اُن افکار کی کہیں جھلک نہیں ہوتی جسے تو عام زندگی میں زبان پر لاتے ہیں لیکن شریف بقااس سے مبرا ہیں۔ اُن سے ملنے کے بعد اُن کی شخصیت میں وہی کرادر نظر آیا جس کے وہ نقیب ہیں۔ جب بھی مجھے لندن جانا ہوتا ہے، محترم بقا صاحب سے ملاقات لازم ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اپنی تمام تر مصروفیات

کے باوجود وہ بہت خوش دلی سے نہ صرف ملتے ہیں بلکہ سنتِ ابراہیمؑ کی پیروی میں باہر تک چھوڑنے آتے ہیں۔ منکسر المزاجی اور خوش گفاری اُن کی خوبیاں ہیں۔ اُن کی محفل میں کسی کو بوریت نہیں ہوتی اور ہر عمر اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کے ساتھ وہ دوستانہ ماحول میں گفتگو کرتے ہیں۔

آپ علامہ اقبال کے سچے شیدائی اور پیامبر اقبال ہیں۔۔برطانیہ اور یورپ میں فکر اقبال کو روشناس کرانے کے لئے انہوں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجلس اقبال لندن ان کی سربراہی میں علامہ کے پیغام کو عام کررہی ہے۔۔برطانیہ میں پروان چڑھنے والی ہماری نئی نسل چونکہ اردو سے دور ہوتی جارہی ہے اس لئے انہوں نے کلام اقبال اور فکر اقبال کو انگریزی زبان میں بہت سی کتابوں کی صورت میں لکھ دیا ہے تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی پیغام اقبال سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ علامہ اقبال کے پیغام اور فکرِ اقبال کو سمجھنے کے لیے اُن کی تصانیف بہت ہی اہم ہیں۔ کلامِ اقبال اور خطبات اقبال کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دے کر انہوں نے اقبال فہمی کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ خطباتِ اقبال پر بہت سی کتب موجود ہیں مگر آپ نے علامہ کے خطبات کو جس سہل اور دلنشین انداز میں اور قارئین کی سہولت کے لیے مضامین کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے وہ سب سے منفرد ہے۔ تحریک پاکستان اور قائدِ اعظم کی زندگی پر بہت تحقیقی کام کرکے ایک عظیم سرمایہ مہیا کردیا ہے۔ جن لوگوں کو شائد

سیکولرازم کے معنی بھی معلوم نہیں وہ بھی قائدِ اعظم کو سیکولر قرار دینے پر تُلے ہوئے ہیں مگر آپ نے اپنی کتاب قائدِ اعظم کے اسلامی افکار لکھ کر ایک طرف اُن سب کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے اور دوسری جانب نئی نسل کو اصل صورتِ حال سے روشناس کرایا ہے۔ مصورِ پاکستان اور بانی پاکستان کے ساتھ ساتھ آپ نے نقاشِ پاکستان چوہدری رحمت علی کی قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد اور خدمات کے کئی گمشدہ گوشے بھی ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ چوہدری رحمت علی کی پاکستان موومنٹ ہی تھی جس نے اسلامیان ہند کی منزل کا تعین پاکستان کی صورت میں کیا تھا۔

دورِ حاضر میں بچوں کے ادب کے لیے بہت ہی کم کام ہو رہا ہے اور مستقبل کی نسل کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ معروف ادیب اور لکھاری تو بچوں کے لیے لکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن پروفیسر شریف بقا نے اس اہمیت کو سمجھتے ہوئے مستقبل کے معماروں کے لیے بہت عمدہ، آسان اور معیاری لکھا ہے۔اردو زبان نہ سمجھنے والے بچوں کے لیے انھوں نے کلام اقبال بالخصوص علامہ کی بچوں کے بارے نظموں کی انگریزی میں وضاحت کرتے ہوتے متعدد کتب لکھی ہیں۔ جب میں نے بچوں کے لیے اسلامی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تو انھوں نے بہت مفید مشورے دیے اور انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے پر زور دیا۔ اگر میری جانب سے بچوں کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی کہانیوں کی کتاب منظرِ

عام پر آئی تو اس میں آپ کی مساعی شامل ہوگی۔

اسلام، رسول اکرمؐ اور قرآنِ حکیم پر آپ نے نہایت اہم کتب لکھی ہیں۔ اس فرقہ واریت کے دور میں آپ نے جس انداز سے لکھا ہے وہ بلا شبہ قابل تحسین ہے۔ وہ نہ صرف یورپ میں پروان چڑھنے والی نوجوان نسل کی سوچ اور یہاں کے مسلمانوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ اُنہوں نے فکری رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ مغربی مفکرین کی رسول پاکؐ کے بارے میں آراء پر مشتمل اُن کی انگریزی میں ایک لاجواب کتاب ہے۔ قرآنی موضوعات اور Quranic Topics قرآنِ حکیم کو تصریف آیات کے اصول سمجھنے کے لیے ایسی کتب ہیں کہ ان کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔ سویڈن میں آٹھ سال سے قرآنِ حکیم کو مضامین کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش سٹاک ہوم سٹڈی سرکل کے تحت ہورہی ہے اور ماہانہ درس قرآن منعقد کیا جاتا ہے۔ قرآن فہمی کی کوشش میں آپ کی کتب نہایت مددگار ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر جب بھی کسی مسئلہ کی وضاحت درکار ہو تو آپ سے ہی رجوع کرتا ہوں اور کئی معاملات میں اگر اختلافِ رائے بھی ہو تو انہوں نے بڑے تحمل سے بات سُنی اور انہوں نے کبھی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو عمرِ خضر دے تاکہ وہ ہمارے لیے مزید علم کے موتی بکھیرتے چلے جائیں۔ اکیاسی سال عمر ہونے کے باوجود وہ اب بھی علمی و تحقیقی کام اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے باوجود وہ اپنے اہل خانہ

اور گھریلو معاملات میں عدم توجہی کا شکار نہیں۔جب اس بارے میں اُن سے بات ہوئی تو انہوں نے جو وضاحت کی وہ میرے بلکہ سب کے لیے مشعل راہ ہے، کہاکہ تحریر و تقریر اور گھر سے باہر دوسرے جتنے بھی کام ہیں وہ اُسی طرح ہیں جیسے عبادت میں نوافل ہوتے ہیں جبکہ گھر اور اہل خانہ کی ذمہ داریاں فرائض ہیں۔ فرائض کے بارے میں بارگاہ خداوندی میں پوچھا جائے گا لیکن نوافل کے بارے میں سوال نہیں ہوگا اسی لیے میری پہلی ترجیح میرے فرائض ہیں یعنی میری بیوی بچے اور اہل خانہ ہیں۔ اُن کی اہلیہ کی عمر اسی سال ہے۔وہ کچھ عرصہ سے کافی علیل ہیں اور بستر پر ہی ہیں۔ بقا صاحب کہنے لگے اُن کی تیمار داری میں کبھی غفلت یا سُستی نہیں۔ وہ ہسپتال میں ہوں یا گھر پر ہمیشہ اُن کی خوش دلی سے خدمت کرتا ہوں اور بعض اوقات وہ رات کو بھی اٹھائیں تو کبھی ناگواری نہیں ہوتی۔ اپنی اہلیہ کی صحت کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیرونی مصروفیات محدود کردی ہیں۔ علم و کردار کی جو یکجائی بقا صاحب میں نظر آئی وہ ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ ہمارے رسول پاک ﷺ نے بھی تو یہی فرمایا ہے کہ تم میں سے جو جس کا نگہبان ہے اُس سے اس ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ رحمت عالمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ فرض اور نفل کی اس تقسیم کو اگر ہم سمجھ پائیں تو ہمارے گھر جنت کا نمونہ بن سکتے ہیں۔

چونڈہ تو آباد رہے گا

چونڈہ میرا آبائی قصبہ ہے۔ 1947 ء میں میرے والد اور دادا جموں سے ہجرت کرکے چونڈہ آ کرآباد ہوئے۔ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل پسرور کے اس قصبہ کو دنیا میں شہرت حاصل شہرت عام ستمبر 1965 کی پاک بھارت جنگ میں بلیجب یہ بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بنا۔ دوسری عالمی جنگ میں کورسک کے مقام پر جرمنی اور روس کے درمیان ہونے والی لڑائی کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی سرزمین چونڈہ پر لڑی گئی۔ چھ سو ٹینک اس لڑائی میں بدمست ہاتھیوں کی طرح برسرپیکار تھے۔ دشمن کے ایک سو بیس ٹینک یہیں تباہ ہوئے اور کئی ہماری شیر دل فوج کے قبضہ میں آئے۔ تین گنا سے زائد بھارتی فوج اور اُس کے بھی وہ دستے جسے وہ بھی فخر ہند کے نام سے موسوم کرتے تھے اس محاذ پر تھے لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود ناکام رہی اور چونڈہ ناقابل تسخیر رہا۔ پاک فوج کے جانبازوں نے بے مثال قربانیوں جو تاریخ چونڈہ کے محاذ پر پیش کی وہ چشم فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور جب بھارتی فوج اور وزیر اعظم نے دیکھا جنگ بندی میں ہی عافیت جانی۔ بھارتی ٹینکوں کے حملہ کو پسپا کرنے کے لیے پاک فوج کے پاس ٹینک شکن ہتھیار کی قلت تھی۔ پاک فوج کے جوان اپنے سینوں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے اور وہ میدان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔ ایف ایف اور بلوچ

رجمنٹ کے جوانوں نے پاک وطن کے دفاع میں اپنے خون سے جو تاریخ رقم کی وہ کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔ وہ واقعی سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ چونڈہ اور اس سے ملحقہ پھلورہ، بھاگوال، گڈگور، ظفر وال، ٹھرو منڈی، چوبارہ، اور خانے والی اس لڑائی کا میدان کارزار تھے۔ اس علاقے مکین بھی بھارتی فواج سے خوف ذدہ نہ ہوئے۔ چونڈہ کے بہت سے مکانات دشمن کی گولہ بھاری کی زد میں آئے جن میں ہمارا آبائی گھر بھی تھا۔

چونڈہ کے محاذ پر میجر جنرل ابرار حسین کی قیادت میں وطن عزیز کو دفاع کیا اور دشمن کا جی ٹی روڈ پر قبضے اور سیالکوٹ کو لاہو سے کاٹنے کا منصوبہ نہ صرف ناکام ہوا بلکہ دشمن کا عددی برتری کا گھمنڈ چونڈہ کی خاک میں مل گیا

اور ہماری افوج نے اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج کی پیش قدمی روک دی۔ یہ پاک فوج کا جوش جہاد تھا جسے تائید ایزدی حاصل تھی جس کی بدولت دشمن کا منصوبہ ناکام ہوا بصورت دیگر اگر چونڈہ کے علاقے تو دیکھیں تو یہ بالکل میدانی علاقہ ہے جس میں کوئی قدرتی رکاوٹیں نہیں اور ٹینکوں کی لڑائی کے موزوں ہونے کے ساتھ فوج کی پیش قدمی کے لیے آسان ہے۔ اس محاذ کے ہیرو کرنل نثار احمد خان اور اُن کی یونٹ تھی جس نے دشمن کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ پھلورہ چونڈہ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور یہ اس علاقے کا پولیس اسٹیشن ہے۔ گیارہ ستمبر کو پھلورہ پر قبضہ کے بعد دشمن کی پوری کوشش تھی کہ اب چونڈہ اور اس کے ریلوے اسٹیشن پر قبضہ کیا جائے۔ چونڈہ اس علاقہ کا سب سے بڑا قصبہ ہے اور اگر اس قبضہ ہو جاتا تو لاہور سیالکوٹ ریلوے لائن بھی دشمن افواج کے پاس چلی جاتی اور وہ مزید پیش قدمی کر سکتی تھی۔ چودہ اور پندرہ ستمبر کو بھارتی افواج نے چونڈہ پر قبضے کے لیے بھرپور حملے کئے لیکن وہ ناکام رہے اور بائیس ستمبر تک دشمن کی کوششیں ناکام ہوئیں اور چونڈہ پر پاک پرچم لہراتا رہا۔ پاک فوج نے بھارتی افواج سے ظفروال کا علاقہ بھی واپس لے لیا۔

بہت سے ہمارے اپنے لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ بھارت کے ساتھ جنگ نہیں ہونی چاہیے بلکہ دونوں ممالک امن اور سلامتی رہیں اور باہمی تجارت کو فروغ دینا

چاہیے۔ ہم بھی امن چاہتے ہیں اور جنگ کے متمنی نہیں لیکن کیا ظلم، زیادتی اور دوسروں کے خلاف جارحانہ کاروائیوں کے تسلسل میں امن اور دوستی ممکن ہے۔ پاک بھارت میں امن، دوستی اور تجارت کی دہائی دینے والوں سے گذارش ہے کہ ایک آپ خود ایک اصول طے کریں اور پھر اُس کی روشنی میں امن اور دوستی کی جانب بڑھیں اور اس بات کا فیصلہ کریں کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک کس ملک نے برصغیر میں امن کی آشا کو مجروح کیا ہے۔ کس نے ناجائز اور جبراً قبضہ کرکے اپنا رقبہ بڑھایا ہے۔ کس نے جمہوری روایات کا پامال کرکے عوام کے حق خودآاری سے محروم کیا ہوا ہے۔ کس نے بین الاقوامی قانون اور اقوام عالم سے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کئے۔ کس نے بین الاقوامی اصولوں کو روندتے ہوئے دوسروں کی علیحدگی کی تحریکوں کی پشت پناہی کرکے ملک توڑے ہیں۔ انساف کے ترازو میں یہ یہ معاملات تولنے والے ہیں۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جو بھارت آزاد ہوا تھا وہی حقیقی اور قانونی بھارت ہے اور اس کے بعد بھارت نے جو بھی اپنے رقبے میں اضافہ ہے وہ غیر قانونی اور ناجائز ہے۔ امن اور سلامتی کے لیے بھارت پہل کرتے ہوئے پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قبضہ کئے ہوئے تمام علاقے خالی کرے تو قرین انصاف اور امن کی جانب پہلا قدم ہوگا۔

آزاد کشمیر اور سیالکوٹ سیکٹر میں حالیہ بھارتی جارحیت کیا امن کا پیغام ہے جس میں بہت سے لوگ شہید ہوئے اور کئی زخمی ابھی بھی زیر علاج ہیں۔

چونڈہ آج بھی دفاع وطن کے لیے پاک فوج کی شجاعت اور پامردی کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ بھارتی غرور اور گھمنڈ کے خاک میں ملنے کا گواہ ہے۔ اس سرزمین ہمارے شہیدوں کا خون ملا ہوا ہے۔ چونڈہ کے سپوت زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا اہم کردار ادا کر رہے ہیں جن میں پاک فوج کے شعبہ آئی ایس پی آر کے بریگیڈیئر عتیق الرحمٰن بھی ہیں جو میرے ہم جماعت ہیں۔ چونڈہ ناقابل تسخیر رہا ہے اور آج بھی آباد ہے اور پیک وطن کے دوسرے شہروں، قصبوں اور دیہات کی طرح ہمیشہ آباد رہے گا۔

انشاء اللہ

سیالکوٹ تو زندہ رہے گا

حکومت پاکستان نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں بہادری، دلیری اور حوصلہ مندی کا جو مظاہرہ کیا تھا اس کے اعتراف کے طور پر مارچ 1967ء میں پاکستان کے تین شہروں سیالکوٹ، لاہور اور سرگودھا کے شہریوں کو پرچم ہلال استقلال کا اعزاز عطا کرنے کا اعلان کیا۔ جنرل محمد موسیٰ خان نے 7 مئی 1967ء کو ایک خصوصی تقریب میں سیالکوٹ کو یہ پرچم عطا کیا تھا۔ 15 مئی 1967ء کو پاکستان کے محکمہ ڈاک نے اس پرچم ہلال استقلال کی تصویر سے مزین ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔ دنیا میں اس شہر کی شہرت کے لیے صرف علامہ اقبال کا شہر ہونا ہی کافی تھا لیکن اس کے باوجود یہ شہر بڑی عظیم شخصیات کا شہر ہے۔ سیالکوٹ کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہاں دین حق کی دعوت پھیلانے والے اولیاء اکرام نے صرف تبلیغی کام نہیں کیا بلکہ ظلم اور استبداد کے سامنے کلمہ حق بلند کیا اور جہاد کی راہ اپناتے ہوئے شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔ برصغیر کے شائد ہی کسی اور شہر میں اتنی تعداد میں اولیاء اکرام نے حق کے لیے تلوار اٹھائی ہو اور اس راہ میں اپنا خون دیا ہو جتنا سیالکوٹ کے اولیاء اکرام نے کیا۔ سیالکوٹ قلعہ کی بنیادوں میں حضرت پیر مرادیہ شہید کا خون شامل ہے۔ یہیں اسلام کی پرچم بلند کرتے ہوئے حضرت امام علی الحق شہید، حضرت پیر شعلہ شہید، حضرت بابل شہید، حضرت سرخ

رو شہید اور کئی عظیم ہستیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور یہیں مدفون ہیں۔
سیالکوٹ علامہ عبدالحکیمؒ کا بھی شہر ہے جن کی علم و فضیلت سے متاثر ہو کر مغل بادشاہ شاہجہاں نے دو مرتبہ چاندی میں تلوایا ور وہ آپ کی نذر کی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ انہیں ''آفتاب پنجاب'' کہا کرتے تھے۔ آپ ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے شیخ احمد سر ہندی کو سب سے پہلے ''مجدد الف ثانی'' کے خطاب سے یاد کیا۔ متعدد گراں قدر تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ سیالکوٹ ہی علمی شخصیات میں شمس العلماء میر حسن، مولانا ابراھیم میر، حافظ محمد عالم، مولانا محمد علی کاندھلوی، علامہ یعقوب خان، اصغر سودائی اور بہت سی دوسری شخصیات شامل ہیں۔ یہ علامہ اقبال، فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد، رجیندر سنگھ بیدی، کلدیپ نیرّ، ظہیر عباس، منظور جونئیر، شہناز شیخ، شعیب ملک اور کئی بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگوں کا شہر ہے۔ یہ راجو راکٹ اور گونگے پہلوان کا بھی سیالکوٹ ہے۔ بشیر کنور، اسلم کمال، ایس ایم خالد اور جالی نوس نے فن مصوری اور فنون لطیفہ میں جبکہ میر صاحب اور جاوید اقبال نے کارٹون کی دنیا میں عظیم نام پیدا کیا ہے۔ اسی سیالکوٹ سے تعلق ہونا میرے لیے بھی باعث فخر ہے۔
پانچ سو سال قبل مسیحی شہر کا تاریخی ریکارڈ دستیاب ہے۔ ہندو راجہ سل یا سال بنیاد نے رکھی اس کے بعد راجا سال واہن کا دارالحکومت بنا اور اس نے

یہاں ایک کوٹ یعنی قلعہ بنایا اسی بنیاد پر اس کا نام سیالکوٹ ہو گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہ کشمیر کا حصہ بنا۔ کشمیر کے ساتھ سیالکوٹ کا تعلق صدیوں پرانا ہے اور دونوں ایک اٹوٹ بندھن میں بندھے ہوئے ہیں جس گواہی جموں اور سیالکوٹ کی سرحد پر وہ درخت بھی ہے جو آدھا ایک طرف ہے اور آدھا دوسری طرف ہے۔ پاکستان سے واحد ریلوے لائن بھی سیالکوٹ سے ہی جموں جاتی تھی۔ آج بھی یہاں کشمیری مہاجرین کی بہت بڑی تعداد آباد جن کے لیے آزاد جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی میں تین نشستیں ہیں۔ دنیا بھر میں اس شہر کے بنے ہوئے کھیلوں، آلات جراحی اور چمڑے کی مصنوعات کی دھوم ہے۔ فٹ بال کے عالمی مقابلوں میں بھی اسی شہر کا بنا ہوا فٹ بال استعمال ہوتا ہے۔ کراچی کے بعد سے زیادہ زر مبادلہ کمانے والا بھی یہی شہر ہے اور اس کی سالانہ برآمدات سو ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ بھی منفرد مثال ہے کہ اس شہر کے تاجروں اور صنعت کاروں نے اپنی مدد آپ کے تحت سیالکوٹ ائیرپورٹ تعمیر کیا جس کا رن وے سب سے بڑا ہے۔ جس کی لمبائی تین عشاریہ چھ کلومیٹر ہے اور اس پر دنیا کا سب سے بڑا طیارہ ائیر بس تین سو اسی بھی لینڈ کر سکتا ہے۔ شہر میں سڑکوں اور تعمیر ترقی میں بھی یہاں کے شہریوں نے ذاتی رقم خرچ کرے دوسرے شہروں کے لیے ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔

سیالکوٹ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں ظلم و جبر برداشت کیا اور 1965ء اور 1971ء میں بھارت نے اس پر یلغار کی کوشش کی اور اپنی جارحیت کا نشانہ

بنایالیکن اللہ کے فضل سے شہر اقبال آج بھی زندہ و آباد ہے۔ سیالکوٹ سرحد پر بھارتی افواج کی جانب سے ہونے والی آئے روز کی فائرنگ کے باوجود یہاں کے باشندوں کے حوصلے بلند ہیں اور اُن کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف سیالکوٹ ہی نہیں بلکہ وطن عزیز کا ہر شہری اپنے وطن کے دفاع کے لیےپُر عزم ہے۔ یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مودی صاحب آپ کسے ڈرا اور خوف زدہ کر رہے ہیں؟ انہیں جو موت سے نہیں ڈرتے بلکہ موت کو اپنے نبی کی سنت سمجھ کر اس کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں جو خوف مرگ سے بالکل بے نیاز ہیں اور موت کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ جنگیں جذبے سے لڑی جاتی ہیں۔ جس قوم میں جذبہ جہاد ہو، شہادت کی تمنا ہو اور آخرت کی زندگی پر ایمان ہو اسے کون شکست دے سکتا ہے۔ پاکستان ایک خطہ زمین کا نام نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے جسے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔ اس نے تا قیامت رہنا ہے۔ سیالکوٹ کے جس قلعہ پر بھارت نے بم برسائے تھے اسی پر آج پرچم ہلال استقلال بڑی شان سے لہرایا جاتا ہے اور وہیں آویزاں ہے سیالکوٹ تو زندہ رہے گا۔ صرف سیالکوٹ نہیں پاک وطن کا ہر شہر زندہ و آباد رہے گا اور پاکستان پائندہ رہے گا۔ انشاء اللہ

بھارت سے دوستی اور امن کی خواہش

امن اور دوستی کا راستہ ہی برصغیر کے عوام کے لیے خوشحالی اور ترقی کا ضامن بن سکتا ہے۔ اس خواہش کا اظہار سرحد کی دونوں جانب سے ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ مسائل جنگوں سے حل نہیں ہوتے اور امن و سلامتی کا راستہ ہی سب کے فائدہ مند ہے لیکن امن اور دوستی کس قیمت پر۔ کیا ظلم ، زیادتی اور دوسروں کے خلاف جارحانہ کاروائیوں کے تسلسل میں امن اور دوستی ممکن ہے۔ ہمسایہ ممالک کی آزادی و خودمختاری اور قومی وقار کو تسلیم کیے بغیر کیا امن اور دوستی کا خواب کیسے شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے ۔ اکھنڈ بھارت کے نظریہ کی موجودگی کے باعث کیا آپس میں دوستی ممکن ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو بھارت سے امن ، دوستی اور تجارت کی خواہش رکھنے والوں کے سامنے رکھنے کی جسارت کروں گا۔ غیر جانبدارانہ اور عدل و انصاف کے ترازو میں ماضی کی تاریخ اور موجودہ طرز عمل کا جائیزہ لیتے ہیں پھر اس کے بعد فیصلہ خود کرلیں۔ پہلے ایک اصول طے کریں اور پھر اُس کی روشنی میں امن اور دوستی کی جانب بڑھیں اور اس بات کا فیصلہ کریں کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک کس ملک نے برصغیر میں امن کی آشا کو مجروح کیا ، ناجائیز اور جبری قبضہ کرکے اپنا رقبہ بڑھایا ، دوسروں کی آزادی اور خود مختاری کو سلب کیا ، کس نے جمہوری روایات کو پامال کرکے عوام کے حق خود

آزادی سے محروم کیا، کس نے بین الاقوامی قانون اور اقوام عالم سے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کئے، کس نے بین الاقوامی اصولوں کو روندتے ہوئے دوسروں کی علیحدگی کی تحریکوں کی پشت پناہی کرکے ملک توڑے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جو انصاف کے ترازو میں تول کر ہی کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہیے۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جو بھارت آزاد ہوا تھا وہی حقیقی اور قانونی بھارت ہے اور اس کے بعد بھارت نے جو بھی اپنے رقبے میں اضافہ ہے وہ غیر قانونی اور ناجائز ہے۔

آزادی کے بعد بھارت نے پانچ ریاستوں پر جبری قبضہ کرے اُن کی آزادی اور خودمختاری کو سلب کرتے ہوئے وہاں کے عوام کو غلام بنا رکھا ہے۔ بین الاقوامی اصول و ضوابط پامال کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کو جدا کرنے میں جو گھناؤنا کردار اُس کا اعتراف وہاں کی قیات نے خود کیا ہے۔ بھارت نے اپنی آزادی کے فوری بعد ۲۶ اکتوبر کو ریاست جموں کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ اُس نے مہاراجہ کی جانب سے نام نہاد الحاق کو اس کی بنیاد بنایا لیکن آج تک بھارت الحاق کی وہ دستاویزات نہیں دیکھا سکا اور نہ اقوام عالم سے اور نہ ہی کشمیری عوام کو آزادانہ رائے شماری کا وعدہ بھی پورا کیا۔ بھارت نے دوسرا غاصبانہ قبضہ ۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو ریاست جوناگڑھ اور مناور پر قبضہ کرکے کیا حالانکہ اس ریاست نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جوناگڑھ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کی درخواست کی جسے گورنر جنرل قائداعظم

محمد علی جناح نے قبول کیا اور طرح یہ ریاست قانون آزادی ہند کے تحت پاکستان کا حصہ بن گئی ۔ سروے آف پاکستان کے سرکاری نقشوں میں جوناگڑھ اور مناور کو پاکستان کا حصہ دیکھایا جاتا رہا۔ بھارت نے تیسرا اجبری اور غاصبانہ قبضہ قبضہ ریاست حیدرآباد دکن پر کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے قانون کے تحت.برصغیر کی دیسی ریاستوں کو حق حاصل تھا کہ وہ بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرلیں یا پھر اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کردیں۔ اسی اصول کے تحت حیدرآباد ریاست کے حکمران نظام حیدر آباد نے خود مختاری کا فیصلہ کیا اور یوں انگریزوں کے جانے کے بعد برصغیر میں پاکستان، بھارت اور حیدرآباد تین ملک بن گئے۔ پاکستان نے حیدرآباد کی خود مختاری کو قبول کیا اور مشتاق احمد خان اُس کے سفیر کی حیثیت سے پاکستان میں تعینات ہوئے۔ بھارت نے اپنی غاصبانہ اور اکھنڈ بھارت کی پالیسی کے تحت قائد اعظم کی وفات کے فوراً بعد حیدرآباد پر فوج کشی کردی ۱۳تا۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء حیدرآناد میں دو لاکھ افراد کے بعد سقوط حیدرآباد ہوگیا۔

۱۹۶ء میں دادرا، نگر حویلی اور گوا پر قبضہ اس سلسلہ کی چوتھی مثال ہے۔ سکم کی ا ریاست اس سلسلہ کی پانچویں مثال بنی جسے اکھنڈ بھارت اپریل ۱۹۷۵ میں ہڑپ کرگیا۔ مشرقی پاکستان میں مداخلت کے بعد سلسلہ جاری ہے اور اب بلوچستان اور کراچی میں سابقہ پالیسی تسلسل ہے۔ کئی ہمارے دانشور مسئلہ

کشمیر کو پاک بھارت تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے ایک طرف رکھ ہمیں دوستی اور باہمی تجارت کرنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ اگر نہ بھی ہوتا تو پھر بھی اکھنڈ بھارت پالیسی کے ہوتے ہوئے خطہ میں امن ممکن نہیں تھا۔ بھارت بھوٹان اور نیپال کی طرح پاکستان کو بھی ایک مطیع ریاست کی طرح رکھنا چاہتا ہے۔

بھارت نے جس طرح سے پاکستان کو توڑا اور اب بھی اسے غیر مستحکم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اس کے برعکس پاکستان کا رویہ مختلف ہے۔ یہ درست ہے کہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کی پاکستان حمایت کرتا ہے اور آزادی کے لیے ۱۹۶۵ء میں فوجی کوشش بھی کی لیکن اس کے ساتھ ہی ۱۹۵۸ء میں آزاد کشمیر اور مہاجرین جموں کشمیر مقیم پاکستان کی جانب سے سیز فائر لائن کو توڑنے اور واپس جموں کشمیر جانے کی تحریک کشمیر لبریشن موومنٹ کو پاکستان نے روک دیا جس پر بھارت نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر پاکستان نے تو بھارت کے سلامتی اور تحفظ کے لیے صدر ایوب خان کے دور میں مشترکہ دفاع کی پیش کش بھی کی۔ پاکستان نے تو بھارت کے جہازوں گنگا اور بوئنگ ۷۰۷ کو اغواہ کرنے والے حریت پسندوں ہاشم قریشی، اشرف قریشی اور عبدالحمید دیوانی کے سات ساتھیوں اور دوسرے بہت سے کشمیریوں پر وہ ظلم و تشدد کیا کہ آج بھی شاہی قلعہ، دلائی کیمپ، قلعہ چلاس اور دوسرے عقوبت خانے اُس کے گواہ ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جموں

کشمیر لبریشن فرنٹ کی عظیم عوامی مارچ کو پاکستان نے قوت کے زور پر روکا اور آٹھ افراد شہید ہو گئے۔ اسی طرح بھارت کو پاکستان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے خالصتان کی تحریک کو ختم کرنے میں اُس کی مدد کی۔ اس برعکس بھارت نے ہمیشہ پاکستان کے بھگوڑوں کی نہ صرف مدد کی بلکہ انہیں تربیت دے کو اسلحہ سمیت واپس بھیجا تاکہ وہ اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔

امن اور دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کی آزادی، خود مختاری، قومی وقار اور سلامتی کا احترام کیا جائے۔ باہمی تنازعات عدل و انصاف کے اصولوں اور بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے حل کئے جائیں۔ عالمی برادی سے کیئے گئے وعدے پورے کیے جائیں اور توسیع پسندانہ پالیسی کو ترک کر کے دوسروں کو بھی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ جینے کا حق دیا جائے۔جب تک ایسی پالیسی نہ اپنائی گئی امن اور دوستی کی خواہش محض خواب ہی رہے گی۔

تو باقی نہیں ہے

یہ وقت بھی چشم فلک نے یہ بھی دیکھنا تھا کہ شونزنس سے تعلق رکھنے والی خواتین قربانی کے جانوروں کے ساتھ کیٹ واک کریں گی۔ کہیں قربانی کے جانوروں کا مقابلہ حسن منعقد ہو رہا ہے تو کہیں مہنگے جانوروں کی تشہیر سے نمود و نمائش عروج پر ہے۔ کیا قربانی کی یہی روح ہے؟ جس قربانی کو خلیل اللہؑ کی سنت قرار دیا جاتا ہے کیا اُن کا عمل ایسا تھا۔ کیا اسلام نے ایسی قربانی کے تعلیم دی ہے۔ فقط قربانی ہی کیا دیگر ارکان اسلام کی بجاآوری میں بھی ہمارا طرز عمل اس سے مختلف نہیں۔ نماز جس میں نظم و ضبط اور طہارت کا پیغام ہوتا ہے لیکن مسجد سے نکلتے ہوئے نمازی آپس میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور ہمارے معاشرہ میں صفائی کی صورت حال سے سب آگاہ ہیں۔ اگر نماز کا مقصود صرف قیام، رکوع اور سجود سے پورا ہو جاتا تو رب العزت کیوں سورہ الماعون میں ارشاد فرماتا کہ اُن نمازیوں کے ہلاکت ہے جو اُس کی روح سے غافل ہیں۔ کیا کبھی کسی نے اس طرف توجہ دلائی کہ صلوۃ کی روح کیا ہے اور اس عبادت کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے روزہ رکھنے کے باوجود ہم میں وہ تقویٰ نظر نہیں آتا جو صیام کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ قرآن جب بار بار کہتا ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کے لیے اپنا مال کھلا رکھو ہم سال میں ایک بار زکوۃ کی ادائیگی کے بعد اپنے آپ کو بری الذمہ

سمجھتے ہیں۔ سُنت رسول پاک ﷺ کی اہمیت پر تو بہت زور دیا جاتا ہے لیکن کیا کبھی کسی نے زکوۃ کے بابت سنت رسولؐ کا درس دیا۔ بات سوچنے کی ہے کیونکہ قرآن بار بار سوچنے اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہم عبادات کی اصل روح کے نظرانداز کرتے ہوئے محض ایک طریقہ کار کے مطابق انہیں کرکے مطمئن ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کردیا جب کہ حقیقت حکیم الامت یوں بیان کی ہے

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

ہر سال لاکھوں مسلمان حج کرتے ہیں لیکن ہماری اجتماعی اور ذاتی زندگی میں کوئی فرق کیوں نہیں پڑتا؟ پوری دنیا کے مسلمان کئی دن اکٹھے گذار کر بھی کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب نہیں کرپاتے جس سے ان کے معاشرہ میں کوئی تبدیلیاں آتیں۔ وہاں سب ایک ہی لباس میں یک زباں ہو کر اللہ سے وعدہ کررہے ہوتے ہیں کہ ہم تری بارگاہ میں حاضر ہیں، تیری ہی محکومی اختیار کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور تیرے حکم کے علاوہ کسی اور کا حکم نہیں مانتے لیکن وہاں سے آتے ہی اجتماعی اور انفرادی زندگی اس وعدے کی معمولی سی بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ حج سے واپس آنے والوں سے لوگ بہت اشتیاق سے ملنے کے لیے جاتے ہیں اور بقول علامہ اقبال اُن سے اس عظیم عبادت کا مقصد اور پیغام جاننا چاہتے ہیں لیکن

بقول اقبال

زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی

!کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

ہماری عبادتیں اور دوسرے اعمال اس لیے نتیجہ خیز نہیں کہ ہم اُن کی روح سے غافل ہیں۔ اُن اراکین کی ظاہری ادائیگی کے لیے تو بہت بحثیں اور باتیں ہوتی ہیں لیکن ان کا اصل مقصد کیا تھا اور وہ کس طرح پورا ہوگا اس پر نہ کوئی کچھ کہتا ہے اور نہ کوئی سوچتا ہے۔ ہم وہ تمام رسمی عبادات بجالاتے ہیں لیکن اُن کی روح موجود نہیں جس کی طرف علامہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

اب مختصر سا حالات حاضرہ کے حوالے سے کہ شام اور مشرق وسطیٰ میں مہاجرین کا مسئلہ امریکہ اور اقوام مغرب کا ہی پیدا کردہ ہے۔ انہوں نے عراق، شام، لیبیا، مصر اور خطہ کے دیگر مسلم ممالک کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے آلہ کار بنایا جس کی وجہ وہاں کے لوگ پناہ کی تلاش میں یورپ کا رُخ کر رہے ہیں۔ سویڈن اور جرمنی نے انہیں خوش آمدید کہہ کر ایک قابل تحسین مثال قائم کی جسے دیگر یورپی ممالک خصوصاً امریکہ کو بھی اپنانا چاہیے لیکن ناقدین کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ مسلم ممالک خصوصاً مشرق وسطیٰ کے ممالک کیوں بے حس ہیں۔ یہاں

یہ بھی اہم سوال ہے کہ برما کی مظلوم مسلمانوں کی جلتی ہوئی بے گور و کفن لاشیں اقوام عالم کو نظر کیوں نہیں آتیں۔ دنیا کے منصفوں کو کشمیر میں بہنے والے خون کا شور کیوں سنائی نہیں دیتا۔ اقوام یورپ کا ضمیر جھنجھوڑنے کے لیے برسلز میں یورپی پارلیمنٹ کے سامنے کشمیر کونسل ای یو کے چیئرمین علی رضا سید اور یورپی پارلیمنٹ کے رکن سجاد کریم نے دیگر کشمیری تنظیموں اور حقوق انسانی کے رہنماؤں کے ساتھ یک زبان ہو کر ہفتہ کشمیر منایا۔ اس سے یورپی پالیسی سازوں کو مسئلہ کشمیر کی یاد دہانی ہوگی۔ حال ہی میں ایک مریکی دانشور اور سیاسی رضاکار ایلی ویزا نے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے بارے میں اپنی رپورٹ میں دنیا کو ایک بار پھر مسئلہ کشمیر کی نزاکت سے آگاہ کیا ہے جس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ انہوں نے عالمی حکومتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ جرائم میں ملوث بھارتی فوجی افسروں کے بین الاقوامی سفر پر پابندی عائد کی جائے۔ اقوام متحدہ سے بھی اپیل کی گئی ہے کہ ایسے اہلکاروں کو قیام امن کی عالمی فورسز کا حصہ نہ بنایا جائے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کے بھارتی مطالبے کو کشمیر میں لوگوں کے حقوق کو تسلیم کرنے سے مشروط کیا جانا چاہیے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ اور بیرون ممالک سفارت خانوں نے اس اس رپورٹ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ معلوم نہیں کہ وہ کب خواب غفلت سے کب اٹھیں گے۔ ویسے وزیر خارجہ کی عدم موجودگی سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت پاکستان خارجہ پالیسی کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔

تخلیق کائنات کی عقدہ کشائی

وہ جنہیں اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا اور جو اپنے علاوہ دوسروں کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے جب ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا گیا تو وہ اس سامنے سر تسلیم خم کرنے پر پر مجبو ہوگئے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کیسا کلام ہے جو آج تک انہوں نے نہیں سُنا تھا۔ واقعی کوئی عام کتاب نہیں تھی بلکہ کچھ اور ہی تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم الامت نے فرمایا کہ

فاش گویم آں کہ در دل مضمر است

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

علامہ فرماتے ہیں کہ جو بات دل میں ہے وہ صاف کہتا ہوں کہ قرآن حکیم محض ایک کتاب نہیں بلکہ کچھ اور چیز ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے اولین مخاطبین کا رد عمل یہ تھا کہ یہ شاعری نہیں بلکہ سحر یعنی جادو ہے۔ ان کے اس طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نے سورہ الاسری کی آیت ۴۷ اور الفرقان کی آیت ۸ میں اُن کفار کی ذہنیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ ظالم کفار ہیں جو کہتے ہیں کہ آپ سحر زدہ ہیں اور آپ پر جادو ہوگیا ہے جبکہ قرآن نے اس کی قطعی تردید کی۔ انبیاء اکرام پر کسی کے جادو یا سحر کا ہو ہی نہیں سکتا جس

کی مزید وضاحت قرآن حکیم نے سورہ الاعراف کی آیت ۱۱۹ میں حضرت موسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کردی کہ جادوگران کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور کسی جادو کا اثر نہ ہوا۔ ان واضح حقائق کے باوجود بد قسمتی سے یہ مشہور ہے کہ حضور پر جادو کیا گیا اور جس کا تقریباً ایک سال تک اس کا اثر ہوا اور پھر قرآن حکیم کی آخری دو سورتوں نازل ہوئیں جن کے اثر سے آپ پر ہونے والا جادو ختم ہوا۔ حقیقت یہ کہ حضور پاک پر کسی جادو کا کوئی اثر نہ ہوا جس کی گواہی خود قرآن نے دی کہ آپ سحر زدہ نہیں ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ حضور پاک پر جادو ہونے کا جو وضعی واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ ۷ ہجری کا ہے جبکہ قرآن کی دونوں آخری سورتیں ہجرت سے بہت سال قبل مکہ میں نازل ہو چکی تھیں یعنی یہ مدنی سورتیں ہیں ہی نہیں اور نزول قرآن کے اعتبار سے وہ بیسویں اور اکیسویں سورہ ہیں۔ یہ دونوں آخری سورتیں دراصل تخلیق کائنات کی عقدہ کشائی ہیں۔

سورہ فلق جادو اتارنے کے لیے نہیں اتری بلکہ یہ کائنات کی عظیم دھماکہ BIG BANG سے تخلیق کی وضاحت کر رہی ہے جبکہ سورہ الناس کائنات کے ایک مقررہ مدت تک برقرار رہنے کی اطلاع دی رہی ہے۔ فلق کا معنی کسی چیز کا یک بیک دھماکے کے ساتھ پھٹ جانا۔ بیج کا پھٹ کر خول سے نکلنا، دن کا ابھر کا رات سے نکلنا جبکہ خنس کا معنی سکڑنا، سمٹنا، ستاروں کا چھپنا اور ظاہر ہونا۔ سورہ فلق میں یہی حقیقت آشکار کرنے کے لیے کہا کہ آپ ﷺ وہ عظیم راز جو صدیوں بعد

معلوم ہوگا اس کا اعلان کردیں کہ میں دھماکے سے مادے کے مرکب کو اجزائے بسیط میں لانے والے پالنہار کی پناہ میں آتا ہوں، ہر اس چیز کے خطرات سے جو مادے کے اجزا جدا ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ جو حقیقت زبان مصطفےٰ ﷺ سے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو بتائی گئی وہ عقل انسانی نے اب دریافت کی ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک عظیم دھماکے Big BANG سے ہوئی اور اگر مادے کے اجزاء کو توڑا جائے تو بہت بڑی تباہی ہوتی ہے جس کا مظاہرہ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان پر دو ایٹم بم پھینک کر کیا۔

سورہ الناس میں اللہ رب العزت نے رسول پاکؐ سے کہا کہ اعلان کیجیے کہ میں انسانوں کے کفیل، انسانوں کے حاکم اور انسانوں کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں، اس فکر مندی سے جو چھپنے والے کے چھپ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے دو اصطلاحات خُنَّس اور کُنَّس بیان کی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے مقابل قوتیں ہیں۔ خُنَّس مرکز ریز یا مرکز مائل قوت Centripital Force ہے جبکہ کُنَّس مرکز گریز Centrifugal Force قوت ہے۔ یہ دونوں قوتیں سورج اور سیاروں کے درمیان حدِ فاصل قائم رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم ان دونوں کا تذکرہ سورہ التکویر میں کیا ہے جو کہ نزول کے اعتبار سے ساتویں سورہ ہے۔ یہ تھا قرآن کا اعجاز تھا جسے دیکھ کر اپنے آپ کو فصاحت و بلاغت کے سرخیل کہلانے والے اس جیسی ایک آیت بھی نہ بنا سکے۔
قرآن کا ادبی اور علمی انداز دیکھیے کہ

کیسے ایک پیچیدہ سائنسی حقیقت کو بیان کردیا۔
خُنَّس مرکز مائل قوت سورج کے گرد گھومنے والے سیاروں کو اس سمت میں بڑھاتی ہے جس سمت میں سورج بڑھتا ہے۔ جبکہ کُنَّس مرکز گریز قوت سورج کی طرف بڑھنے والے سیاروں کو اپنی طرف کھینچ کر رکھتی ہے۔ ان دونوں قوتوں سے ایک توازن رہتا ہے اور سیارے اپنے اپنے مداروں میں محو گردش رہتے ہیں۔ جس دن سیاروں میں خُنَّس اور کُنَّس ختم ہوگا سورج اور سیارے ٹکرا جائیں گے اور تمام مادہ الفا بیٹا اور گاما شعاعوں میں بدل جائے گا اور کائنات پھر اسی گولے کی صورت اختیار کرلے گی جو بگ بینگ سے پہلے موجود تھا۔ پھر جب کبھی رب الفلق اس گولے کو پھاڑ کر اس میں خُنَّس و کُنَّس ڈال دے گا تو یہی کائنات دوبارہ وجود میں آجائے گی۔ یہ کائنات کے وجود میں آنے کے ساتھ دوبارہ تشکیل پانے اور آخرت کا سائنسی ثبوت ہے۔ قرآن حکیم کی یہ دونوں آخری سورتیں تخلیق کائنات کی عقدہ کشائی ہیں۔ ان سورتوں کے الفاظ اور معانی پر اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ کائنات کی تاریخ، اس کے آغاز اور انجام کو کس قدر مختصر انداز میں بیان کردیا ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ ہم نے اِن پر غور کرنے کی بجائے انہیں جھاڑ پھونک کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے ایک جان بچائی اُس نے گویا پوری انسانیت کی

جان بچائی۔ میرے احباب جنہیں میں بچپن سے ذاتی طور پر جانتا ہوں وہ ایک رجسٹرڈ تنظیم کے تحت فری ڈاھیلیسز سینٹر بھمبر آزاد کشمیر میں چلا رہے ہیں جس سے اب تک مستحق مریضوں کے ۱۵۰۰۰ مفت ڈاھیلیسز ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب اس اس مرکز کو توسیع دینے کے تعمیری منصوبے پر عمل ہو رہا ہے۔ تمام احباب سے گذارش ہے کہ اس فلاحی تنظیم کے اس انسان دوست کام میں مالی تعاون کریں ہاتھ بٹائیں اور اللہ تعالی سے جزا کے مستحق ٹھہریں۔ آپ کی معمولی رقم بھی کسی ایک انسان کی جان بچانے کے کام آئے گی۔ احباب سے گذارش ہے کہ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر جناب اصغر شاد سے اُن کے فون نمبر 00923420511464 یا ای میل masgharshad@yahoo.com سے اس کار خیر میں حصہ لینے کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں۔

(تخلیق کائنات کی عقدہ کشائی (حصہ دوم

دور حاضر کا تعلیم یافتہ انسان پانچ ہزار سال کے علم اور تجربہ کی بنیاد پر یہ جانتا ہے کہ موجودہ کائنات ۱۵ارب سال پہلے Hydrogen کے ایک بڑے گولے Nebula کے طور پر خلا میں موجود تھی۔ جب یہ گولہ پھٹا تو وہ بڑا دھماکہ Big Bang ہوا جس صدائے بازگشت آج بھی فضا میں گونج رہی ہے۔ ہمارے سامنے کائنات کی موجودہ صورت اسی عظیم دھماکے کی مرہون منت ہے۔ یہ سب تو انسان جان گیا ہے لیکن یہ نہیں جان سکا کہ یہ عظیم دھماکے سے پھٹنے والا Nebula کب اور کیسے موجود میں آیا۔ سائنس دان کائنات کی تخلیق کے تین نظریات ، عظیم دھماکے کا نظریہ Theory of Big Bang، مستقل حالت کا نظریہ Theory of Steady State، اور ارتعاشی نظریہ Theory of Oscillation۔ سائنس دانوں کی اکثریت بگ بینگ کے نظریہ کی حامل ہے۔ سائنس دان جس ابتدائی گیس کے گولے کی بات کرتے ہیں اس بارے قرآن حکیم کی سورہ حم السجدہ میں ہے کہ اللہ آسمان کی طرف متوجہ ہو تو وہ سب دھواں تھا۔ تخلیق کے ایک اہم مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے سورہ الانبیاء میں فرمایا کہ اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا، اور ہم نے (زمین پر) پیکرِ حیات (کی زندگی) کی نمود پانی سے کی، تو کیا وہ (قرآن

کے بیان کردہ اِن حقائق سے آگاہ ہو کر بھی) ایمان نہیں لاتے۔ سورہ الذاریات میں تخلیق کائنات کے بارے میں فرمایا اور آسمانی کائنات کو ہم نے بڑی قوت کے ذریعہ سے بنایا اور یقیناً ہم (اس کائنات کو) وسعت اور پھیلاؤ دیتے جا رہے ہیں۔ سائنس دان کائنات کے اختتام پذیر ہونے کے بھی قائل ہیں اور دو نظریات بگ کرنچ اور بلیک ہول پیش کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے متعدد بار بہت ہی مثالوں سے واضع کیا ہے کہ یہ کائنات ختم ہوجائے اور پھر زندگی کا ظہور ہوگا جسے آخرت کہا ہے۔ کائنات کی یہ تعمیر اور اس کی کارکردگی خُنَس و کُنَس سے قائم ہے جب سورج اور سیاروں کی یہ طاقت سلب ہوگی تو ایک محشر برپا ہوگی اور اِسی محشر کی کوکھ سے ایک نئی زندگی برآمد ہوجائے گی۔

کائنات کی ابتدائی تخلیقی مراحل میں وہ گیس کا گولہ جس الساعد کا نتیجہ تھا اس بارے میں کتاب عظیم نے سورہ التکویر میں وہ منظر پیش کیا ہے۔ زیادہ تر مترجمین نے سورہ التکویر کو زمانہ مستقبل پر معمول کیا ہے لیکن کچھ اہل علم نے اسے زمانہ ماضی بھی قرار دیا ہے۔ علامہ اختر کاشمیری اپنی کتاب حدیث عجم میں اس بارے میں لکھتے ہیں کہ ماضی کا یہ محشر ایک کائنات میں برپا ہوا، جس میں زندگی تھی ۔ قرآن مجید نے لفظ اذا کے ذریعے اس کی خبر دی ہے۔ اس محشر کے نتیجے میں جزا پانے والے جزا پاگئے اور سزا کو پہنچنے والے کو سزا کو پہنچے تو اس زندگی کا دفتر لپیٹ دیا گیا۔ بگ بینگ کے بعد موجودہ کائنات

وجود میں آئی۔ یہ حیات ختم ہو گی تو نئی حیات وجود میں آ جائے گی۔

سائنس دان یہ معلوم کرنے کی جستجو کرتے ہیں کہ کائنات کیسے وجود میں آئی لیکن یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ کیوں وجود میں آئی۔ اس کیوں کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس کا جواب خالق کائنات خود دیا ہے۔ قرآن حکیم میں پندرہ مقامات پر ہے کہ اللہ نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ قرآن حکیم نے مزید کہا کہ سلسلہ کائنات اس خوبی سے چل رہا ہے اس لیے تمہارا رب حق ہے۔ حق قرآن حکیم کی جامع اصطلاح ہے جس کہ اس (Concrete Form) بنیادی معنی کسی چیز کا اس طرح موجود اور واقع ہونا میں کوئی شک ہی رہے۔ کوئی ٹھوس واقعہ یا چیز جو حقیقت بن کر سامنے آ جائے اور وہ محض نظری بتانہ ہو بلکہ یقینی چیز ہو۔ وہ چیز جو وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور قوانین فطرت کے مطابق ہو۔ خود خدا کی ذات حق مطلق ہے اور اُس نے اس کائنات کو حق پر پیدا کیا ہے۔ یہ محض افسانہ، کھیل تماشا یا اتفاق نہیں بلکہ ایک مقصد کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جو تعمیری نتائج کے لیے بنائی گئی اور پھر انبیاء اکرام کے وساطت سے انسانوں کی رہنمائی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ خدا خود حق ہے۔اُس کے بھیجے ہوئے رسول حق ہیں، اُن کی لائی ہوئی وحی حق ہے، قرآن حق ہے، اُس کا دین حق ہے۔ دنیا میں حق (تعمیری) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے اور آخرکار حق ہی غالب آتا ہے اور

یہ اللہ کے بندوں کے ہاتھوں ہوتا ہے۔

اللہ تعالی نے اپنے آپ کو مشرقوں اور مغربوں کا رب کہا ہے۔ ہماری زمین پر تو ایک ہی مشرق اور مغرب ہی ممکن ہے تو مطلب یہ ہوا کہ لامحدود کائنات میں کئی مشرق اور مغرب ہیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کی وسعت جس کا اندازہ سائنس دان ابھی تک کر سکے ہیں اس کے مطابق ہماری زمین جس نظام شمسی میں ہے وہ یعنی ملکی وے گلیکسی یعنی ہماری کہکشاں ہے۔زمین سے مشابہ آٹھ سیارے دریافت ہو چکے ہیں جن پر پانی اور حیات کا امکان ہے۔ اگر ہم روشنی کی رفتار یعنی ۳ لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ سے سفر کریں تو اپنے نظام شمسی کے قریب ترین سیارے تک پہنچنے میں چار سال لگیں گے۔ ہماری کہکشاں میں زمین کے حجم کے برابر دو سو ارب یا دو سو بلین سیارے ہیں۔ صرف ہماری کہکشاں میں کئی ارب نظام شمسی موجود ہیں اور جس طرح کی ہماری کہکشاں ہے ایسی پانچ ارب کہکشائیں (5 بلین) موجود ہیں۔ اب بات سمجھ آئی کہ اللہ تعالی نے اپنے آپ کو کیوں مشرقوں اور مغربوں کا رب کہا ہے اور اسی طرح حضورﷺ بھی رحمت الاعالمین یعنی کہکشاوں میں بکھرے ہوئے تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔

اس وسیع کائنات میں کہیں زندگی ارتقائی مراحل Evolution طے کر رہی ہے اور کہیں Big Crunch بہت آگے جا چکی ہے اور کہیں عظیم تباہی آ چکی ہے اور وہاں

والے اپنی جزا و سزا کی منزل کو پہنچ چکے ہیں اور باقی ہماری طرح منتظر ہیں۔ یہ نظام کائنات اسی طرح چلتا رہے گا بقا صرف اسی ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ سورہ رحمٰن میں حقیقت واضع کردی کہ ہر کوئی جو بھی زمین پر ہے فنا ہو جانے والا ہے اور رب ہی کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ عظمت و جلال اور صاحبِ انعام واکرام ہے۔

ایک اور پاکستان کی بنیاد

بھارتی دانشور اور مدبر سیاسی رہنما خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر متحدہ ہندوستان کے دور میں کانگریس کی قیادت تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کرتی اور مسلمانوں کے جائز حقوق تسلیم کر لیے جاتے تو آل انڈیا مسلم لیگ کبھی بھی پاکستان کا مطالبہ نہ کرتی۔ ہندوؤں کے اسی تنگ نظر رویئے کے باعث سر سید ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے اور ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر جناح نے کانگریس کو چھوڑا۔ نہرو رپورٹ کے جواب میں قائد اعظم کو کیوں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کرنے پڑے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے کیوں کانگریسی وزارتوں کے خاتمہ پر یوم نجات منایا۔ غیر جانبدارانہ مبصرین تو ایک طرف اب خود بھارتی رہنماء اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ کانگریس کے مسلمانوں سے سے متعصبانہ اور غیر منصفانہ رویہ کی باعث اسلامیان ہند الگ وطن کے حصول کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ مارچ ۱۹۴۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اسے قراد لاہور پیش کرنا پڑی۔ قائد اعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت اس کے بعد بھی کسی آبرومندانہ حل کی صورت میں مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھی اسی لیے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کامیابی کے باوجود انہوں نے مطالبہ پاکستان کی بجائے وزارتی مشن کی تجاویز قبول کر لیں جسے کانگریس نے تسلیم نہ کیا جس کا نتیجہ

برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوا۔

اب ایک بار پھر موجودہ بھارتی قیادت اور انتہا پسند ہندو ایک اور پاکستان کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ دنیا میں گائے کے گوشت کا سب سے بڑا برآمد کرنے والا ملک کس طرح اس کے ذبح پر جبری نہ صرف پابندی لگا رہا ہے بلکہ اس کی آڑ میں وہاں کے مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ گائے کے گوشت کے حوالے سے بھارت میں بہت سے واقعات میں ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور انہیں ریاستی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ اترپردیش کے محمد اخلاق کو اسی شبہ میں شہید کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر اسمبلی میں انجینیئر رشید پر اسمبلی میں تشدد اور حملہ کر کے بھارت نے اپنے نام نہاد سیکولرازم کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ کشمیری اور بھارتی مسلمانوں کے لیے نوشتہ دیوار ہے۔ یہ ہے وہ بھارتی سیکولرازم جس کا راگ الاپا جاتا ہے اور جس کی تعریف پاکستان میں بیٹھے کچھ نام نہاد دانشور بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ بھارتی سیکولرازم کے حامی اور حقوق انسانی کے حامی اب کیوں خاموش ہیں۔ محمد اخلاق کا خون رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ اُس نے ایک اور پاکستان کی بنیاد رکھ دی ہے۔ یہ پاکستان بھی اُسی طرح وجود میں آئے گا جیسے موجودہ پاکستان کے قیام کے لیے انہوں نے خود راہ ہموار کی تھی۔

انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد جو تقسیم ہوئی وہ کوئی مستقل اور پائیدار حل نہیں تھا بلکہ حالات نے ثابت کیا ہے کہ اصل حل وہی ہے جو چوہدری رحمت علی نے پیش کیا تھا کہ برصغیر میں جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں وہاں انہیں وخود مختار مملکت ملنی چاہیے۔ اسی منصوبہ کے تحت انہوں نے شمال مغرب کے مسلمانوں کے لیے الگ ملک کا نام پاکستان تجویز کیا۔ بنگال، بہار اور آسام والوں کے لیے بانگستان اور حیدرآباد دکن کے لیے الگ ملک عثمانستان ہو۔ انہوں نے مالوہ، بہار اور آگرہ کے مسلمانوں کے لیے ممالک کے نام صدیقستان، فاروقستان اور حیدرستان تجویز کئے۔ اگرچہ تقسیم ہند کے وقت اُن کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا لیکن بھارتی قیادت کی تنگ نظری اور مسلمانوں کے خلاف اقدامات کے رد عمل میں مستقبل میں پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ بھارت کے وجود سے کئی اور پاکستان جنم لیں گے جس کے لیے حالات وہاں کے انتہا پسند ہندو خود پیدا کر رہے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے عوام بھی تاج آزادی پہنیں گے اقوام عالم میں فخر سے سربلند ہوں گے۔ بہت سے بھارتی مسلمانوں سے جو وہاں اعلیٰ عہدوں فائز ہیں اُن سے مجھے ذاتی طور پر ملنے کا موقع ملا ہے اور وہ اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں ہر سطح پر اپنی حب الوطنی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اُن کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ بھارت کے بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ”کرایہ پر گھر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جب وہاں کی دیواروں پر یہ نعرہ لکھا جائے گا کہ

مسلمانوں جاؤ پاکستان یا قبرستان" تو بھارتی مسلمان پاکستان آنے کی بجائے وہاں اپنے لیے الگ پاکستان حاصل کی ہی جدوجہد کریں گے۔ چشم فلک ایک نہیں کئی اور نئے پاکستان.برصغیر کے نقشے پر دیکھ رہی ہے۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

تاریخ انسانی میں ہمیشہ حق اور باطل کی قوتوں کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے۔ تمام انبیاء اکرام اپنے اپنے دور میں باطل اور برائی کی قوتوں کے سامنے حق کا پرچم بلند کرتے رہے۔ حضرت خلیل اللہؑ و نمرود، صاحب ضرب کلیمؑ و فرعون اور اسی طرح رسول پاک ﷺ نے ابو جہل اور کفار مکہ کے سامنے ثابت قدمی سے حق کا پیغام پیش کیا اور باطل کا بھرپور مقابلہ کیا۔ انبیاء اکرام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ حضرت امام عالیؓ مقام کا یزید کے سامنے کلمہ حق اسی کا تسلسل تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

این دو قوت از حیات آمد پدید

علامہ نے انسانی تاریخ کا اہم فلسفہ ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسینؓ حق اور نیکی کے علمبردار تھے جبکہ فرعون اور یزید باطل اور برائی کے مظہر تھے۔ ان دونوں قوتوں کے مابین یہ کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہر دور میں دونوں قوتیں موجود ہوتی ہیں یہ

ہمیں طے کرنا کہ کس کا ساتھ دینا ہے۔ حق و باطل کی اسی معرکہ آرائی کو علامہ نے مزید وضاحت سے یوں بیان کیا ہے کہ حضرت ابراھیمؑ کے پیام انقلاب سے یوم فرقان جب حق اور باطل ایک دوسرے کے مدمقابل تھے اور یہی سلسلہ کربلا میں نظر آتا ہے
۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہء وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اردو اور فارسی ادب میں بہت سے ممتاز شعراء نے امام عالی مقام کو اپنے اپنے علم اور فہم کے مطابق خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن جو علامہ کا انداز ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ یہ ہو بھی نہیں سکتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ کی شاعری کا منبع قرآن ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم پر غوروفکر کرتے ہوئے جو کچھ خود سمجھا وہی انہوں نے دوسروں کو سمجھایا۔ حضرت امام حسین کا قرآن سے تعلق بیان کرتے ہوئے کیا خوب لکھتے ہیں کہ

رمز قران از حسین آموختم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختم

وہ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآنی تعلیمات کا راز حضرت امام حسینؓ سے سیکھا ہے اور ہم نے اُن کی جلائی ہوئی آگ سے شعلے لیکر جمع کئے ہیں۔ امام علی مقام

نے اپنے خون سے اللہ کی وحدانیت اور توحید کی گواہی دی اور ہم امام عالی مقام کے دیئے ہوئے درس حریت کی روشنی میں مصروف عمل ہیں۔ علامہ کے فارسی اشعار رموز خودی سے ہیں ۔علامہ اقبال نے حضرت امام حسینؓ کوایک طویل نظم درمعنی حریت اسلامیہ وسِرِ حادثہ کربلا میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں شہادت حسینؓ پر اس سے بہتر خراج عقیدت میری نظر نہیں گذرا۔ معروف ماہر اقبالیات محمد شریف بقا نے اس طویل فارسی نظم کو آسان اردو میں ترجمہ کرکے اقبال اور ذکر حسین کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ علامہ نے امام حسین اور یزید کو حق اور باطل کی قوتوں کے نمائندوں کی حیثیت سے لیتے ہوئے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام عالی مقام نے حق کی خاطر خاک و خون میں لتھڑ گئے اس لیے وہ لا الہ کی بنیاد بن گئے ہیں

بہر حق در خاک و خون غلتیدہ است

بس بنای لا الہ گردیدہ است

اردو کلام میں بھی علامہ نے جابجا جناب امام علی مقامؑ کی عظیم جدوجہد پر بہت خوبصورت انداز میں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معرکہ آرائی ہر دور میں جاری رہی اور مستقبل میں جاری رہے گی ۔ اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

حکیم الامت نے اسی حق و باطل کی کشمکش اور دین کی تاریخ کو اپنے شعر میں یوں بیان کیا کہ حضرت اسماعیلؑ کی بارگاہ الٰہی میں قربان ہونے کی رضا کو نقطہ آغاز قرار دیتے ہوئے شہادت امام حسینؑ پر اس کا اختتام کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

علامہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ نے جو عظیم قربانی دی اُسے مسلمانوں نے فراموش کر دیا۔ ملوکیت اور آمریت جس کے سامنے امام عالی مقام نے کلمہ حق بلند کیا لیکن وہی ملوکیت ایک طویل عرصہ تک اسلامی تاریخ پر چھائی رہی اور جہاں جہاں آج بھی مسلمانوں میں جمہوریت ہے بھی وہ بھی موروثیت کے لبادے میں ملوکیت کا عکس ہے اسی لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے دابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس صورت حال میں وہ یہی پیغام حریت دیتے ہیں حضرت امام عالی مقام کی پیروی کی جائے اور وہی راستہ امت مسلمہ کو دینا میں عروج اور عزت دے سکتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں عبادات کا مطلب محض رسمی عبادات اور ذکر و فکر نہیں بلکہ اس کے لیے میدان عمل میں آنا ہوگا اور حضرت امام حسینؓ کے راستے پر چلنا ہوگا اس لیے وہ کہتے ہیں کہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری

جس طرح مولانا جامی باد نسیم کو بارگاہ رسالت ﷺ میں اپنا حال بیان کرنے کی درخواست کرتے ہیں اسی انداز میں علامہ بھی ہوا سے درخواست کرتے ہیں کہ اس صبا تو دور دراز علاقوں میں رہنے والوں کو پیغام پہنچاتی ہے۔ تجھ سے التجا ہے کہ ہمارے آنسو نذرانہ عقیدت کے طور پر امام عالی مقامؓ کے روضہ مبارک تک پہنچا دے۔

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشک،،برخاکِ پاکِ اورساں

حرمت قلم اور ہمارے اہل قلم

کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ The media and nation rise and fall together ۔ کسی بھی قوم یا معاشرے کی راہنمائی کا فریضہ اہل قلم ہی ادا کرتے ہیں۔ یہ صاحبان علم و دانش ہی ہوتے ہیں جو عام افراد کی ذہنی آبیاری کرتے ہیں اور اس طرح قیادت کرتے ہیں جیسے وہ میر کارواں ہوں۔ کسی بھی قوم کی حالت اور کردار کا جائزہ اس قوم کے ادیبوں، صحافیوں اور دوسرے اہل قلم کے نظریات اور کردار سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر کسی قوم کے اہل قلم لالچ، خوف، دباؤ یا کسی بھی غرض کی پروانہ کرتے ہوئے حق اور سچ کی آواز بے خوف ہو کر بلند کررہے ہوں تو اُس قوم کو کوئی مرعوب نہیں کرسکتا اور نہ ہی وہ قوم زبوں حالی کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی ملک و قوم کی کے دانشور مالی مفادات، مراعات اور لالچ میں آکر قصیدہ گوئی اور خوشامد کا راستہ اپنالیں یا خوف اور دباؤ میں آکر حق بات کرنا چھوڑ دیں تو تباہی اُس قوم کا مقدر ہوتی ہے۔ قرآن حکیم جو انسانوں کے درمیان رنگ، نسل یا کسی اور اعتبار سے کوئی امتیاز اور فضیلت نہیں کرتا لیکن صرف علم کی بنیاد پر وہ فرق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے .برابر نہیں ہو سکتے ۔ ایک اور مقام پر کہا کہ جس بات کا علم نہ ہو اسے اہل علم سے پوچھ لو۔ اہل علم کو قرآن حکیم علماء کے نام سے پکارتا

ہے۔ صحافی، ادیب، استاد، علماء، دانشور اور دوسرے اہل علم اس لحاظ سے ممتاز مقام رکھتے ہیں

انسانیت کے نام رب کائنات کے آخری پیغام کی پہلی وحی بھی علم کی فضیلت اور اہمیت اجاگر کرتی ہے۔ پہلی نازل ہونے والی سورہ العلق کی تیسری آیت الذی علم باالقلم سے قلم کی اہمیت واضع کرتے ہوئے رب العزت نے فرمایا کہ انسان کو یہ صلاحیت دی کہ وہ تحریر کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچائے۔ نزول کے اعتبار سے قرآن حکیم کی دوسری سورہ القلم ہے اس کی ابتداء ہی میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ ن والقلم۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو کیوں اتنی اہمیت دی ہے۔ سوچنے اور تدبر کا مقام ہے کہ کہ خالق کائنات نے کیوں ایسا کہا ہے اور اس کے تناظر میں اہل قلم کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ یہ اُس کتاب کی ابتداء ہے جس کے نزول نے عرب کی فضاؤں میں ایک انقلاب بھرپا کردیا تھا۔ قلم اور اظہار بیان کی اس اہمیت کے بعد ہمارے میڈیا میں ہمارے اہل قلم کے کردار کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا وہ حرمت قلم کے امین ہیں۔ اس فہرست میں صحافی، ادیب، شعراء، ٹی وی اینکر، تجزیہ نگار اور ماہرین سب آجاتے ہیں۔ کیا وہ قلم اٹھانے اور بولتے وقت اس ذمہ داری سے آگاہ ہوتے ہیں اور کیا وہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوتا اور ہمارے بہت سے اہل قلم اور اینکر

اپنی تحریوں اور تبصروں میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر کسی کی نظریاتی یا فکری وابستگی کسی نہ کسی جماعت یا نظریہ سے ہو سکتی ہے لیکن انہیں اس طرح بھی ہونا چاہیے کہ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار نظر آئیں اور ایسا محسوس ہو کہ وہ اپنی پسندیدہ جماعت کے ترجمان ہیں۔ پاکستانی میڈیا میں کالم نویس، تجزیہ نگار اور اینکرز کسی نہ کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کی حمایت میں اس شدت دے لکھتے ہیں کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس جماعت کے پروپوگنڈا سیکریٹری ہوں۔ جس کے حامی ہوتے ہیں اُس کی تعریف میں حد درجہ تک غلو اور جس کے مخالف ہوں اُس کی نہ صرف اچھی بات سے صرف نظر بلکہ حسد اور جھوٹ کا سہارا لیں۔ کیا اہل قلم کا کردار ایسا ہونا چاہیے ۔ کیا وجہ ہے کہ زرد صحافت اور لفافہ صحافیوں کی اصطلاح گردش میں رہتی ہے۔ سرکاری یا غیر سرکاری اداروں اور شخصیات سے مفادات حاصل کرنے والے اہل قلم اس مقدس شعبہ کی بدنامی کا باعث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر جانبدار کالم نویس، تجزیہ نگار اور اینکرز خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دشمن کے ساتھ بھی عدل کا حکم دیتا ہے۔ عدل کا معنی یہ ہے کہ جو چیز جس مقام کی مستحق ہے اُسے وہی مقام دی جائے۔ حامی ہو یا مخالف ، قلم عدل کے مطابق اٹھنا چاہیے اور تحریر میں انصاف کی عکاسی ہو۔ اسی طرح قرآن حکیم نے غلو سے بھی منع کیا ہے ۔ تحریر میں غلو ہونا حکم الٰہی کی خلاف ورزی

ہے۔ اپنی حامی جماعتوں اور شخصیات کی تعریف کرتے وقت غلو سے اجتناب کرنا حرمت قلم کا تقاضا ہے۔ درباری اور خوشامدی طرز عمل غلو کا ہی نتیجہ ہے۔ عوام کی بھی ذمہ داری ہے کہ ایسے اہل قلم کو مسترد کریں جو عدل وانصاف کے تقاضوں کو مد نظر نہ رکھتے ہوں اور جو غلو کا شکار ہوں۔ ایسے اہل کی قلم کی پزیرائی کرکے وہ اُن کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔ اہل قلم کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنے آپ کو درست کرنا ہوگا اور یہ سوچنا ہوگا کہ جس قلم کی قسم خدا نے کھائی ہے اس کے کیا تقاضے ہیں اور اُن کی کیا ذمہ داراریاں ہیں۔

اقبال کا پیغام عمل

علامہ نے اپنی شاعری میں عمل کا پیغام دیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطبات میں واضح کیا کہ اسلام کا نظریہ متحرک ہے جامد نہیں۔ نوجوانوں کو بطور خاص مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے پیغام عمل دیا اور انہیں نوجوان نسل سے یہ توقع تھی کہ وہ کردار و عمل کی قوت سے امت مسلمہ کو ایک پھر اقوام عالم میں قابل فخر مقام دلا سکیں گے۔ عمل کی اہمیت کو خالق کائنات نے اصولی طور پر بیان کر دیا کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کے لئے وہ خود کوشش کرتا ہے۔ علامہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جس قوم کا دین کا یہ نظریہ تھا آج وہ نہ صرف عمل سے عاری ہو چکی بلکہ اُس نے اپنے زندگی کے نظریہ کو بھی بدل لیا ہے اور اس بات پر مطمئن ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے اس لیے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس بارے میں وہ فرماتے ہیں خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

ایران کے فتح کے بعد جن عجمی اثرات نے اسلام کی تعلیمات کی اصل روح کو متاثر کیا وہ یہی تقدیر کا مسئلہ تھا جس نے مسلمان قوم کو بے عمل کر دیا۔

اسی لیے علامہ کے خیال میں ایران کی فتح سے اسلام کو نقصان پہنچا۔ تقدیر اشیائے کائنات کے لیے خدا کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جبکہ انسان کو اللہ نے عمل میں آزاد رکھا ہے اسی اختیار کے باعث انسان کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ علامہ نے انسان پر اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامہ حق نے تیری جبیں

انہوں نے اپنے کلام اور خطبات کے ذریعہ اس خطرے کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ بار بار عمل کا درس دیا۔ اس ضمن میں اپنے خطبات میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ کائنات ارتقا پذیر ہے اور خالق کائنات اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز متحرک ہے اور اسی طرح زندگی بھی ایک جوئے رواں ہے۔ جب کائنات کی ہر شئے مصروف عمل ہے تو پھر انسان کیسے بے عمل رہ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ فرماتے ہیں کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

چاند اور تارے نظم میں انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں تاروں کا چاند سے مکالمہ بیاں کیا ہے کس میں تارے مسلسل گردش سے گھبرا کا چاند سے پوچھتے ہیں کہ

نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا منزل کبھی آئے گی نظر کیا
اس پر وہ بزبان چاند کیا خوب جواب دیتے ہیں کہ
کہنے لگا چاند، ہم نشینو اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

ملنا اور بچھڑنا بھی زندگی کا ایک پہلو ہے جسے علامہ نے اپنی نظم دو ستارے میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ

گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثبات آشنائی آئین جہاں کا ہے جدائی

علامہ نے اپنی شہرت آفاق نظم ساقی میں نامہ میں انھوں ے زندگی میں عمل کی اہمت اور کردار کو کس قدر دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

قانون قدرت کی وضاحت کرتے ہوئے رب نے اصول بیان کر دیا کہ کسی بھی محنت کرنے والے کی محنت ضائع نہیں ہوگی۔ یہ محنت کرنے والا چاہے کوئی ہو، اس کا مذہب، عقیدہ یا رنگ و نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ محمد دین ہو یا شنتا رام، ڈیوڈ ہو یا محمود، ہر اک کو اس کے عمل کا نتیجہ ملے گا۔ سنت اللہ یہی ہے کہ جیسا کرو ویسا بھروگے۔ اسی کی تشریح اس روایت میں ہے جو حضرت ابو سعید خدریؓ نے بیان کہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسے پتھر کے اندر بیٹھ کر جس میں ایک سوراخ بھی نہ ہو، کوئی عمل کرے گا تو وہ لوگوں پر ظاہر ہو کر رہے گا خواہ عمل اچھا ہو یا برا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جس شخص نے عمل میں کوتاہی کی تو (آخرت میں) اس کا نسب کام نہ آئے گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہلاک ہوگیا وہ شخص جس کا آج، کل سے بہتر نہیں۔ ترقی یافتہ اقوام اپنے عمل کی بنا پر آج سر خرو ہیں جبکہ پستی کا شکار اقوام کو اپنی بے عملی کو کوسنا چاہیے۔ جب وسیع کائنات میں پھیلے میں اربوں تارے ہر وقت گردش میں ہیں اور کوئی چیز ساکن نہیں تو انسان جو مسجود ملائکہ ہے اور خلاق کائنات کی اس زمین پر اشرف المخلوقات ہے تو وہ کیسے بے عمل رہ سکتی ہے۔ اسی پیغام کو طلبہ علی گڑھ کے نام بھی علامہ نے عمل اور جدوجہد کا پیغام دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

عمل پیغام فکر اقبال کی روح ہے۔ جو بھی علامہ کے پیغام کو سمجھتا ہے اُس میں عمل و کرادر کی روح بیدار ہو جاتی ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو عمل کا پیغام دیا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے شاہین کی علامت کو اختیار کیا۔ خضر راہ میں انھوں نے مصروف عمل رہنے کو زندگی کا راز اور اصل پیغام قرار دیا ہے۔ انحطاط اور پستی سے عروج کا سفر صرف عمل سے ہی ممکن ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اَے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبال جس مرد مومن اور انسان کا تصور دیتے ہیں اور اس میں مستی کردار دیکھنا چاہتے ہیں وہ مسلسل جدوجہد اور عمل سے ہی ممکن ہے۔ پیغام عمل کے ضمن میں علامہ کے سارے پیغام کا نچوڑ اُن کے اس شعر میں ہے جس میں انھوں نے عملی زندگی میں کامیابی کا نسخہ ان تین عناصر کو قرار دیا ہے۔

یقینِ محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یورپ میں مہاجرین کی آمد

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں مہاجرین کی سے بڑی تعداد داخل ہو رہی ہے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد شام کے باشندوں کی ہے۔ شام کے علاوہ خطے کے دیگر ممالک کے باشندے اور افغانی بھی ان مہاجرین میں شامل ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان، بھارت اور دوسرے ممالک کے کچھ لوگ بھی یورپ میں بہتر معیار زندگی کی امید کے ساتھ کھٹن مراحل سے گذرتے ہوئے یورپ میں داخل ہو رہے ہیں۔ سویڈن آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ مہاجرین قبول کرنے والا ملک ہے۔ صرف ایک ہفتہ میں دس ہزار سے زائد افراد نے سیاسی پناہ کی درخواست ہے جن میں سب سے زیادہ افغانستان اور اس کے بعد شام کے باشندے شامل ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق تقریبا دو لاکھ مہاجرین کی سویڈن میں آمد متوقع ہے جس سے ملک میں رہائش اور دوسرے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اگرچہ سویڈن مہاجرین کو خوش آمدید کہہ رہا ہے لیکن ساتھ ہی حکومت نے متنبہ کیا تمام مہاجرین کو رہائش دینا ممکن نہیں اس لیے یورپ کے دوسرے ممالک بھی اس کار خیر میں حصہ لیں۔ سویڈن کے بعد جرمنی نے بڑی تعداد میں مہاجرین قبول کیے ہیں۔ جرمنی کے ساحلی شہر رسٹوک سے بحری جہاز سے روزانہ ایک ہزار کے قریب مہاجرین سویڈن میں داخل ہو رہے تھے لیکن اب سویڈش حکومت کی جانب سے ایسے اعلان کرنے کی وجہ سے یہ تعداد کم ہو کر چار

سو روزانہ رہ گئی ہے۔ سویڈن کی نسل پرست جماعت سویڈش ڈیمو کریٹ مہاجرین کی آمد کے خلاف ہے اور اُس نے مہاجرین کی آمد روکنے کے لیے سویڈن میں اشتہار بازی شروع کر رکھی ہے تاکہ رائے عامہ مہاجرین کی آمد کے خلاف ہو جائے۔ نسل پرست جماعت نے یونان کے جزیرہ Lesbosسویڈن اور دیگر مقامات جہاں سے مہاجرین کی سویڈن کی جانب پیش قدمی ہو رہی تھی وہاں بھی اشتہاری مہم چلائی کہ سویڈن میں مہاجرین کو رہنے کے یے کوئی رہائش نہیں ملے گی، وہاں حجاب پر پابندی ہو گی ،کام نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی مالی امداد ملے گی۔ سویڈش حکومت اور سیاسی جماعتوں نے اسے گمراہ کن قرار دیا اور کہا کہ یہ سویڈن کا تشخص خراب کرنے کی مذموم کوشش ہے۔

سویڈن کی حکومت ، سیاسی جماعتیں اور حقوق انسانی کی تنظیمیں مہاجرین کو سہولتیں فراہم کرنے میں اپنا کرادر ادا کر رہی ہیں۔ گرین پارٹی نے تجویز دی ہے کہ زیادہ تعداد میں غیر ہنر مند ملازمت کے مواقع پیدا کئے جائیں تاکہ مہاجرین اُس نے فائدہ اٹھا سکیں۔یورپ میں آنے والے مہاجرین کی جانب سے سویڈن کا انتخاب اس لیے کیا جا رہاہے کہ یہ ملک بہترین سماجی بہبود اور سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ سویڈن کسی بھی یورپی ملک کے مقابلے میں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ مہاجرین کو آباد کرتا ہے اور یہاں مستقل ویزہ ملنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ شامی مہاجرین کو سویڈن آمد پر مستقل ویزہ ملنے کی وجہ

سے وہ لوگ سویڈن پہنچنا چاہتے ہیں۔ بہت سے مہاجرین کے رشتہ دار پہلے سے ہی سویڈن میں رہ رہے ہیں اس لیے وہ بھی ادھر کا رخ کر رہے ہیں۔ مہاجرین کا سویڈن کی طرف رخ کرنے کی ایک وجہ سویڈن کی بین الاقوامی ساکھ، حقوق انسانی کے لیے کام اور بلند معیار زندگی ہے۔ مہاجرین کی موجود لہر سے قبل سویڈن میں رومانیہ کے باشدوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو یورپی یونین کے شہری ہونے کی وجہ سے آسانی سے سویڈن آجاتے ہیں اور یہاں آکر بھیک مانگنے کا کام کر رہے ہیں۔ اس وقت ہر بڑی دوکان، اسٹیشن اور عوامی مقامات پر رومانیہ باشندے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں اب سویڈن میں مہاجرین کے لیے عوامی حمایت میں کمی ہو رہی ہے یہاں تک کہ ملکی سطح پر حکمران جماعت سوشل ڈیموکریٹ مہاجرین کو خوش آمدید کہہ رہی ہے لیکن لوکل کونسلوں میں اسی جماعت کے رہنماء مہاجرین کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہے ہیں۔ اس صورت حال میں سویڈن کی حکومت نے مہاجرین کی آمد کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنی سرحدوں پر ملک میں داخل ہونے والوں کی پڑتال شروع کردی ہے۔ سب سے زیادہ نگرانی ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان ہوگی۔ سویڈش باشندوں سے کہا گیا ہے سفر کرتے وقت اپنے پاسپورٹ ساتھ رکھیں۔

یورپ میں اس وقت مہاجرین کے مسئلہ پر بہت شور ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مہاجرین کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا۔ مشرق وسطیٰ کے جن ممالک کے لوگ اب دربدر

پھر رہے ہیں چند ہی سال پہلے وہ اپنے اپنے ممالک میں باعزت زندگی بسر کر رہے تھے۔ عراق، لیبیا، شام، افغانستان اور خطے کے دیگر مماک کو آگ اور خون میں جھونکنے والے کون ہیں۔ حقوق انسانی کے علمبراروں نے وہاں بسنے والے انسانوں کے لیے زندگی بوجھ بنادی ہے۔ ان ممالک میں انہیں جمہوریت اور انسانی حقوق کی تڑپ تھی لیکن فلسطین اور کشمیر کے بارے میں کیوں ان کی آنکھیں اندھی، کان بہرے اور دل بے حس ہیں۔ جمہوریت کو اپنا نصب العین قرار دینے والوں کے کیوں دہرے معیار ہیں اور جب اسلامی دنیا میں اُن کی ناپسند جماعتیں عوامی حمایت حاصل کرتی ہیں انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مسلم دنیا کے حکرانوں کی حیثیت اورنگ زیب کے بعد آنے والے مغل حکمرانوں کی سی رہ گئی ہے۔ یہ محمد شاہ رنگیلے، شاہ عالم واکبر ثانی جیسے بے اختیار حکمران ہیں جو خود تو اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذار رہے ہیں لیکن عوام کے لیے جینا ایک جرم بن گیا ہے۔ دنیا میں حقوق انسانی کے معیار دہرے ہیں۔ علامہ اقبال نے لیگ آف نیشن کو کفن چوروں کا گروہ درست ہی قرار دیا تھا۔ اقوام مغرب جمہوریت کی آڑ میں جس طرح دوسری اقوام کو اپنا غلام بنارہی ہیں وہ بالکل عیاں ہے۔ مفاد پرستی اور منافقت کی اس روش کے بارے میں حکیم الامت ایک مدت پہلے ہی یہ کہہ گئے تھے کہ

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکرِ کلیسا کے سفیر !

الیکٹرے نیویا میں فکر اقبال کا فروغ

علامہ اقبال خوش نصیب ہیں کہ اُن کے چاہنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں اور اگر برصغیر کی کسی شخصیت پر دنیا کی درسگاہوں میں عملی اور تحقیقی کام ہو رہا ہے تو وہ بلاشبہ علامہ اقبال ہیں۔علامہ اقبال کی عالمگیر مقبولیت اُن کے شاعر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اُن کے پیغام اور افکار کے باعث ہے۔اُن کے پیغام کا منبع قرآن حکیم کی تعلیمات اور عشق مصطفےٰ ﷺ ہے۔علامہ نے خدا سے جو یہ دعا کی تھی کہ

خدایا آرزو میری یہی ہے میرا نور بصیرت عام کر دے

میرے خیال میں یہ بارگاہ ایزدی میں اس دعا کی قبولیت کی سند ہے جو دنیا بھر میں فکر اقبال کا فروغ جاری ہے۔علامہ اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہیں کہ وہ واحد مسلم مفکر ہیں جن کا تمام مکاتب فکر نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ جب تک واعظین کلام اقبال کو شامل نہ کرلیں اُن کا خطاب مکمل نہیں ہوتا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ جب زندہ تھے تو انہیں علماء کی جانب سے شدید محاذ آرائی نہ صرف سامنا تھا۔علامہ نے بھی جب کبھی موقع ملا اُن پر خوب چوٹیں کیں۔بحرحال یہ امر باعث مسرت ہے اب مذہبی حلقوں اور تمام مکاتب فکر کے علماء فکر اقبال کے مداح ہیں اور اسے اسلام کا پیغام قرار دے کر اپنے واعظ کا

لازمی جزو بناتے ہیں۔ دور حاضر میں فرقہ واریت اور انتہا پسندی کی فضا میں فکر اقبال اتحاد اور امن کا درس یاد دلاتی ہے جس کا فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

اسکینڈے نیویا میں جناب غلام صابر نے فکر اقبال کے فروغ کا بیڑا اٹھایا اور ۲۰۰۲ء میں انھوں نے اقبال اکیڈمی اسکینڈے نیویا کی بنیاد رکھی ۔یہ اقبال اکیڈمی لاہور کی واحد شاخ ہے جو پاکستان سے باہر قائم کی گئی۔ غلام صابر ایک سچے عاشق اقبال ہیں اور انھوں نے عملی طور پر اس کا حق ادا کیا ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے تحقیقی مصنف ہیں انھوں نے اقبال شاعر فرد اعلاوہ ایک ڈینش فلاسفر کو علامہ کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے Iqbal and Kierkegaard کتاب لکھی جو علمی ادبی اور تحقیق کے میدان میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے ایک اور کتاب Iqbal Religion of the New Age لکھی ہے جس پر انہیں صدر پاکستان کی جانب سے تمغہ اور سند حسن کارکردگی ملی ہے۔ گذشتہ تیرہ سال سے باقاعدگی سے دو مرتبہ یوم اقبال کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ اپریل میں اردو اور نومبر میں انگریزی زبان میں ہونے والے ان تقاریب میں دینا بھر سے علمی ادبی اور اقبال شناس شخصیات شرکت کرتی ہیں۔ ڈنمارک میں مقیم مختلف ممالک کے سفیر بھی اکثر اوقات یوم اقبال میں شرکت کرتے ہیں۔ سال ۲۰۰۶ء میں غلام صابر صاحب نے بہت محبت سے مجھے نہ صرف مدعو کیا بلکہ تقریب کا مہمان

خصوصی بنا دیا جو میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ کچھ عرصہ سے ماہ نومبر میں ہونے والے یوم اقبال کی تقریب کوپن ہیگن میں قائم کرسچیئن اسلامک سٹڈی سینٹر میں منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سینٹر کی ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر لیسی راسموسن ہیں ۔ وہ کوپن ہیگن یونیوسٹی کے یورپ اور اسلام کے بارے میں قائم مرکز سے وابسطہ ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کا ڈینش زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

اسکینڈے نیویا میں فکر اقبال پر سب زیادہ کام ڈنمارک میں ہوا ہے جو اب بھی جاری ہے۔ وہیں ڈاکٹر ارم خواجہ نے علامہ اقبال اور رومی پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ کوپن ہیگن میں نوجوان عثمان ملک علامہ اقبال پر ایک دستاویزی فلم بنا رہے ہیں۔ سویڈن کے جنوبی شہر لند میں سویڈش ایشین سٹڈیز نیٹ ورک میں اقبالیات پر کام ہو رہا ہے۔ ہم نے نومبر ۲۰۰۷ء میں سٹاک ہوم سٹڈی سرکل کی بنیاد بھی علامہ کے یوم ولادت کو مناتے ہوئے رکھی اور ہر ماہ ہونے والی نشست میں علامہ کے پیغام کو شامل کیا جاتا ہے۔ سفارت خانہ پاکستان سویڈن نے بھی اس سال پہلی مرتبہ سفیر پاکستان جناب طارق ضمیر کی ذاتی دلچسپی کے باعث یوم اقبال منایا اور توقع ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ناروے میں فرحان شاہ اوسلو یونیوسٹی میں اقبالیات میں پروفیسر سیفت بیک تو ویک کی نگرانی میں ایم اے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سال نومبر میں کوپن ہیگن میں ہونے والے یوم اقبال پر انہوں نے تصور خدا اور اس کے معاشرہ پر

اثرات اور فکر اقبال کے حوالے سے بہت اہم مقالہ پیش کیا۔ اس تقریب میں معروف ماہر اقبالیات اور بہت سی کتابوں کے مصنف جناب پروفیسر محمد شریف بقا نے علامہ اقبال بحیثیت ایک سماجی مصلح پر اظہار خیال کیا۔ سامعین نی اُن سے بہت سے سوالات کئے جن کے انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے جوابات دیئے۔ اس تقریب میں شرکت کرنے کے ساتھ ڈنمارک میں پاکستان کے سفیر جناب مسرور احمد جونیجو، سید اعجاز حیدر بخاری کونسلر لوکل کونسل، ہاشی خان، عابد علی عابد اور دیگر احباب سے ملنے کو موقع ملا۔

نوجوان اور علامہ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والے جن میں کچھ ڈینش باشندے بھی شامل ہیں اس تقریب میں شریک تھے۔ یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا سے ڈاکٹر امینہ خان اس سیمنار میں تشریف نہ سکیں ان کے متبادل برطانیہ سے آئے ہوئے اشرف چوہدری نے اظہار خیال اور سامعین نے بھی اُن سے خوب سوالات کیئے۔ نوجوان سکالر نوید بیگ نے اسلامک کونسلنگ کے حوالے سے تفصیلات بیان کیں اور انھوں نے کہا کہ یہ ماڈل یورپ کے دیگر ممالک میں اپنایا جاسکتا ہے۔

یوم اقبال کی اس تقریب میں جناب غلام صابر خرابی صحت کے باوجود شریک ہوئے اور تمام مہمانوں سے ملے۔ انھوں نے مختصر افتتاحی کلمات میں علامہ اقبال کے خطبات کا ایک خوبصورت اقتباس پیش کیا اور کہا کہ تمام انسان مخلوق خدا ہے اس لیے کسی سے بھی نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سفیر پاکستان جناب

مسرور احمد جونیجو نے غلام صابر صاحب کو تجویز پیش کی کہ آئندہ سے یوم اقبال مشترکہ طور پر سفارت خانہ پاکستان میں منایا کریں، جس پر اتفاق کیا گیا۔ تیرہ برس قبل جناب غلام صابر نے فکر اقبال کی جو شمع روشن کی تھی اس کی لو بڑھتی جا رہی ہے اور اس سے نہ صرف اسکینڈے نیویا بلکہ دیگر ممالک میں رہنے والے بھی مستفید ہو رہے ہیں۔

کیا اہل مغرب دہشت گردی کی اصل وجوہات جانتے ہیں

گذشتہ دو دہائیوں سے دنیا میں دہشت گردی کی فضا طاری ہے اور مغربی و امریکی میڈیا اپنے عوام اور دنیا بھر کو یہ باور کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ مسلمان ہی اس دہشت گردی کا باعث ہیں اور اس وجہ اسلام کی تعلیمات ہیں جو انہیں انتہا پسندی پر اکساتی ہیں۔ دنیا میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات اور میڈیا کے اس پروپوگنڈا کے بعد کیا واقعی اہل مغرب مسلمانوں کو انتہا پسند اور دہشت گر سمجھتے ہیں ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں سٹاک ہوم کے نواحی علاقہ فنیا میں انتہا پسندی کے موضوع پر ہونے والے اجتماع میں شرکت کے لیے جانے کا موقع ملا۔ یہ اجتماع سویڈن میں مختلف ممالک کے تارکین وطن کی اٹھائیس تنظیموں کے اتحاد نیشنل ایمگرنٹ فورم کی جانب سے مشترکہ طور پر منعقد کیا گیا۔ اس کے سربراہ جعفر مغل اور پروگرام کے منتظم سائیں رحمت علی نے اس سلسلہ میں کافی تیاری اور محنت کی۔ سویڈن کی اہم شخصیات کو ڈسکشن پینل میں شامل کیا جنھوں نے انتہا پسندی کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور جس کے بعد شرکاء نے اُن سے سوالات بھی کیئے۔ پینل میں راقم (عارف کسانہ) کے علاوہ سویڈش رکن پالیمنٹ اور گرین پارٹی کے سماجی و سیاسی امور کے ترجمان سٹیفن نیلسن، پروفیسر جان یرپے، پروفیسر ماتھیاس گارڈل، سیاسی اور تنازعاتی امور کے ماہر

فیلیکس انوگو اور امام حسنین گوانی تھے۔ سویڈش سوشل ڈیموکریٹ کی سابق سربراہ اور انتہا پسندی کے تدارک کے لیے قومی کوآرڈینیٹر مونا سیلن سیکورٹی وجوہات سے شرکت نہ کر سکیں۔ اس اہم پروگرام کی نظامت انتہا پسندی کے امور کے ماہر پروفیسر مائیکل میک ایکرینس نے بہت خوبصورتی سے کی۔ پروفیسر جان یرپے سویڈن میں اسلامک سٹیڈیز کے پہلے پروفیسر ہیں جو لند یونیورسٹی میں ۱۹۸۳ء تک تعلیم و تحقیق میں مصروف رہے۔

انہوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی کتب لکھی ہیں جن میں پولیٹیکل اسلام اور اسلامی دنیا شامل ہیں۔ وہ سویڈن میں اسلام اور مشرق وسطیٰ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اور وہ سویڈش وزارت خارجہ کے مشیر بھی رہے ہیں۔ پروفیسر ماتھیاس گارڈل سویڈن کی اپسالا یونیورسٹی میں تقابل ادیان کے شعبہ سے وابستہ ہیں اور بہت سی کتب کے مصنف ہیں جن میں اسلام فوبیا اور اسامہ بن لادن ہمارے دلوں میں شامل ہیں۔ وہ حقوق انسانی کے علمبرادر ہیں اور تین دفعہ غزہ کی ناکہ بندی توڑنے والے بحری جہاز میں سوار ہو کر وہاں پہنچنے کی کوشش کی۔ انہیں سویڈن کا سب سے بڑا ادب کا انعام بھی مل چکا ہے۔ اس اہم پینل کے ساتھ انتہا پسندی کے حوالے سے پروگرام میں شرکت بہت اہمیت کی حامل رہی اور شرکاء نے بھی دلچسپی لی۔

کیا سلام میں انتہا پسندی کی گنجائش ہے اور اس سلسلہ میں قرآنی تعلیمات کیا ہیں۔ اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے راقم نے بہت سی قرآنی آیات پیش کیں

جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کسی پر کوئی جبر نہیں اور جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے۔ قرآن حکیم میں رسول پاکؐ سے بھی کہا گیا کہ آپ کو داروغہ نہیں بنا کر بھیجا گیا اور نہ ہی آپ کسی پر زبردستی کر سکتے ہیں۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ۔ دوسروں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرو۔ کسی کی جان لینے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ ہر ایک اپنے عقیدہ کے مطابق زندگی بسر کرے۔ ان تعلیمات کے باوجود کچھ مسلمان کیوں انتہاپسندی میں ملوث ہیں۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم اور اسوہ حسنہ پر عمل پیرا نہیں۔ جو لوگ دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ فتنہ خوارج کا تسلسل ہے۔ مسلمانوں میں سے ایک فی صد سے بھی کم لوگ ایسی کاروائیوں میں ملوث ہیں جس مطلب ہے کہ مسلمانوں نے دہشت گردی کو مسترد کیا ہے۔ خود مسلمان دہشت گردی کا شکار ہیں اور ان کاروائیوں میں جان بحق ہونے والے مسلمان ہیں۔ یہ سب اسلام دشمنوں کی کارستانی ہے جس کا آلہ کار کچھ مسلمان ہونے کے دعویٰ دار ہیں دنیا میں ناانصافی انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے جس کا نتیجہ دہشت گردی ہے۔ امن کے لیے دنیا میں عدل و انصاف لانا ہوگا۔ عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ دنیا کے وہ مسائل جو مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں انہیں حل نہیں کیا جاتا جیسے فلسطین اور کشمیر جو کہ ۱۹۴۸ء سے اقوام متحدہ کیا یجنڈا پر ہیں۔ لاکھوں کشمیریوں کی

قربانیاں عالمی ضمیر کو کیوں بیدار نہیں کر سکیں۔ ساٹھ لاکھ کشمیری اب بھی مہاجر ہیں۔ عالمی طاقتیں کیوں مسئلہ کشمیر اور فلسطین حل نہیں کرتیں۔ اقوام عالم کیوں دہرا معیار رکھتی ہیں۔ پیرس کی دہشت گردی کی بھرپور مذمت ہو رہی اور ہونی بھی چاہیے لیکن گذشتہ سال پشاور میں ۱۴۱ افراد جن میں ۱۳۲ بچے تھے اس پر دنیا نے کیوں ایسا ردعمل نہ دیا۔ افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت سے پہلے دنیا میں اس نوعیت کی انتہا پسندی اور دہشت گردی نہیں تھی۔ طالبان، القائدہ، داعش اور دوسروں کو بنانے والے پشت پناہی کرنے والے کون ہیں۔ انہیں اسلحہ، جدید ترین فوجی ساز و سامان، طبّی اور دیگر سہولتیں کون مہیا کرتا ہے۔ افغانستان ، عراق، لیبیا اور شام میں فوجی مداخلت سے کیا حاصل ہوا ہے۔ اب طالبان سے دوستی کرکے انہیں داعش کے خلاف استعمال کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں تو کل کس کی باری ہوگی۔ شرکاء نے میرے ان خیالات کو پسند کیا اور بعد میں یہ سویڈش پریس میں شائع ہوئے ہیں۔

حسنین گوانی نے کہا کہ یہ مسلمانوں کو کیوں کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کی نئی تعبیر کریں۔ اس کا مطالبہ دیگر مذاہب سے کیوں نہیں کیا جاتا حالانکہ اُن کے لوگ بھی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سویڈن میں مساجد یہاں کے ٹیکس کے پیسوں سے بنیں اور بیرونی امداد بند ہونی چاہیے۔ پینل کے شرکاء اس بات پر متفق تھے کہ حالیہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کی وجوہات مذہبی نہیں

بلکہ سیاسی ہیں۔ مسلمان دہشت گرد نہیں۔ پیرس میں ہونے والے واقعہ پر بھی کئی سوالیہ نشانات ہیں۔ ہمیں معاشرہ سے انتہا پسندی کو ختم کرتے ہوئے بھائی چارہ کو فروغ دینا ہوگا۔ معاشرہ میں رواداری، مکالمہ اور باہمی رابطے بڑھانا ہوں گے۔ مقامی اور تارکین وطن کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے سے مزید دوریاں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں پروفیسر جان یرپے نے کہ کہ داعش کی دولت اسلامیہ کو دولت ابلیس کہنا چاہیے۔ سویڈش رکن پارلیمنٹ سٹیفن نیلسن نے سویڈش حکومت کی ان کوششوں کا ذکر کیا جو وہ انتہا پسندی کے خاتمہ کے لیے کر رہی ہے۔ حاضرین میں موجود کامن گراونڈ تنظیم کے بانی اور مسیحی مبلغ اور مصنف ایمانویل راتق نے کہا کہ قرآن حکیم امن اور بھائی چارے کی تعلیمات دیتا ہے اور اہل کتاب ملت ابرحیمی ہونے کی وجہ سے آپس میں امن اور دوستی سے رہیں۔ پروگرام کے منتظمین جعفر مغل اور سائیں رحمت علی نے کہا کہ سویڈن کے دور دراز علاقوں سے شرکاء کی آمد اور دلچپسی سے شرکت اس بات کا مظہر ہے کہ انتہا پسندی کے خاتمہ کے لیے سب کوشاں ہیں۔ سویڈش معاشرہ ایک پرامن معاشرہ رہا ہے اور ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے قائم رکھیں۔ انہوں نے کہا مستقبل میں مزید ایسے پروگرام منعقد کئے جائیں گے۔ شرکاء میں پاکستان کے سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر غلام حسین بھی شامل تھے۔

خصوصی افراد کے ساتھ ہمارا رویہ اور دینی تعلیمات

اللہ تعالٰی نے قرآن حکیم نے سورہ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے خوف ، بھوک ، مالوں ، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں۔ جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں: بیشک ہم بھی اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے پے در پے نوازشیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔اسی حوالے سے حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب ان لوگوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے، ان کے مصائب کے عوض جو اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام و چین سے رہے، حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور ہم بھی ایسے ہی اجر وثواب کے مستحق قرار پاتے۔ جامع ترمذی میں ہی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے بعض بندوں پر مصائب اور حوادث آتے رہتے ہیں ۔ کبھی جان پر، کبھی مال پر اور کبھی اولاد پر ، یہاں تک کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے حضور میں اس حال میں پہنچتے ہیں کہ ان کا ایک گناہ بھی باقی نہیں ہوتا۔ مسند احمد اور سنن ابو داؤد میں ہے کہ رسول پاکؐ نے فرمایا کہ کسی بندہ مومن کے لیے اللہ تعالٰی کی طرف سے ایسا بلند مقام طے

ہوتا ہے جس کو وہ اپنے عمل سے نہیں پا سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پھر اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے یہاں تک کہ ان مصائب و تکالیف اور ان پر صبر و برداشت کی وجہ سے اس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اس کے لیے پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

قرآن و حدیث کی ان تعلیمات کی روشنی میں وہ افراد یا گھر انعامات ز خداوندی کے مستحق ہوں گے جو خصوصی افراد کی خوش دلی سے نگہداشت، پرورش اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ والدین نے تو اپنے خصوصی بچوں کی پرورش کرنا ہی ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو خصوصی افراد کو اپنا جیون ساتھی بناتے ہیں ان کی تعریف کے لیے الفاظ ناپید ہیں۔ یقیناً وہ اپنے رب کے ہاں اعلیٰ اجر و مقام پائیں گے۔ جسمانی معذوری، پیدائشی اور حادثاتی ہو سکتی ہے۔ پیدائشی معذوری وراثتی اثرات، جینیاتی وجوہات اور چند دوسرے عوامل کی وجہ سے ہوتیہے اور یہ ایک قدرت کے قانون کے تحت ہوتا ہے جس میں کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کوئی بد دعا، عذاب، آسیب یا جادو ٹونہ نہیں ہے۔ اسلام نے اس جہالت کا بھی قلع قمع کیا کہ خصوصی افراد منحوس اور کم تر ہیں لیکن اس کے باوجود برصغیر میں معذور افراد کے ساتھ عمومی سماجی رویہ بہت نامناسب ہے جو اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اصولوں کے سراسر منافی ہے۔ شادی کے موقع پر قربانی کے جانوروں کی

معائینہ کیا جاتا ہے اور معمولی سے بھی جسمانی نقص کی وجہ سے رشتہ قبول نہیں کیا جاتا۔ معذور افراد کے جن اعضا میں نقص ہو، اُن کی بنیاد پر اُن کے نام رکھ دیے جاتے ہیں اور وہ اُن کی پہچان بنا دیے جاتے ہیں۔ اسٹیج شور، ٹی ٹاک شو اور ڈراموں میں

معذوری، قد، رنگ اور جسمانی اعضا کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور سب اس سے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ جو کہ سراسر انسانیت کی تذلیل کے مترادف ہے اور قہر خداوندی کو دعوت ہے۔ یہ خصوصی افراد جو پہلے ہی دکھوں اور پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا مذاق اڑایا جائے، تو وہ مزید ڈپریشن و تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجرات میں تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاو۔ ہو سکتا ہے کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی ایک دوسرے کے بُرے نام رکھو اور بے عزت کرو۔ کیونکہ ایمان لانے کے لیے برا نام رکھنا گناہ ہے۔ میڈیا پر خصوصی افراد اور جسمانی و ذہنی نقائص کا مذاق اڑانے والوں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ کسی مہذب معاشرے میں یہ سب نہیں ہوتا۔ جو آج صحت مند ہیں انہیں کیا پتہ کہ کل کوئی حادثہ ہو اور وہ بھی معذوری کا شکار ہو جائیں۔ کسی خبر ہے کہ ان کے ہاں پیدا ہونے والی اولاد جسمانی یا ذہنی نقص کی حامل نہیں ہوگی۔ اہل یورپ پر خدا جو نوازشات ہیں ممکن ہے اُن میں سے ایک وجہ ان لوگوں اور معاشرے کا معذور افراد کے ساتھ مساوی بلکہ بہتر اور باعزت رویہ ہے۔ اسلام نے خصوصی افراد کے ساتھ جو سلوک کرنے کا حکم

دیا ہے اُس کا عملی اظہار اہل مغرب کر رہے ہیں۔یورپ میں خصوصی افراد کے لیے مثالی سہولتیں اور عزت واحترام ہے ممکن ہے کہ اسی وجہ سے رب کریم نے وہاں کے لوگوں پر نوازشات کی ہیں۔

اقوام متحدہ کی ہدایت پر معذور افراد کو خصوصی افراد قرار دیا گیا۔ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں دس فیصد افراد کسی نہ کسی معذوری کا شکار ہیں ۔اقوام متحدہ نے ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۲ء میں تمام رکن ممالک پر زور دیا کہ وہ خصوصی افراد کو صحت، تعلیم اور ملازمت کے مواقع عام افراد کے برابر دیں۔اہل مغرب نے ان سفارشات پر عمل کیا ہے اور خصوصی افراد کو باعزت مقام دیتے ہوئے ہر ممکن سہولیات دی ہیں۔ اسلامی ممالک کو تو اس میں سرفہرست ہونا چاہیے تھا کیونکہ اسلام کسی شخص کے جسمانی نقص یا کمزوری کی بنا پر اُس کی عزت و توقیر اور معاشرتی رُتبہ کو کم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔بہت سے ایسے واقعات اور احکامات موجود ہیں جن کی بنیاد پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کو دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ عزت بخشی ہے۔ایک موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں رؤسائے مشرکین کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اتنے میں نابینا صحابی حضرت عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ تعالی عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسروں سے مصروف گفتگو ہونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عبداللہ

بن اُم مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ نہ ہو سکے تو اِس عدم توجہی پر یہ سورہ عبس کی آیات نازل ہوئیں۔ خصوصی افراد کسقدر توجہ اور معاشرتی مقام کے حقدار ہیں، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے واقعہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپؓ اُسے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھا۔ اُس نے جواب دیا کہ موتہ کی لڑائی میں میرا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا اس لیے میں بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہوں۔ یہ سن کر آپؓ رونے لگے اور پاس بیٹھ کر اُس سے پوچھنے لگے کہ تمہارے کام کون کرتا ہے اور تمہاری دیگر ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں؟ تفصیلات معلوم ہونے پر آپؓ نے اس کے لیے ایک ملازم لگوا دیا۔ اسے ایک سواری دلوائی اور دیگر ضروریاتِ زندگی بھی مہیا کیں۔ خصوصی افراد کے لیے معاونت کی اولین مثال ہوگی جسے یورپ کے اپنے ہاں اپنایا ہوا ہے۔ انفرادی اور معاشرتی دونوں سطحوں پر ہمیں خصوصی افراد کے حوالے سے اپنے رویے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ خصوصی افراد کا طنز و مزاح کا موضوع بنانے کی بجائے انہیں عزت و توقیر اور محبت دیں۔ کسی ایک دکھی دل کو شاد کرنے سے رب کی طرف سے رحمتوں کا نزول ہوگا جس سے یہاں آسانیاں اور خوشگوار زندگی نصیب ہوگی اور جس کا اجر آخرت میں بھی مقدر ہوگا۔

ماحولیات اور اسلامی تعلیمات

نسل انسانی کو اپنی بقا کے لیے سب سے بڑا خطرہ ماحولیاتی آلودگی سے ہے جس کا سبب بھی خود حضرت انسان ہی ہے جس نے اس کرہ ارض کے حسن اور قدرتی توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ موسمیاتی تبدیلیاں، درجہ حرارت میں اضافہ، سیلاب، خشک سالی، طوفان، سمندری سطح میں اضافہ، ماحولیاتی آلودگی، سیلاب اور دیگر قدرتی آفات سے ہمارا پالا پڑ رہا ہے۔انسانی عوامل کی وجہ سے آلودگی اور درجہ حرارت میں اضافہ ہوا ہے۔ گرین ہاوس گیسوں بطور خاص کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج ، حدت میں اضافہ سے قطبین میں برف پگھلنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ۲۰۱۵ء گرم ترین سال ثابت ہوا ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اس کرہ ارض پر زندہ رہنا محال ہو گا۔ ان تبدیلیوں کے اثرات نسل انسانی کی بقا پر مرتب ہو رہے ہیں اور بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پیچیدہ جینیاتی بیماروں کے ساتھ

بانجھ پن کے مسائل بھی سامنے آرہے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کے سبب مردوں کے مادہ منویہ میں نطفہ (Sperms) کی تعداد میں کمی واقع ہورہی ہے جس سے نسل انسانی کے بقا کو خطرہ درپیش ہے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اقوام عالم مل کر کوئی قابل عمل منصوبہ تیار کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اقوام متحدہ نے پانچ جون کو ماحولیات کا عالمی دن قرار دیا۔ ۲۰۰۹ء میں کوپن ہیگن میں عالمی کانفرنس منعقد ہوئی اور اب اس ماہ دسمبر ۲۰۱۵ء) میں پیرس میں ہونے والی کانفرنس میں ۱۹۵ ممالک کے سربراہان اور) سیاسی رہنما اس کانفرنس میں شریک ہوئے جبکہ ہزاروں ماہرین بھی موجود تھے۔ اس اجلاس کے دوران زیادہ تک گفتگو کا محور عالمی درجہ حرارت میں اضافے کو دو سنٹی گریڈ تک محدود کرنا تھا۔ ان سطور کے لکھنے تک کانفرس جاری تھی اور مندوبین کسی معائدے کے مسودہ کے لیے متحرک تھے۔ سویڈن نے پچیس کروڑ سویڈش کرونا ماحولیات کے لیے مختص کیے ہیں۔ اس سے قبل چار ارب سویڈش کرونا دیئے جا چکے ہیں جبکہ دس کروڑ کرونا کی مدد کم ترقی یافتہ ممالک کو دی گئی ہے. ماحولیاتی آلودگی کم کرنے کے لیے سویڈن ایک منصوبہ پر کام کر رہا ہے جس کے تحت ۲۰۳۰ء تک یہ دنیا پہلا ملک ہوگا جو پٹرول اور اس کی مصنوعات کا استعمال ترک کر دے گا۔

ماحولیاتی مسائل کی وجہ سے نسل انسانی کو اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے، دین اسلام جو ایک مکمل اور آخری دین ہے اس نے ان مسائل اور معاملات کے بارے میں

اہم تعلیمات دی ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان جسے خدا نے اس زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور بقولِ اقبال زوالِ آدمِ خاکی تو خود خدا کا زیاں ہے۔ خدا نے اپنی آخری وحی میں اور ختم المرسلین ﷺ نے اپنی ارشادت میں اس بارے میں جو تعلیمات دی ہیں انہیں ہم فراموش کیے بیٹھے ہیں اور نہ اُن پر غور کرتے ہیں۔ منبر و محراب اور ہمارے مذہبی حلقوں نے بھی ماحولیات کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ جب ہم قرآن حکیم کی روشنی میں اس کائنات پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی خدا کا بنایا ہوا قانون نافذ العمل ہے (۲۲،۲۱)۔ کوئی بھی قوانینِ فطرت میں تبدیلی نہیں کر سکتا اور خدا کے اس بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی زمین فساد پھیلانے کے مترادف ہے۔ خدا کے قوانین کی اعلانیہ مخالفت اور سرکشی شرک کے مترادف ہے جس کا نتیجہ فساد فی الرض ہے۔ قرآن حکیم نے فساد اور اصلاح دو اصطلاحات بیان کی ہیں جو ایک دوسرے کی متضاد ہیں۔ فساد کا معنی درست حالت میں نہ ہونا، تناسب میں بگاڑ ہونا Distruction ,Disorder, Chaos, ہے۔ قرآن حکیم نے زمین میں فساد پھیلانے سے منع کیا ہے۔ زمین میں فساد پھیلانے سے مراد اس کے قدرتی حسن کو تباہ کرنا اور تناسب کو بگاڑنا بھی ہے۔ یہ انسانی بقا اور ماحولیات کے مسائل پر قابو پانے کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ بہت سے لوگ اس بات کا شعور ہی نہیں رکھتے کہ کہ زمین میں فساد پھیلا رہے ہیں (۲،۱۲)۔ رب العزت نے کائنات کی تخلیق کرنے کے بعد اس کی حفاظت کا بھی نظام بھی بنایا

جس طرف سورہ الرحمٰن کی ساتویں اور آٹھویں آیت میں اشارہ کیا ہے۔ اگر زمین کے گرد کرہ ہوائی نہ ہوتا تو زمین کا درجہ حرارت منفی ۵۱ ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا۔ کرہ ہوئی سطح زمین سے سات میل Trofosphere ایک ہزار میل تک اوپر جاتا ہے۔ پہلی تہہ دوسری تہہ اس میں ہوا گردش نہیں کرتی Stratosphere اوپر ہے۔ موسمیات کا خطہ تیسری تہہ ہے یہ بہت اہم ہے اس میں Mesophere ہے اس لیے یہ گرم ہے۔ اوزون گیس ہے۔ جسے قرآن نے میزان سے تعبیر کیا ہے۔ یہ زیادہ توانائی کی لہروں کو آسمان سے زمین تک نہیں پہنچنے دیتی۔انسانی کاروائیوں سے گرین ہاوس گیسوں کے بے انتہا اخراج سے اس تہہ کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا میں تبدیلیاں C اس سے اوپر خلا ہے جہاں درجہ حرارت Ionoshere آرہی ہیں۔ چوتھی تہہ ہے۔دفاعی رکاوٹیں جو زمین تک مہلک قوتوں مثلاً کاسمک ریز، گاما ریز، ایکس 1600 ریز، الٹراوائیلٹ اور گرمی وغیرہ کی لہروں کو روک لیتی ہیں۔انہیں روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیمانے مقرر کیے ہیں جن کا قرآن میں بار بار ذکر آتا ہے۔ مثلاً ہم نے سماءالدنیا کو روشن چراغوں سے مزین کر رکھا ہے اور اسے سرکش قوتوں کو مار بھگانے والا بنایا ہے(۲۱،۳۲)۔ سورہ فصلت کی (Rebellious Forces) آیت ۱۲ میں ہے اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کئے ہوئے) اندازے ہیں۔ سورہ ملک کی آیت تین اور چار میں اس کائنات کے نظام اور حفاظت کا کیا سائنسی اور عقلی انداز میں بیان کیا۔ ارشاد ہوتا

ہے کہ جس نے سات (یا متعدد) آسمانی کرّے باہمی مطابقت کے ساتھ (طبق دَر طبق) پیدا فرمائے، تم (خدائے) رحمان کے نظامِ تخلیق میں کوئی بے ضابطگی اور عدم تناسب نہیں دیکھوگے، سو تم نگاہِ (غور و فکر) پھیر کر دیکھو، کیا تم اس (تخلیق) میں کوئی شگاف یا خلل (یعنی شکستگی یا اِنقطاع) دیکھتے ہو تم پھر نگاہِ (تحقیق) کو بار بار (مختلف زاویوں اور سائنسی طریقوں سے) پھیر کر دیکھو، (ہر بار) نظر تمہاری طرف تھک کر پلٹ آئے گی اور وہ (کوئی بھی نقص تلاش کرنے میں) ناکام ہوگی۔ سبحان اللہ۔ اگر زمین پر دباؤ نہ ہوتا تو ہم یہاں عدم توازن کی وجہ سے رہ ہی نہ سکتے۔ صرف ایک منٹ دماغ کو آکسیجن نہ ملے تو اس کے خلیات مرنا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر یہ سلسلہ تین منٹ تک جاری رہے تو انتہائی شدید نقصان پہنچتا ہے جو موت تک جا پہنچتا ہے۔ زمین میں ماحولیات کے مسائل خود انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں نوع انسانی کو آگاہ کیا گیا ہے کہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کارستانیوں سے خشکی و تری ہر جگہ ناہمواریاں اور خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں (۳۰،۹)۔ سورہ حٰم السجدہ میں اسی موضوع کو دہرایا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اگر کسی نے ایک پودا لگایا اس پودے کو انسان اور جانور جب تک کھاتے رہیں گے یا اس سے انسانوں کو فائدہ (سایہ کی صورت میں) ملتا رہے گا تو اس کا اجر اس شخص کو ملتا رہے گا۔ رسول اکرم ﷺ

کی تعلیمات میں درختوں کو کاٹنے کی واضح ممانعت آئی ہے۔ حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی درخت کاٹنے سے منع کیا گیا ہے مسلمان فوجوں کو اس بات کی ہدایت تھی کہ وہ شہروں اور فصلوں کو برباد نہ کریں۔ نبی آخر الزماںؐ کی تعلیمات ہمیں اعتدال پسندی کی تلقین کرتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اعتدال اختیار کرو۔ گویا انسانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال مثلاً کھانے، پینے، کمانے، خرچ کرنے، صنعتی پیداوار اور اس کے استعمال، وغیرہ سب میں جس کا تعلق قدرتی وسائل سے آتا ہو اور آخر کار جو ماحول پر اثر انداز ہوتے ہوں، ان سب میں حد درجہ اعتدال سے کام لیں۔ امام ابو یوسف کے نزدیک وہ شخص جو قدرتی ماحول کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھتا، اسلامی شریعت کے نفاذ کے مناسب طریقہ کار کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ زمین اور اس کی فضا کو آلودگی سے بچائیں اور اس میں اپنا کردار ادا کریں اور ہر اُس عمل سے اجتناب کریں جس سے زمین کے حسن اور ماحولیات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

میلاد مسیحؑ و مصطفےٰ ﷺ

اس سال حضرت عیسیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی ولادت کے دن ایک ہی ماہ میں بلکہ ایک دن کے فرق سے آ رہے ہیں۔اللہ کے ان دو عظیم رسولوں نے دنیا سے ظلم، ناانصافی، جبر اور انسانوں کے انسانوں پر تسلط کو ختم کرکے انقلاب برپا کیا۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ دونوں کی دعوت اور حیات آفرین پیغام پر غریبوں اور مظلوم طبقہ نے لبیک کہا جبکہ بالادست سرمایہ دار اور مذہبی پیشوائیت نے زبردست مخالفت کی۔ یہ طبقات اس لیے مخالفت کررہے تھے کہ اگر یہ دعوت انقلاب مقبولیت عام اختیار کر گئی تو ہمارا مقام و مرتبہ ختم ہوجائے گا اور جن کا ہم استحصال کررہے ہیں وہ آزادی حاصل کرلیں گے۔کفار مکہ رسول اکرم کی مخالفت اور آپ کے جانی دشمن بتوں کی عبادت سے منع کرنے کی وجہ سے نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں اپنے استحصالی نظام کا خاتمہ نظر آرہا تھا جسے علامہ اقبال نے نوحہ ابو جہل کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ انسانوں کی رہنمائی کے لیے وحی کی صورت میں جو رشد و ہدایت کا سلسلہ دور اولین سے شروع ہوا اور حضرت نوحؑ سے ہوتا ہوا حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام تک پہنچا اور رسول اکرمؐ پر آکر ختم ہوا۔ تمام پیغمبر ایک ہی دعوت دیتے تھے جسے قرآن حکیم نے سورہ التین کی ابتدائی آیات میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہیکہ جو صدائےحق حضرت موسیٰؑ نے کوطور سے بلند کی اور جسے کوہ

زیتون سے حضرت عیسیٰؑ نے دہرایا وہی پیام حق شہر مکہ سے پیغمبر آخر الزماںؐ نے دنیا والوں کو دیا۔ حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ میں تمھاری ایسی تربیت کروں گا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ہو جائے گی۔ جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ہو جائیں گی (3: 49)۔ میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میں تم میں ایسی روح پھونکوں گا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ہو جائیں گی۔ اقبال کے الفاظ میں۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری بیا من باتو آموزم طریق شاہبازی را

حضرت عیسیٰ کا عبرانی نام یسوع جس کا معنی سردار، عیسیٰ بھی اسی سے نکلا ہے۔ یونانی مسیح ان کا لقب ہے جس کا مطلب نجات دہندہ ہے اور یونانی لفظ کرائسٹ اس Jesusنام کا مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے عیسیٰ، مسیح اور ابن مریم کے ناموں سے مخاطب کیا ہے۔ آپ کی زندگی کے بارے میں تفصیلات آپ کے چار حواریوں کی کتابوں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا میں ملتی ہیں۔ اُن کے بارے میں مزید (Gospels) اور Jose Phus Flavius تفصیلات قدیم غیر مسیحی مورخین مثلاً یہودی مورخ رومی مورخین فین تیسی تس، پلینی اور سوئے تونیس کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ آن کے مطابق آپ کی پیدائش جنوبی فلسطین میں بیت اللحم کے مقام پر

حضرت مریم کے ہاں ہوئی۔ مسیحی انہیں خدا کا بیٹا کہتے ہیں لیکن قرآن حکیم میں ہے کہ اے اہل کتاب مبالغہ نہ کرو اور حق بات کرو۔ بے شک عیسیٰ ابن مریم تو اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت مریم نے یہودی معاشرہ میں رہبانیت اور خانقاہیت کے نظام میں انقلاب پیدا کیا۔ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا اصل مقام و مرتبہ واضح کرتے ہوئے اُن کے بارے لگائے گئے تمام الزامات کو رد کیا۔ 25 دسمبر کو حضرت عیسیٰ پیدائش کی مناسبت سے کرسمس منائی جاتی ہے لیکن قرآن حکیم کی سورہ مریم اور بائیبل میں آپ کی پیدائش کے بارے میں جو بیان ہوا ہے اُن سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت موسم گرما کے بعد ہوئی جب کھجوریں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ ختم المرسلین کی ولادت باسعات موسم بہار میں ہوئی۔ تیس سال کی عمر میں حضرت عیسیٰ پر انجیل نازل ہوئی اور وہ اپنے بارہ حواریوں (شاگردوں) کے ساتھ فلسطین میں گھوم پھر کر یہودیوں کو دین حق کی طرف بلاتے رہے۔ کفار مکہ نے رسول اکرم اور آپ کے صحابہ پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ مشرکین مکہ نے حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیعہؓ کو شہید کر دیا۔ جب حالات کی سنگینی شدت اختیار کر گئے تو اللہ کے حکم سے آپ مکہ دے مدینہ ہجرت کر گئے۔ حضرت عیسیٰ کی بھی شدت سے مخالفت کی گئی اور مذہبی پیشوائیت نے آپ پر کفر کا مقدمہ چلایا اور پھر رومی گورنر نے سزائے موت کا حکم سنایا۔ عیسائیت کے مطابق آپ مصلوب ہوئے

لیکن بعد میں جی اٹھے جبکہ قرآن حکیم کے مطابق نہ آپ قتل کیے گئے اور نہ سولی چڑھائے گئے۔ دشمنوں نے آپ کی مشابہت میں دھوکے کسی اور شخص کو مصلوب کر دیا۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ وہ ہستیمیں جو ظہور دعائے خلیلؑ، تمنائے کلیمؑ اور نوید مسیحؑ ہیں۔ حسن اتفاق سے دونوں رسولوں کی ولادت تقریبات ایک ہی ماہ میں منعقد ہو رہی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ میلاد مسیح و مصطفیٰ کی اس دوہری خوشی کو عقیدت و محبت اور اس عزم کے ساتھ منائیں کہ اپنی زندگی کو اُن کی تعلیمات کی روشنی میں بسر کریں قرآن حکیم کی سورہ مائدہ کی آیت 114 میں ہے حضرت عیسیٰ نے عرض کی اے ہمارے رب آسمان سے ہمارے لیے نعمت نازل فرما اور وہ ہمارے لیے عید کا دن ہو۔ رسول اکرم ﷺ کی تشریف لانا باعث خوشی ہے جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی (6/61) ۔ رب کریم نے حضورؐ کی بعث کو مومنین پر احسان قرار دیا (164/3)، حضور ﷺ کو بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے۔ نعمت ملنے پر اس کا چرچا کرو (11/93) یہ حکم بھی دیا کہ نعمت ملنے پر شکرادا کرنا چاہیے (114/16)۔ سورہ یونس کی آیت 59 میں فرمایا کہ قرآن ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ قرآن کو صاحب قرآن سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ آپ مجسم قرآن ہیں۔ اسی لیے عاشقان مصطفیٰ آپ کی دنیا میں تشریف آوری پر رب کا شکر بھی ادا کرتے ہیں اور عید میلاد النبی بھی بھر انداز میں مناتے ہیں۔ خود خالق

کائنات رسول اکرمؐ کی یوں تعریف کر رہا ہے کہ یقیناً آپ اِنسانی اخلاق کی اِنتہائی بلندیوں پر ہیں۔اور اِنسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ انسانیت کی معراج کُبریٰ اور شرفِ اعلیٰ کا یہی وہ مقام ہے جس کے پیشِ نظر اللہ اور اُس کے فرشتے اُس ذاتِ گرامی پر ہزار تحسین و تبریک کے پھُول نچھاور کرتے ہیں اور ہمیں بھی یہ کرنے کا حکم ہے۔

ایک روایت ہے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک مجھے پوری دنیا کے انسانوں سے زیادہ محبت نہ کرے۔ عربی کا مقولہ ہے جو جس سے پیار کرتا ہے اُس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔اسی محبت کا تقاضا ہے کہ ہمیں ایسی محافل ضرور منعقد کرنی چاہیے جہاں رسول پاک ﷺ پر درود سلام کے نذرانے پیش کیے جائیں اور قرآن کا درس دیا جائے۔ اپنے کرادر کو رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ کے مطابق ڈھالیں اور قرآن کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں یہی درود سلامپیش کرنے کا حقیقی انداز ہے۔ ایسے کاموں اور سرگرمیوں سے اجتناب کرنا چاہیے جو قرآن حکیم کی تعلیمات اور اسوہ حسنہ کے منافی ہوں۔میلاد النبیؐ منانا کسی طور پر بھی اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں، اس کی تفصیل کسی اگلے کالم میں پیش کروں گا۔حضرت عیسیٰؑ اور رسول پاک ﷺ ،دونوں نے توحید، امن،انسان دوستی، عالمگیر بھائی چارہ، حلم،،برداشت اور محبت کا درس دیا جسے دونوں مذاہب کے پیروکاروں کو اپنا کر اپنے رسول سے محبت کا عملی ثبوت دینا چاہیے۔

صرف تعلیم نہیں تربیت بھی

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ” میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں اس لئے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباع سُنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے“۔ یہ الفاظ علامہ اقبالؒ کے ہیں جو انہوں نے 1926ء میں لاہور میں عید میلاد النبیؐ کے جلسہ میں اپنے خطاب کہے تھے۔ انہوں نے مزید فرمایا” ایک شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اِس قوم کو تربیت کی ضرورت ہیاور ملّی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیم تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے کالج نہ تھے یونیورسٹیاں نہ تھیں لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز ہے۔ خطبہ جمعہ، خطبہ عید، حج وعظ غرض تعلیم و تربیتِ عوام کے بیشمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ تھا اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علماء کے درمیان جنہیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا سر پھٹول ہونے

گی۔ جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام مبعوث ہوئے تھے اور ہم ابھی اس
معیار سے بہت دُور ہیں"

حکیم الامت نے قوم کے مرض کی نہ صرف تشخیص کی بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کر دیا۔ علماء کے مابین سر پھٹول کا جو ذکر انہوں کیا وہ دور حاضر میں نہ صرف جاری بلکہ اس کی شدت مزید بڑھ چکی ہے جس کا تازہ مظاہرہ اسلامی نظریاتی کونسل کی اجلاس میں ہوا ہے۔ علماء، اساتذہ اور اہل علم و دانش ہی قوم کی تربیت کرتے ہیں لیکن جب اُن کی اپنی حالت ایسی ہو تو وہ کیسے تربیت کر سکتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنا جانے اور معلومات کے حصول کا نام ہے لیکن قوم تربیت سے بنتی ہے جیسا کہ علامہ نے رسول اکرمؐ کے ارشاد سے وضاحت کی ہے۔ قرآن حکیم مقصد رسالت تذکیہ نفس کو قرار دیتا ہے۔ سورہ جمعہ کی دوسری آیت اور سورہ البقرہ کی آیت ۱۲۹ اور ۱۵۱ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ بد قسمتی سے ہم میں رسمی عبادات اور ظاہریت باقی رہ گئی ہے اور ہم دین کی اصل روح سے بہت دور ہیں۔ نماز جو نظم وضبط سکھاتی ہے لیکن نماز سے فوراََ بعد نمازی مسجد سے نکلتے ہوئے آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں۔ روزہ جس مقصد ہی تقویٰ اور نظم و ضبط پیدا کرنا ہے وہ محض فاقہ کشی بن رہ گیا ہے۔ حج جیسی عظیم عبادت سے بھی ہم نے اپنی تربیت کے لیے کچھ نہیں سیکھا۔ ہمارے سیاستدانوں، اعلیٰ سرکاری افسروں یہاں تک کہ اہل علم کے غیر تربیت یافتہ ہونے کے مظاہرے سامنے

ادب آداب، طور طریقے (Manners) آتے ہیں کہ سر شرم جھک جاتا ہے۔ ہم میں اور تہذیب و شائستگی کی بہت کمی ہے۔ یہ فقدان اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں بھی ہے۔ بہت سے چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اُن سے کسی کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دفعہ استنبول سے سٹاک ہوم ٹرکش ایئر لائن سے آنے کا اتفاق ہوا۔ جہاز میں اکثریت ترک مسافروں کی تھی۔ فلائیٹ جب سٹاک ہوم ایئر پورٹ پر پہنچی تو ایمیگریشن کاؤنٹر پر رش کی وجہ سے مسافروں میں جھگڑا شروع ہوگیا اور نوبت پولیس بلانے تک پہنچ گئی۔ پولیس نے آتے ہی کہا یہ آرام سے کھڑے ہوجائیں یہ ترکی نہیں بلکہ سویڈن ہے۔ مغربی حکومتوں کی پالیسیاں ایک طرف لیکن اقوام مغرب نے اپنی زندگی میں جو نظم و ضبط اور اچھے اخلاق اپنا رکھے ہیں مجھے اُن کا اعتراف جرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم میں تربیت اور تہذیب و شائستگی کیوں کمی ہے اور ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں ہے۔ ہمیں اُن خوبیوں اور اوصاف کو اجاگر کرنا چاہیے جن سے انسانی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور اُن امور سے دور رہنا چاہیے جو منفی خصوصیات کی حامل ہیں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ زندہ ہیں اور اِس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ اکرامؓ ہوا کرتے تھے۔ علامہ نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں متعدد مقامات پر بارگاہ رسالتؐ میں

اپنی گذارشات پیش کی ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ خوشا وہ دل جو عشق نبویؐ کا نشیمن ہو۔ اسلام بحثیت دین خدا کے طرف سے ظاہر ہوا لیکن سوسائٹی یا ملت کے رسول کریمؐ کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ معجزے یا پشیین گوئیاں نہیں بلکہ نبی کی تعلیم اور اس کی زندگی نبوت کے لیے حجت ہوتی ہے۔ گجرات سے شائع ہونے والے ایک قدیم رسالہ صوفی کے اکتوبر ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں علامہ اقبال کی شائع ہونے والی تقریر میں انہوں نے حصول تربیت کا جو لائحہ عمل دیا اس کے مطابق ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریق درود وسلام ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے طریقے نکالتے ہیں۔ عرب میں کہیں دو آدمی بازار میں لڑپڑتے ہیں تو تیسرا بلند آواز میں اللھم صلی علی سیدنا محمد و بارک وسلم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رُک جاتی ہے۔ یہ درود کا اثر ہے اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے نادر اپنا اثر پیدا کرے۔ پہلا طریق انفرادی جبکہ دوسرا اجتماعی ہے۔یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضورؐ آقائے دوجہاں صلعم کے سوانح زندگی بیان کرے تاکہ اُن کی تقلید کا ذوق و شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہم سب آج جمع ہیں۔ تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے لیکن بہر حال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ یاد رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا مظہر ہوجائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت

حضور سرورِ کائناتؐ کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں

آدمی دیدست باقی پوست است دید آں ست آنکہ دید دوست است

یہ جوہرِ انسانی کا کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابوں کے پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے، اگر میسر نہ آئے تو پھر ہمارے لئے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر آج عمل پیرا ہیں۔ علامہ اقبال اپنے خطاب میں مزید فرماتے ہیں کہ " افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں ہیں جن سے ہماری زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کرکے ایک دوسرے کے لئے باعث رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانہ کے مسلمانوں میں تقلیدِ رسولؐ اور اتباعِ سُنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہوگا۔ قرآن و حدیث کے غَوامِض بتانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انہیں فی الحال اخلاق نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیے"۔

اپنے رب سے تعلق قائم کریں

ہر کوئی کسی دوسرے کے بارے میں گلہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس شکوے کی زد میں دوست احباب، عام ملنے والے، رشتہ دار یہاں تک کہ خونی رشتے بھی آتے ہیں۔

ہماری شاعری میں اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ چونکہ شاعر بہت حساس مزاج ہوتے ہیں اور معاشرے میں ہونے والے انسانی رویوں کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں جس کی جھلک ہمیں اُن کے کلام میں ملتی ہے۔ جیسے فراز کا یہ شعر بہت مقبول ہے

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

حفیظ جالندھری نے دوستائی کی بے وفائی کو اپنے انداز میں خوب کہا کہ

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اور غالب نے تو سارا معاملہ ہی ختم کر دیا جب یہ کہا کہ

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یہ توقع کیوں اٹھ جاتی ہے۔ دوست دوستوں سے کیوں بے وفائی کرتے ہیں۔ انسان کیوں بدل جاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات اور دوسرے اہل علم اپنی تحقیق اور فہم کے مطابق بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس بارے میں سب سے مستند اور حتمی رائے انسان کو تخلیق کرنے والے کی ہے۔ انسانیت کے نام اپنے آخری پیغام میں حضرت

انسان کو پیدا کرنے والا رب اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان ناشکرا جلد باز اور جھگڑالو ہے۔ یہ حیوانی جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ جب مصیبت پڑے تو خدا یاد کرتا ہے۔ احسان فراموش ہے۔ تنگ دل ہے۔ امانت خداوندی میں خیانت کرتا ہے۔ ظالم اور جاہل ہے۔ بے صبرا ہے۔ مفاد کے پیچھے لپکتا ہے۔ اپنے آپ کو پست ترین درجہ پر لے جاتا ہے۔ سرکش واقع ہوا ہے۔ انسان حاسد ہے۔ وسوسے پھیلا کر شر پھیلاتا ہے۔ اپنے جذبات کو کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

انسان کے اندر یہ رویے اور خصوصیات اُس کی تخلیق کے ساتھ ہی رکھ دئے گئے ہیں یعنی انسان میں موجود ہیں۔ یہ اس کی سرشت میں ہیں جسے آپ انسان BY DEFAULT کی فطرت کہہ سکتے ہیں۔ جب انسانوں میں بے وفائی، ناشکراپن، احسان فراموش، مفاد پرست اور حسد جیسے جذبات پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں تو پھر شکوہ یا گلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بقول میاں محمد بخش کہ آدم ہمیشہ سے بے وفا ہے۔ انسان کی تخلیق کے وقت فرشتوں کا یہی اعتراض تھا کہ ایسی مخلوق پیدا کی جارہی ہے جس میں شر پھیلانے کا اختیار ہوگا۔ فرشتوں کا خالق انسان اور کائنات نے کیا خوب جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس انسان میں نیکی اور بدی دونوں کو اختیار کرنے کی صلاحیت ہی اسے دیگر مخلوقات سے اشرف بنائے گی۔ اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا کہ انسان دوسروں سے کٹ کر تنہائی میں زندگی گذارے بلکہ اسلام معاشرہ میں دوسروں کے ساتھ اچھے

اخلاق اور طرز عمل کے ساتھ جینے کا درس دیتا ہے۔

رب العزت نے جب انسان کو بنایا تو ساتھ ایک ہدایت نامہ بھی دے دیا اور واضع طور پر بتا دیا کہ جو انسان اس ہدایت پر عمل کریں گے وہ اپنی ان خامیوں پر قابو سکیں گے۔ ان خامیوں پر وہی لوگ قابو پا سکتے ہیں جو وحی خداوندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہیں۔ایک روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ صحابہ اکرامؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا آپؐ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے لیکن میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے۔ رسول پاکؐ نے کیا زریں اصول بتایا ہے جس سے انسان اپنے منفی جذبات اور خیالات کو مثبت خوبیوں میں بدل سکتا ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب انسان اپنا اور اپنے خالق کا تعلق سمجھتا ہے جو عبد کا معبود سے تعلق ہے۔ انسان جب اپنی تخلیق پر غور کرتا ہے اور اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو وہ پھر اپنے رب کو بھی پہچان سکتا ہے۔ قرآن پاک اسی پر غور کرنے کو کہتا ہے کہ اے انسان تو اپنی تخلیق پر غور کر۔ علامہ اقبال نے اپنے آپ کو پہچانے کے لیے خودی کی اصطلاح استعمال کی۔ اُن کے مطابق خودی سے مراد اطاعت الٰہی، محبت رسولؐ، ضبط نفس، نیابت الٰہی اور تسخیر کائنات ہے۔ یہ تزکیہ نفس سے انسانی حد تک اللہ کے صفات کے کردار کی تعمیر ہے۔

جب اپنی رضا کو رب کی رضا کے مطابق کر لیا جاتا ہے تو پھر رب

پوچھتا ہے کی اب تو بتا تیری کیا مرضی ہے۔ پھر وہ مقام آتا ہے کہ جو سورہ الزمر کی آیت ۳۶ میں ہے کہ کیا بندے کے لیے اللہ کافی نہیں۔ بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق بندگی سے پیدا ہوتا ہے یعنی

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی یا بندہ خدا بن، یا بندہ زمانہ

پریشانیوں اور مایوسیوں سے بچاو کا ایک مومن کے پاس یہ لائحہ عمل ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کے اپنا تعلق نہ صرف استوار کرتا ہے بلکہ اسے محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا سجدہ کرتا ہے کہ پھر کسی اور کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا۔ نماز اور قرآن سے اپنے رب سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ نماز مومن کی معراج اور قرآن کلام اللہ ہے۔ محبت رسول ﷺ اپنے رب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جب اپنے رب سے باتیں کرنے کو جی چاہے تو نماز کے ذریعہ باتیں کریں اور جب اپنے رب کی باتیں سُننا ہوں تو قرآن حکیم کو پڑھیں، رب آپ سے باتیں کرے گا۔ نماز ادا کرتے وقت یہ محسوس ہو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں اور اس کی بارگاہ میں اپنی گذارشات پیش کر رہے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کرتے وقت بقول والد علامہ اقبال یہ سمجھیں کہ یہ آپ پر نازل ہو رہا ہے۔ قرآن کلام اللہ ہے۔ جب اسے پڑھتے ہیں تو اللہ آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔ جب یہ تعلق دل سے محسوس ہوگا تو رب سے تعلق پیدا ہوگا اور رب ہی سب سے اچھا دوست اور ساتھی ہے اور رسول پاک ﷺ کے آخری الفاظ

بھی یہی تھے ۔ اسوہ حسنہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے جو ہمارا تعلق رب سے جوڑتا
ہے۔ چھوڑیں دوسروں کے گلے ، شکوے اور اپنے رب سے اپنا تعلق قائم کریں کیونکہ
چھڈ دنیا دے جنجال کچھ نیں نبھناں بندیا نال رکھیں ثابت صدق اعمال

نقاشِ پاکستان کا تصورِ پاکستان

برصغیر کی تاریخ اور تقسیم ہندوستان کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے نقاشِ پاکستان چودھری رحمت علی کی سیاسی بصیرت اور اُن کے تصورِ پاکستان کو سچ ثابت کر دیا ہے دیدہ ور واقعی ہی حقیقت کو اپنی دور بین نگاہوں سے ایک مدت پہلے ہی دیکھ لیتا ہے اور قوم کو نشانِ منزل کی نشان دہی کر دیتا ہے۔اسلامیانِ برصغیر دورِ غلامی میں زبوں حالی کا شکار رتھے اور انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُن کی منزل ہے کیا تو اِن حالات میں اسلامیہ کالج لاہور کی بزمِ شبلی سے خطاب کرتے ہوئے 1915ء میں سب سے پہلے چودھری رحمت علی نے اسلامیانِ ہند کے لئے الگ مملکت کو اُن کے مسائل کا حل قرار دیا یوں برِصغیر کی تاریخ میں وہ پہلے راہنما ہیں جنھوں نے سب سے پہلے الگ وطن کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اُس کا مطالبہ کیا اُن کی اس آواز نے کئی دوسرے راہنماوؤں کو اسی سمت میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ 1917ء کو سٹاک ہوم سویڈن میں ہونے والی انٹر نیشنل سوشلسٹ کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے چوہدری رحمت علی کے خیالات کی تائید میں مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کو مسائل کا حل قرار دیا۔اسی طرح 1932ء میں سر ریجنالڈ کریڈوک نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا المیہ'' میں تحریر کیا کہ ''اگر سویڈن اور ناروے متحد نہیں رہ سکے۔ آئرش

فری سٹیٹ اور السٹر میں اتحاد ممکن نہیں تو پھر اُن سے زیادہ اختلافات کی وجہ سے ہندوستان کیسے متحد رہ سکتا ہے''۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ آلہ آباد میں 1930ء کو علامہ اقبال نے شمال ہندوستان یعنی پنجاب ،سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لئے.برطانوی ہند کے اندر یا باہر ایک خطہ کی ضرورت پر زور دیا۔اُس وقت چودھری رحمت علی اعلیٰ تعلیم کے لئے .برطانیہ جانے کی تیاری میں تھے اور وہ نومبر 1930ء کو انگلستان پہنچے ۔ یہاں آ کر انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ.برصغیر کی سیاست میں اپنی عملی دلچسپی جاری رکھی انہوں نے پاکستان نیشنل مومنٹ کی بنیاد رکھی اور اپنا مشہور مقالہ Now or Never تحریر کیااور مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا نام پاکستان تجویز کیا 1931ء تا1933ء تک .برصغیر کے مستقبل کے حل کے لئے تین گول میز کانفرنسیں.برطانیہ میں منعقد ہوئی تو چودھری رحمت علی گول میز کانفرنس کے شرکاء سے ملاقاتیں کرکے انہیں اپنے مطالبہ پاکستان کے بارے میں دلائل سے قائل کرتے رہے انہوں نے علامہ اقبال سے تفصیلی ملاقاتیں کیں اور قائدِاعظم کے اعزاز میں کھانا دیا اور اپنے مطالبۂ پاکستان سے انہیں آگاہ کیا اس دوران چودھری رحمت علی کی سرگرمیوں کا اعتراف تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما چوہدری خلیق الزمان نے.برملا کہا ہے 1940ء میں جب لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہونا تھا تو

چودھری رحمت علی لندن سے اجلاس میں شرکت کے لئے کراچی پہنچے لیکن انہیں معلوم ہوا کہ 19 مارچ کو خاکساروں کی شہادت کے بعد پنجاب حکومت نے امنِ عامہ کا بہانہ عائد کرکے چوہدری رحمت علی کے لاہور داخلہ پر پابندی عائد کر دی اس طرح چوہدری رحمت علی اُس تاریخی اجلاس میں شریک نہ ہوسکے غالب امکان ہے کہ اگر وہ اس اجلاس میں شرکت کرتے تو اپنے مطالبۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرکے شرکاء کو قائل کر لیتے اور اس طرح اُس روز منظور ہونے والی قرار داد کا نام بھی قرار دادِ پاکستان ہو جاتا اور منزل کی بہتر طور پر نشان دہی ہو جاتی جو تین تین سال بعد 1943ء کو مسلم لیگ نے باقاعدہ طور پر اپنائی بلکہ یہ امکان بھی ہے کہ اگر چوہدری رحمت علی کو اجلاس میں شرکت کا موقع ملتا تو آل انڈیا مسلم لیگ ایک خطہ کی بجائے اسلامیان ہندوستان کے لئے تین ممالک کا مطالبہ کرتی جس کا اعلان 22 مارچ 1940ء کو پاکستان نیشنل موومنٹ کے کراچی کے اجلاس میں ہوا اور برصغیر کے مسائل کا حل مسلمانوں کے لئے تین مملکتوں کے قیام میں واضح کیا گیا یہ تین ممالک موجودہ پاکستان حیدرآباد دکن کے خطہ کے لئے عثمانستان اور بنگال آسام کے مسلمانوں کے لئے بانگستان تجویز کیا گیا۔ وہ اسلامی دولتِ مشترکہ کی تشکیل چاہتے تھے اور وہ انڈیا کو دینیہ کہنا پسند کرتے تھے جہاں بہت سے ادیان کی اقوام آباد ہیں۔

چوہدری رحمت علی اپنی سیاسی بصیرت کی بناپر برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل سے

آگاہ تھے اور اگر 1946ء کے انتخابات انہی کی سیاسی فکر کی بنیاد پر لڑ کر مسلم لیگ سیاسی جدوجہد کرتی تو آج برصغیر کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور بھارتی مسلمان بھی زیادہ محفوظ ہوتے۔ پاکستان ایک مستحکم اور بڑا ملک ہوتا مزید برآں بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو وہ مسائل درپیش نہ ہوتے جو آج اُن کے سامنے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد چوہدری رحمت علی لندن سے اپریل 1948ء کو لاہور پہنچے اور وہ یہاں قیام کے خواہش مند تھے مگر قائدِ اعظم کی وفات کے بعد جب مسلم لیگ راہنما اقتدار کی کشمکش میں الجھ گئے اور تحریکِ پاکستان والا جذبہ مفقود ہونے لگا تو اور حکومت وقت کے دباؤ پر انہیں ایک بوجھل دل کے ساتھ چوہدری رحمت علی کو پاکستان کو خیر آباد کہنا پڑا اور بالآخر یہ عظیم رہنما 3 فروری 1951ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوا اور کیمرج برطانیہ میں ابھی بھی اماناً دفن ہے۔ اسلامیان ہند کے اس عظیم رہنماء کا جسد خاکی اب بھی اپنے خابوں کی سرزمین پاکستان میں آسودہ خاک ہونے کا منتظر ہے۔ نشان منزل کی طرف رہنمائی اور حصول پاکستان کی جدوجہد کا آغاز کرنے والے قوم کے اس عظیم قائد کا استحقاق تو اُس سرزمین پر ہے کہ انہیں اس میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن ہونا نصیب ہوسکے۔ نقاش پاکستان کی روح آج بھی ہم سے یہ کہہ رہی ہے کہ

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں ہمیں بھی یاد کرلینا چمن میں جب بہار آئے

مسئلہ کشمیر کیوں عالمی توجہ نہیں لے سکا

سویڈن میں پاکستان کے سابق سفیر جناب ڈاکٹر عبد الستار بابر نے افسوس کا اظہار کیا کہ کشمیر کو بھلا دیا گیا ہے اور مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی پالیسی اب متحرک نہیں رہی۔ ایک سابق سفیر سے بہتر خارجہ پالیسی پر کوئی اور تبصرہ نہیں کر سکتا۔ مسئلہ کشمیر پر حکومت پاکستان کی دلچسپی دیکھنا ہو پارلیمانی وکشمیر کمیٹی کو دیکھ لیں جس کی سربراہی سیاسی رشوت کے طور پر ایسی شخصیت کو دی گئی ہے جو نہ مسئلہ کشمیر سے واقف ہے اور نہ ہی اپنے طویل دور صدارت میں انہوں نے اس حوالے سے کوئی فعال کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ حکومت نے بھی کشمیر کمیٹی کی سربراہی کے سلسلہ میں سابق حکومت کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ جموں کشمیر پر بہت مضبوط کیس ہونے کے باوجود دنیا سے اس کے لیے حمایت کیوں حاصل نہیں کی جا سکی۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی موجودگی، بھارت کے غیر قانونی قبضہ، ہزاروں شہادتوں کے باوجود مسئلہ کشمیر کیوں عالمی توجہ حاصل نہیں کر سکا؟ کیا پالیسی سازوں نے اس بارے میں سوچا اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا۔ یوم یکجہتی کشمیر منانے کے ساتھ کشمیر پالیسی کا جائزہ بھی لینا چاہیے اور ہر سال اس دن حکومت کو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے اپنی کارکردگی بتانی چاہیے کہ عالمی سطح پر اس مسئلہ کو اجاگر کرنے کے لیے کیا قدامات کیے گئے ہیں۔ یہ بھی واضع کرنا

چاہیے کہ دنیا کے تقریباً ایک سو ممالک میں موجود پاکستانی سفارت خانوں نے اس ضمن کیا کردار ادا کیا ہے۔

کشمیری عوام کے ساتھ اظہار یکجہتی اچھی بات ہے لیکن یہ اظہار چھٹی کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کی تباہ حال معیشت جس پر 66457 ملین ڈالر کے صرف بیرونی قرضے ہیں، ایک دن کی چھٹی 82 ارب روپے کا نقصان کرے گی۔ یہ کہاں کی عقل مندی اور اس سے مسئلہ کشمیر کو فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہوگا کیونکہ معاشی طور پر مستحکم پاکستان ہی دفاعی طور پر مضبوط ہوگا جو آزادی کشمیر کا ضامن ہو سکتا ہے۔ 1974 میں اندراگاندھی اور شیخ عبداللہ کے معاہدہ پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے پورے پاکستان میں ہڑتال کروائی تھی جس پر اندراگاندھی نے کہا تھا کہ پاکستان نے اپنا ہی نقصان ہے۔ 1990 سے 5 فروری کے دن اب تک 26 چھٹیوں سے تقریباً 213200 ارب روپے ملک کو تقصان ہو چکا ہے۔ اتنی رقم سے پاکستان کی تقدیر بدلی جا سکتی تھی۔ المیہ یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر سے آزاد کشمیر میں آنے والے مہاجرین بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ یوم یکجہتی کشمیر کے ساتھ یوم یکجہتی پاکستان منانے کے بھی ضرورت ہے۔ یوم یکجہتی کشمیر منانا محض ایک جذباتی اقدم ہے۔ جنوبی ایشیا میں مستقل امن کے لیے بھارت کو اقوام متحدہ کی قراردادیں تسلیم کرنا ہوں گی۔ اس مسئلہ کو کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق حل کرنا ہوگا جو اٹوٹ انگ اور شہ رگ سے ہٹ

کر ہی ممکن ہے۔

حق خود آرادیت کشمیری عوام کا پیدائشی حق جس کی ضمانت اقوام متحدہ نے بھی دی ہے ۔ پاکستان اور بھارت دونوں نے اقوام عالم کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا۔ کشمیریوں کا نہرو کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو اس مسئلہ کو اقوام متحدہ لے گیا اور جس وجہ سے یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گیا۔ یہ اب بھی اقوام متحدہ کے حل طلب مسائل میں سے ایک ہے اور جموں کشمیر کی خونی لکیر پر اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی موجودگی اس کا مظہر ہے۔ دنیا کے سامنے بھارتی جمہوریت کا اصل چہرہ پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس طرح کشمیری عوام کے آزادانہ رائے شماری کے جمہوری حق سے انکار کر رہا ہے۔ دنیا کے سامنے بھارت کے پہلے وزیر اعظم نہرو کا لال چوک سرنگر میں اعلان رکھنا ہوگا جس میں انہوں نے رائے شماری کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ جس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا بھارت مستقل رکن بننا چاہتا ہے اُسی کی قراردوں کو مسترد کرتا ہے مگر ہم اسے دنیا کے سامنے کیوں اجاگر نہیں کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف نہیں اور حقوق انسانی کے معیار سب کے لیے یکساں نہیں۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے اور دنیا کے دیگر ممالک کے اس کے ساتھ بہت سے مفادات وابستہ ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کے پالیسی سازوں کو

سوچنا چاہیے کہ موجودہ عالمی اور خطہ کے حالات کس حکمت عملی اور کشمیر پالیسی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ہم کشمیر پر کیسے عالمی حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس امر کا جائیزہ لینا چاہیے کہ ماضی میں کہاں کہاں غلطیاں کی گئیں اور اُن کا ازالہ کیسے ممکن ہے۔ پالیسی سازوں کے پاس اگر فرصت ہو تو آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی میں اپریل 1947 کو ہونے والے اجلاس کے ریاستوں کے بارے میں فیصلہ اور 18 جون 1947 کے پاکستان ٹائمز کے صفحہ اول پر بانی پاکستان کے کشمیر پر دیئے گئے پالیسی بیان کا مطالعہ کرلیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی وجہ سے بھی مسئلہ کشمیر بین الاقوامی سطح پر زندہ ہے لیکن دنیا تب توجہ دیتی ہے جب کشمیری خود اپنا کیس پیش کرتے ہیں۔ اس امر کا عملی تجربہ ہمیں اُس وقت ہوتا ہے جب یورپی اراکین پارلیمنٹ، حقوق انسانی کے عالمی اداروں ، سویڈش حکومتی اور سیاسی رہنماؤں کے پاس مسئلہ کشمیر کی لابنگ کے لیے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان اور وزارت خارجہ بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ مسئلہ کشمیر پر دنیا ہماری بات نہیں سُنتی لیکن جب کشمیری خود بات کرتے ہیں تو دنیا توجہ سے سُنتی ہے۔جب بھی مسئلہ کشمیر پر لابنگ کی ضرورت ہو پاکستانی سفارت خانے ان ممالک میں موجود کشمیریوں کو آگے کرتے ہیں کہ آپ کشمیر پر بات کریں گے تو وہ موثر ہوگی ۔جب صورت حال ایسی ہی ہے تو یہ ذمہ داری حریت کانفرنس کو اعتماد میں لے کر آزاد کشمیر حکومت کو کیوں نہیں دی جاتی کہ وہ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو خود پیش کرے ۔ پاکستانی وزارت خارجہ

اور سفارت خانے اس سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کریں۔ جب کشمیری اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں میں اپنا مقدمہ خود لڑیں گے تو دنیا اس پر توجہ دے گی۔ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے یہی ایک راستہ ہے جو اس کے حل کی سمت میں موثر کوشش ہوگا۔

کشمیر کے خوابیدہ سرپرست

نہرو نے کہا تھا کہ وقت ایک مرہم ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ جموں کشمیر کے باشندے سب کچھ بھلا کر بھارت کے ساتھ بخوشی رہیں گے لیکن نہرو کی یہ پیشین گوئی ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی پوری نہیں۔ کیا کشمیری شہدائے جموں کی قربانیوں کو بھلا سکتے ہیں۔ کیا وہ تہاڑ جیل کو بھول سکتے ہیں۔ کیا مقبول بٹ اور ان کے دو بھائیوں بھائی غلام نبی بٹ اور منظور احمد بٹ کو بھول سکتے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد میں جام شہادت پینے والے عظیم کشمیری رہنماء اشفاق مجید وانی، شیخ عبد الحمید، جمیل چوہدری، ڈاکٹر عبدالاحد گورو، ایڈوکیٹ جلیل احمد اندرابی، سید شبیر احمد صدیقی، بشارت رضا، افضل گرو، اشرف قریشی کے بھائی الطاف قریشی اور دوسرے ہزاروں شہیدوں کی قربانیوں کو کون بھول سکتا ہے۔ بھارتی جبر اور وہاں کی عوام کو دیئے گئے معاشی فوائد کے باوجود کشمیری عوام اپنی جدجہد آزادی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ کشمیریوں نے تقسیم کشمیر کو قبول کیا ہے اور نہ کبھی اسے قبول نہیں کریں گے۔ ریاست جموں کشمیر ایک وحدت ہے اور کشمیری عوام اس کے حصے بخرے نہیں کرنے دیں گے اور اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ یٰسین ملک، سید علی گیلانی، شبیر احمد شاہ، میر واعظ عمر فاروق اور دوسرے کشمیری رہنماؤں کی قیادت میں کشمیری عوام کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

بھارت کی حکمت عملی کہ پاکستان کی افواج مغربی سرحد پر مصروف رہیں اسی لیے وہ سیز فائر لائن پر اکثر فائرنگ کرکے پاکستانی افواج کو الجھائے رکھتا ہے۔ بھارت کی یہ بھی پوری کوشش ہے کہ طالبان اور دوسری مذہبی شدت پسند جماعتوں کا پاکستانی عسکری قیادت کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہوجائے کیونکہ ایسی صورت حال میں وہ شدت پسند بھارتی مقبوضہ کشمیر کا رخ کرسکتے ہیں۔ اسی لیے جب بھی معاملات بہتری کی طرف جاتے ہیں کوئی نہ کوئی انہونی ہوجاتی ہے۔ افغانستان میں ISAF کے کمانڈر نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ بھارتی افغان گٹھ جوڑ کے باعث پاکستان میں دہشت گردی کرنے والوں کو معاونت اور سہولتیں میسر ہیں۔ بھارتی میڈیا یہ تاثر بھی پوری شدت کے ساتھ دیتا ہے کہ پاکستان کی عسکری قیادت اور حکومت کے درمیان سلامتی کے کئی اہم امور پر اتفاق رائے نہیں تاکہ غیر یقینی کی فضا پیدا کی جاسکے۔

تحریکِ آزادی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں لیکن یہ ضرور کامیابی سے ہمکنار ہو گی۔ پاکستانی عوام اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہیں اور بیس لاکھ جموں کشمیر کے مہاجرین آج بھی وہاں رہ رہے ہیں۔ دونوں ایک اٹوٹ رشتے میں منسلک ہیں اور اُن کے دِل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ یہ کشمیری خون اور پاکستان کی سفارتی حمایت ہے جس نے اس مسئلہ کو زندہ رکھا ہے اگرچہ سفارتی محاذ پر

پاکستان کی حکومتوں نے کئی غلطیاں کیں اور بعض اوقات سستی اور ناکام حکمت عملی اپنائی لیکن پھر بھی مسئلہ کشمیر زندہ ہے اور کشمیری دنیا بھر میں اپنے غیر مشروط حق خود آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں حالانکہ برِصغیر کی تقسیم کے بعد کئی ریاستوں کے مستقبل کا مسئلہ تھا مگر آج لوگ جوناگڑھ مناور، حیدرآباد اور دوسرے کئی مسائل بھول چکے ہیں حیدرآباد جس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا تھا اور یہ پاکستان اور بھارت کے بعد برِصغیر میں تیسرا ملک بنا تھا جس کے پاکستان میں مشتاق احمد سفیر تھے لیکن آج اُس کے کسی مسئلہ کا وجود ہی نہیں۔ ایک مضبوط پاکستان اور خوشحال پاکستان ہی آزادی کشمیر کا ضامن ہو سکتا ہے۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں حکمت عملی کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دنیا کے سامنے بھارت کا اصل چہرہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر میں پاکستان کے سفارت خانوں کو اس سلسلہ میں فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔

جموں کشمیر پر اپنی قرادایں منظور کرنے کے بعد اب یہ اقوام متحدہ نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی موجودگی اور ابھی تک مسئلہ کشمیر کا ایجنڈے پر ہونا اس حقیقت کا مظہر ہے کہ اقوام متحدہ کشمیریوں کا سرپرست ہے لیکن ایسا سرپرست جو لمبی تان کر سو رہا ہے۔ اس خوبیدہ سرپرست کو بیدا کرنا ہوگا جس کے لیے پاکستان کی وزارت

خارجہ، آزاد جموں کشمیر کی حکومت، کشمیری سیاست دان اور بیرون ملک آباد کشمیریوں کا فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لیے آزاد کشمیر کی حکومت کی ذمہ داری ہونی چاہیے اور معاہدہ کراچی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہر سال 13 اگست کو اقوام متحدہ نے جموں کشمیر پر اپنی پہلی قرارداد پاس کی اس دن دنیا بھر میں اقوام متحدہ کے دفاتر کے سامنے پر امن مظاہرے کر کے انہیں یاد دلائیں کہ وہ نیند سے بیدا ہو اور اپنی قراردوں پر عمل درآمد کروائے۔ جہاں ایک بھی کشمیری ہو وہ اکیلا جا اقوام متحدہ کے دفتر میں یاداشت جمع کرائے۔ ہمیں کشمیر کے سرپرست کو جگانا ہوگا۔

گلگت بلتستان کس کے شمالی علاقے

گلگت بلتستان، ریاست جموں کشمیر کا آئینی، قانونی حصہ اور اس کے شمالی علاقے ہیں۔ کشمیر کے مسلمان حکمران سلطان شہاب الدین (1387-1360 ء) نے یہ علاقے جموں کشمیر کی سلطنت میں شامل کیے جو تقسیم ہندوستان کے وقت بھی ریاست جموں کشمیر کا حصہ تھے۔ ریاست جموں کشمیر کے کل رقبہ ساڑھے چوراسی ہزار مربع میل میں گلگت بلتستان کا رقبہ تقریبا اٹھائیس ہزار مربع میل شامل ہے جسے سروے آف پاکستان اور اقوامِ متحدہ نے آج تک تسلیم کیا ہوا ہے۔ 1937 اور 1941 کے ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں گلگت بلتستان سے پانچ ارکان شامل ہوتے تھے اور یہ سلسلہ 1947 تک جاری رہا۔ برطانوی ہند کے دور میں جب شمال کی جانب سے روس کے اس علاقے پر چڑھائی کے خطرے کے پیشِ نظر برطانوی ہند کی حکومت نے کشمیر کے حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ سے معاہدہ گلگت کے تحت یہ علاقہ 1935 میں ساٹھ سال کے عرصہ تک اپنی تحویل میں لے لیئے مگر معاہدہ کی رو سے یہ تسلیم کیا گیا کہ یہ علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ رہیں گے اور سرکاری عمارتوں پر ریاست کا پرچم لہرایا جائے گا نیز کان کنی کے اختیارات بھی مہاراجہ کشمیر کے پاس ہونگے۔ وہاں کے سول ملازمین ریاست جموں کشمیر کے ماتحت تھے اور اب بھی بہت سے لوگ مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں موجود ہیں جو

خود یا ان کے والدین گلگت بلتستان میں ریاست جموں کشمیر کے ملازمین تھے۔ جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو یکم اگست 1947 کو یہ علاقے واپس مہاراجہ کشمیر کو لوٹا دیئے۔ مہاراجہ جموں کشمیر نے بریگیڈئر گھنسارا سنگھ کو گلگت بلتستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ بعد ازاں حریت پسندوں نے ڈوگرہ فوج کو شکست دیکر اُسے گرفتار کر لیا جسے بعد میں قائد اعظم کے سیکریٹری کے ایچ خورشید (بعد میں صدر آزاد کشمیر) کے ساتھ تبادلہ میں رہا کیا گیا۔ 1947ء میں قائم ہونے والی آزاد کشمیر حکومت اپنے مسائل اور وسائل کی وجہ سے ان علاقوں کا انتظام خود نہیں سنبھال سکتی تھی اس لیے 28 اپریل 1949 میں وزارتِ امورِ کشمیر حکومت پاکستان، حکومت آزاد کشمیر اور مسلم کانفرس کے درمیان معاہدہ کراچی کے تحت گلگت بلتستان عارضی طور پر انتظام کی غرض سے حکومتِ پاکستان کے حوالے کیا جس کے بعد حکومتِ پاکستان نے محمد عالم خان کو اس علاقے کا پولیٹیکل ایجنٹ بنا کر یہاں بھیج دیا۔

پاکستان کے 1956، 1962 اور 1973 کے آئین میں کہیں بھی گلگت بلتستان کو پاکستان کا حصہ نہیں تسلیم کیا گیا۔ موجود 1973 کے آئین کی دفعہ ایک کی ذیلی شق دو میں پاکستان کن علاقوں پر مشتمل ہے اس کی تفصیل دی گئی ہے اور اُن میں گلگت بلتستان شامل نہیں ہے اور پاکستان کی سپریم کورٹ کے فیصلوں میں بھی یہی تسلیم گیا ہے۔

چونکہ گلگت بلتستان، ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہے اور یہ

بھی پوری ریاست کی طرح ابھی تک متنازعہ ہے جس کا ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے اس لیے اس کا حتمی فیصلہ بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت ہی ہوگا اور کسی ایک جماعت، فرد یا کچھ لوگوں کے جانب سے از خود کئے گئے کسی بھی فیصلہ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی کسی کو اس کا اختیار حاصل ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی نے بخشی غلام محمد کے دور میں جب 15 فروری 1954 ء کو بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا اور پھر 26 جنوری 1957 ء کو مقبوضہ کشمیر کے آئین میں کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیا جس پر پنڈت نہرو نے 29 مارچ 1956ء میں لوک سبھا میں کہا کہ کشمیر اب آئینی طور پر بھارت سے الحاق کرکے اس کا حصہ بن گیا ہے اور اب رائے شماری کی باتیں فضول ہیں۔ جو لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ گلگت بلتستان کا 16 نومبر 1947ء کو پاکستان کے ساتھ الحاق ہوگیا تھا انہیں مقبوضہ کشمیر کا بھارت سے الحاق بھی تسلیم کرلینا چاہیے۔

گلگت بلتستان کے الحاق کہ نہ کوئی دستاویز ہے اور ہی یہ کوئی قانونی طور پر کسی اسمبلی نے کیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر اسمبلی کے بھارت کے الحاق کو مسترد کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ نے 24 جنوری 1957 کو قرارداد نمبر 122 منظور کی جس میں اپنی سابقہ قراردادوں کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کیا کہ ریاست کے کسی بھی حصہ کو اپنے طور پر مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی حیثیت ہے۔ اس قرارداد کا اطلاق ریاست جموں کشمیر کے تمام علاقوں بشمول گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر پر بھی ہوتا ہے۔ پاکستان کا موقف ہی اقوام متحدہ کی

قرارداد یں ہیں جن کی بنیاد پر وہ پوری دنیا میں کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کو چیلینج کرتا ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں تعینات اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین جو حد متاکہ یا کنٹرول لائن پر موجود ہیں ان کے گلگت اور سکردو میں موجود دفاتر بھی اسی حقیقت کا نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں۔ 1954ء تک گلگت بلتستان کے لوگ اپنا ڈومیسائل مظفر آباد آزاد کشمیر سے حاصل کرتے تھے۔ آزاد کشمیر کی ہائی کورٹ نے 1992 میں اپنے ایک فیصلہ میں گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کا حصہ قرار دیا تھا جس کی بعد میں آزاد کشمیر کی سپریم کورٹ نے توثیق کی تھی۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتیں خود عملی طور پر گلگت بلتستان کے خطہ سے عرصہ دراز سے لا تعلق ہو چکی ہیں۔ اِن جماعتوں نے وہاں اپنی نہ تو تنظیم سازی کی ہے اور نہ آزاد کشمیر کے کسی سیاسی رہنما نے وہاں کا دورہ کیا ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں منافقت کا شکار ہیں، ان کی آزاد کشمیر کی شاخوں کا موقف اور ہے اور گلگت بلتستان کی شاخوں کا کچھ اور جبکہ جن کی یہ شاخیں ہیں انہوں نے چپ سادھ رکھی ہے۔ آزاد کشمیر کے اکثر سیاسی رہنما یورپ اور برطانیہ کا دورہ کرتے رہتے ہیں مگر ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقوں کی طرف رخ نہیں کرتے۔ آج اگر وہاں کے باشندے الگ تھلگ ہیں تو اس کے ذمہ دار بھی آزاد کشمیر کے سیاستدان ہیں۔ گلگت بلتستان کے عوام کو جمہوری حقوق اور اختیار ضرور ملنا چاہیے۔ اِن علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملا کر ایک بڑا انتظامی یونٹ بنانا چاہیے۔ اس طرح کے

معاملات میں احتیاط بہت ضروری ہے تاکہ کشمیر پر اصولی موقف متاثر نہ ہو اور تقسیم کشمیر کی افواہیں جنم نہ لیں۔

ہو تیری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم

اس کتاب عظیم پر تدبر اور غور و فکر کیا جائے تو ہر انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب انسانی علم میں کائنات کے رموز اور حقائق کھل کر سامنے نہیں بھی آئے تھے اور جب دور حاضر کی سائنسی ترقی اور دوسرے انکشافات واضح نہیں بھی ہوئے تھے تب بھی اس کتاب روشن میں وہ اشارے اور حقائق پیش کر دیئے گئے جو اس کے وحی خدا ہونے کا بھی ایک ثبوت ہے۔ سائنس اور خدا کی طرف سے دیئے گئے مذہب میں تصادم نہیں بلکہ اتصال ہے۔ سائنس کی تھیوری Unification اور Ossification خدا کی وحدت کا اظہار ہیں۔ دین کا مقصد انسان کی رہنمائی اور اُسے اس کے مقام سے آشنا کرنا۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے بہت مختصر الفاظ میں یہ بتایا کہ دین کرتا کیا ہے کہتے ہیں از کلید دیں در دنیا کشاد یعنی دین کی چابی سے دنیا کے تالے کو کھول۔ دین کی چابی سے اُن کی مراد قرآن حکیم ہے۔ انسان ہی واحد مخلوق ہے جسے شخصیت
Personality دی گئی ہے۔ کسی اقبال خودی سے تعبیر کرتا ہے، اسے روح کہہ لیں یا نفس اس کا کی نشو و نما کردار سازی سے ہوتی۔ Character ہی دراصل کسی انسان کا سرمایہ اور اس کا عکس ہوتا ہے۔ دل و نگاہ کی پاکیزگی اور اوصاف حمیدہ ہی معراج انسانیت ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد تزکیہ نفس ہے۔ انفرادی سطح پر اعلیٰ کردار اور اخلاق کے انسانوں کی جماعت تشکیل دینا جو

اجتماعی نظام متشکل کریں۔ دین میں رہبانیت نہیں۔ اجتماعی سطح پر قرآنی تعلیمات پر مبنی معاشرہ تکیل دینا مقصد رسالت ہے۔

ہمیں خدا اور فرد کے تعلق کو نہ صرف سمجھنا بلکہ اسے محسوس کرنا چاہیے۔ یہ عبد اور خالق کا تعلق ہے۔ یہ محبت رسول ﷺ سے مشروط ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب میں محمدی نسبت پیدا کرے۔ قرآن کو اس زاویہ نگاہ سے مت پڑھو کہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا۔ اسے اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے۔ ایک ویلفیئر اسٹیٹ انسان کے جسمانی ضروریات تو پوری کرتی ہے لیکن انسانی اوصاف اس کے دائری کار میں نہیں آتے۔ خدا اور بندے کا تعلق سے اسے کوئی غرض نہیں۔ قانون الٰہی کی تشریح کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔

کبھی ہم نے غور کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کو کیوں مومن کی معراج قرار دیا۔ اس سے کیا مراد کیا ہے؟

معراج کا معنی ہے سیڑھی چڑھنا گویا نماز میں جب ایک بندہ اپنے رب کے حضور

سجدہ کرتا ہے تو تو وہ ایک درجہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ہر نماز کے بعد بندہ مومن ایک اور اوپر کے درجہ پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے اسی لیے نماز کو مومن کی معراج کہا گیا ہے۔

قرآن کو کلام اللہ کہا گیا ہے اس لیے جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ قرآن نور ہے اس لیے وہ خارج سے روشنی کا محتاج نہیں۔ قرآن اپنی تشریح خود کرتا ہے جیسا کہ مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں کہ

معنی قرآن ز قرآن پرس وبس
وز کسی کہ آتش زدست اندر ھوس
پیش قرآن گشت قربانی وپست
تا کہ عین روح او قرآن شدست

قرآن حکیم کے مطالب اور معنی سمجھنے کے لیے قرآن پر ہی غور کرنا پڑے گا اور کسی اور طرف جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مولانا روم اس بات پر زور دیتے ہیں قرآن کی تفسیر و تشریح قرآن سے ہی جائے اور غیر قرآنی تصورات کی آمیزش کلام الہی میں نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام آج بھی انسانیت کو سکون دے کر ترقی کی معراج کی طرف لے جاسکتا ہے اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ باوجود تمام حالات کے اسلام ہی واحد دین ہے جو اب تک چلا ہے عیسائیت بحیثیت دین کے کبھی بھی نہیں رہی اور مذہب کی حیثیت سے تو اب گرجا گھر میں بھی نہیں رہی۔ یہودیت

میں نہ تو عالمگیریت ہے اور نہ آفاقی پیغام ۔یہ اسلام ہی ہے جس کی وجہ سے آج کا یورپ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔یورپ کے تاریک دور میں اگر مسلمان انہیں علم کی شمع نہ دیتے تو یہ آج بھی ظلمت کے اندھیروں میں ہوتے لہذا اسلام میں مکمل صلاحیت موجود ہے۔ جو قوم بھی اُن زریں اصولوں پر چلے گی کامیابی سے ہمکنار ہوگی اور مسلمانوں کے موجودہ تمام مسائل کا مختصر حل علامہ اقبالؒ نے بھی جیساکہ تجویز کیا تھا کہ یہ ممکن ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات سامنے آئیں اور مسلمان پھر سے عروج حاصل کر سکیں بشرطیکہ اسلامی دنیا روح عمرؓ کو لے کے آگے بڑھے وہ حضرت عمر فاروقؓ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے آخری لمحات میں کہا تھا حسبنا کتاب اللہ ، یعنی ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔خلاصہ کلام یہ کہ قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم زوال سے عروج کا سفر شروع کر سکتے ہیں

ہو تیری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم دل کو بیگانہ انداز کلیسائی کر

ایک نئی کتاب

میں نے جب اخبارات و جرائد میں لکھنا شروع کیا تو اُس وقت یہ ذہن میں نہیں تھا کہ اپنی ان تحریروں کو کسی وقت کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ لیکن بہت سے احباب اور قارئین نے اصرار کیا کہ چونکہ میری اکثر تحریریں مستقل نوعیت کی ہیں اس لیے انہیں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہونا چاہیے۔ اسی نوعیت کا مشورہ محترم غلام صابر چیئرمین اقبال اکیڈمی اسکینڈے نیویا ڈنمارک اور محترم پروفیسر محمد شریف بقا، صدر مجلس اقبال لندن نے بھی دیا۔ یہ دونوں حضرات خود بہت بڑے محقق، اہل علم، بہت سے کتابوں کے مصنف اور یورپ میں فکر اقبال کو متعارف کرانے میں ہر لمحہ مصروف عمل ہیں۔ محترم غلام صابر کو اُن کی ایک کتاب پر صدر پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی ملا ہے۔ محترم محمد شریف بقا اسلام، قرآن حکیم، پاکستان اور اقبالیات پر ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اہل قلم اور احباب نے بھی ایسا ہی مشورہ دیا تو میں نے اپنے لکھے گئے مضامین سے اُن کا انتخاب کیا جو قارئین کی جانب سے بہت پسند کیے گئے تھے۔ یہ کالم چونکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے اس لیے ممکن ہے کہ ایک ہی بات کئی ایک جگہ پر پڑھنے کو ملے۔ میرے نزدیک یہ کتاب کا حسن ہے کہ مصنف جس بات کو اہم سمجھتا ہے اُسے مختلف زاویوں اور طریقوں سے قارئین تک پہنچاتا

ہے۔یہ انداز میں نے قرآن حکیم کے مطالعہ سے سیکھا ہے کہ رب العالمین تصریف آیات سے ایک ہی بات کو مختلف مقامات پر بار بار دہراتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔قرآن حکیم انسان کو اُس کے اصل مقام سے آگاہ کرتے ہوئے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے عمل کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ فکر اقبال سے بھی ہمیں یہی درس ملتا ہے ۔ وحی خداوندی کی رہنمائی میں عقل انسانی سے تمام مسائل کا حل دریافت کیا جاسکتا ہے۔آئین نو اور افکار تازہ میں انسانی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ انسانوں اور حیوانوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ حیوان سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔اس سلسلہ مضامین کا سب سے اہم مقصد غور وفکر کی دعوت دینا ہے اور اب یہ کتاب کی صورت میں افکار تازہ کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔

کسی بھی لکھنے والے کو حرمت قلم کا امین ہونا چاہیے تاکہ وہ پوری دیانت داری سے اپنی بات قارئین تک پہنچا سکے۔ الحمد اللہ یہ اہمیت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی اور بفضل تعالی اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھایا ہے۔ اپنے قلم کو نہ تو غلو اور خوشامند کی آلائشوں سے آلودہ کیا اور نہ ہی حق اور سچ بات لکھنے میں کوئی خوف اور ترڈد ہوا۔ حکیم الامت کی پیروی میں ساز سخن کو بہانہ بناتے ہوئے اپنے جذبہ، جنون ، لگن اور افکار کو لفظوں میں پرویا جو اس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ مجھے اردو کا کوئی ادیب یا ماہر ہونے

کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ اردو سے محبت کا بھی اظہار ہے کہ سویڈن اور شمالی یورپ میں اپنی بساط کے مطابق اس کے فروغ کے لیے کوشش کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے جس کے تحت چند اور کتب جلد ہی قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ مستقبل میں جب بھی کوئی سویڈن اور اسکنڈے نیویا میں اردو کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس کوشش سے صرف نظر نہیں کر سکے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ بیرون ممالک میں مقیم ہیں وہ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہیں اور وہ ہر معاملہ میں جس ملک کو وہ چھوڑ کر آئے ہوتے ہیں،اُس کا وطن ثانی کے ساتھ موازانہ کرتے ہیں۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ جس ملک سے ہجرت کی تھی وہ بھی خوشحالی، امن اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے اور اس کا عکس قارئین کو میری تحریروں میں واضح طور پر نظر آئے گا۔اس کتاب کی اشاعت میں جن احباب نے جس طرح سے بھی تعان کیا میں اُن سب کا مشکور ہوں۔ افکار تازہ اب کتاب کی صرت میں شائع ہو گئی ہے اور پاکستان و آزاد کشمیر میں دستیاب نے بھی شائع کیا ہے اور بیرون ملک مقیم احباب یہ Amazon ہے۔ اس کتاب کو سے حاصل کر سکتے ہیں۔افکار تازہ کتاب کا ویب لنک www.amazon.com کتاب

یہ ہے http://goo.gl/v4Wg0z

قارئین سے مجھے یہی کہنا ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے سیکھنے کے عمل سے

گذرتے ہوئے جوکچھ محسوس کیا اسے سپرد قلم کرکے قارئین کی خدمت میں پیش کررہاہوں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنی رائے سے مجھے ضرور آگاہ کریں۔اللہ تعالیٰ ہمیں سوچنے سمجھنے اور پھر عمل کرنے کی توفیق عطافرمائے۔امین۔

ایک شادی اور متعدد نکاح

اس ہفتے کا کالم تو قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سیکریٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر جانب کے ایچ خورشید کے بارے میں لکھنے کا ارادہ تھا جن کی ۱۱ مارچ کو برسی ہے لیکن ایک مفتی صاحب کے تازہ فتویٰ نے ہلچل مچادی ہے اس لئے احباب کے صرار پر ارادہ بدل دیا ہے۔ جہاں تک کے ایچ خورشید کا تعلق ہے، انہوں نے آزاد کشمیر میں صاف ستھری سیاست کی طرح ڈالی، وہاں کے لوگوں کو ووٹ کا حق دیا، آزاد جموں کشمیر لبریشن لیگ کی بنیاد رکھی اور آزادی کشمیر کے لیے ایک قابل عمل نظریہ دیا کہ آزاد کشمیر حکومت کو ریاست کی نمائندہ حکومت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ پوری عمر کار زار سیاست میں گذارنے، پاکستان اور آزاد کشمیر کی سیاست میں اعلیٰ عہدوں پر رہنے کے باوجود اُن کی ذات تمام برائیوں اور بدعنوانیوں سے پاک رہی جس کا اعتراف اُن کے بدترین مخالفین بھی کرتے ہیں۔ خورشید حسن خورشید پوری عمر کرائے کے مکان میں رہے اور پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ پاکستان و کشمیر کی سیاست میں کوئی اُن جیسا نہیں۔

بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی تو
لا کے رکھو سر محفل کوئی خورشید اب کے

پاکستان سے ایک مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہے کہ ایک شادی اور کئی نکاح بیک وقت کئے جا سکتے ہیں۔ اُن یہ فتویٰ صادر ہوتے ہی میڈیا میں تبصرے ہونے لگے لیکن کسی نے بھی قرآن حکیم کی روشنی میں اس کا جائزہ نہیں لیا۔ علامہ اقبال نے ایسے ہی مذہبی پیشواؤں کے بارے میں کہا تھا کہ قرآن حکیم کی جو تشریح یہ لوگ کر رہے ہیں اس نے خدا، جبرئیلؑ اور رسول اکرم ﷺ کو حیرت میں ڈال دیا ہے کہ یہ قرآن کے بالکل برعکس کہہ رہے ہیں۔ علامہ نے اس بارے میں مزید فرمایا کہ

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس فقیہان حرم بے توفیق

قرآن حکیم نے بھی ایسی مذہبی پیشوائیت کے بارے میں بتا دیا ہے کہ بہت سے علماء اور مشائخ اللہ کی طرف جانے والے راستہ میں رکاوٹ ہیں (سورہ توبہ آیت ۳۴)۔ مفتی صاحب کے فتویٰ سے قبل یہ ذہن میں واضح رہے کہ رسول اکرمؐ دین مکمل کر گئے تھے مائدہ آیت ۳)۔ اجتہاد صرف اُن مور میں ممکن ہے جن کے بارے میں قرآن حکیم) میں حکم موجود نہیں۔ جس بارے میں قرآن نے فیصلہ دے دیا ہے اس میں اجتہاد ممکن نہیں بلکہ خود رسول اکرمؐ وحی میں تبدیلی نہ سکتے تھے (سورہ یونس آیت ۱۵)۔ نبی اکرم خود وحی پر ایمان لائے اور عمل کرتے تھے

سورہ البقرہ آیت ۲۸۵)۔اب کسی مفتی کو اجازت دینے یا نہ دینے کا اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔مذکورہ مفتی صاحب کہنا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے قانون کی رکاوٹ کو ایک شادی اور کئی نکاح کی صورت میں دور کیا ہے۔ایک ٹی پروگرام میں انہوں نے سورہ نساء کی تیسری آیت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ بیک وقت چار شادیاں کی جاسکتی ہیں۔انہوں نے بار بار یہی آیت تلاوت کی کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث وربع یعنی اُن عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں، دو دو، تین تین اور چار چار۔ قارئین اگر آپ کبھی کسی نکاح کی مجلس میں شریک ہوں تو غور کرنا کہ وہاں بھی نکاح حضرات آیت کا یہی ٹکڑا تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس سے زیادہ تحریف اور کیا ہوگی کہ آیت کا پہلا اور آخری حصہ چھوڑ کو صرف درمیان کا ٹکڑا پڑھا جائے اور آیت بھی وہ جس کا آغاز حرف شرط سے ہو رہا ہے۔ یہ ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ اگر جملے سے پہلے کوئی حرف شرط ہو تو اُس کے بغیر بات کا مطلب ہی بدل جاتا ہے۔ قواعد کے مطابق جب کسی کام کو موقوف کرتے ہیں تو موقوف علیہ کے آغاز میں جو لفظ لاتے ہیں وہ حرف شرط ہے مثلاً اگر، جو، ہر چند وغیرہ۔جب جملہ میں حرف شرط ہوگا تو اُسے بولتے اور لکھتے وقت ساتھ بولا جائے گا وگرنہ بات کا مطلب کچھ اور نکلے گا۔ قرآن حکیم کی سورہ نساء ہی کی آیت ۴۳ میں ہے کہا گر تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ اب کوئی جملے کا پہلا حصہ چھوڑ کر صرف یہ کہے کہ نماز کے قریب مت جاؤ، اسے

کوئی بھی درست تسلیم نہیں کرے گا۔ مثلاً اس جملے پر غور کریں کہ اگر اس کا ناشتہ ذرا دیر میں تیار ہوا تو ملازم کے سر آفت آ جائے گی۔ اس جملے سے صاف ظاہر ہے کہ ناشتہ دیر سے بنے گا تو ملازم پر آفت آئے گی لیکن اگر دیر سے نہ بنے تو آفت نہیں آئے گی۔

ایک سے زائد شادی سے متعلق پورے قرآن میں صرف آیت ہے جو سورہ نساء کی تیسری آیت ہے اور یہ فانکحو سے شروع نہیں ہوتی بلکہ آیت یوں ہے "وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلاث وربع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ماملکت ایمانکم ذلک ادنی الا تعولوا" یہ آیت حرف شرط وان خفتم سے شروع ہوتی ہے اور ایک اور حرف شرط درمیان میں موجود ہے۔ اس کا ترجمہ یوں ہے کہ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار مگر یہ اجازت بشرطِ عدل ہے)، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (زائد بیویوں میں)) عدل نہیں کر سکو گے تو صرف ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا وہ کنیزیں جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں آئی ہوں، یہ بات اس سے قریب تر ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو۔ اس آیت کی روشنی میں ایک سے زائد شادی کی پہلی شرط یہ کہ اگر معاشرہ میں کوئی ایسی صورت مثلاً جنگ کی وجہ سے یتیم عورتوں کے مسئلہ کو کوئی حل نہ ہو تو اسلامی حکومت ایک زائد

شادی کی اجازت دے سکتی ہے۔ لیکن اگر یتیم عورتوں کا مسئلہ ہی نہ ہو تو پھر ایک سے زائد شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ حرف شرط آیت کے شروع میں ہے۔ اگر وہ صورت ہوگی تو دوسری شادی کا امکان ہے لیکن اگر وہ صورت ہی نہ ہو تو پھر دوسری شادی کی ضرورت اور امکان ہی نہیں۔ یہ ہنگامی حالات کے لیے ایک راستہ ہے نہ کہ عام اجازت کہ جس کا جب دل چاہیے دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرلے اور کہے کہ میں عدل کرسکتا ہوں۔ عدل تو دوسری شرط ہے اس سے قبل پہلی شرط کا موجود ہونا لازم ہے۔ اسی آیت میں شادی کا عام اصول فلا واحدہ کی صورت میں واضح کردیا کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی ہوگی۔ اگر کسی کا بناہ نہ ہوسکے تو طلاق کی صورت میں دوسری بیوی لائی جاسکتی ہے جسے قرآن حکیم نے سورہ نساء کی آیت بیس میں بیان کیا ہے۔ جہاں تک لونڈیوں کا تعلق ہے تو یہ اُن بارے میں ہے جو اُس وقت معاشرہ میں موجود تھیں اُس کے بعد اسلام نے لونڈی اور غلام بنانے کا راستہ بند کردیا ہے۔ پورے قرآن ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کہا گیا کہ غلام اور لونڈیاں بناؤ۔ جنگ میں گرفتار ہونے والوں کے لیے قرآن نے یہی حکم دیا کہ انہیں خواہ فدیہ لے کر یا احسان کرکے چھوڑ دیا جائے (سورہ محمد آیت ۴)۔ جب غلام بنانے کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا تو پھر لونڈیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اگر یتیم عورتوں کا مسئلہ درپیش ہو تو نظام مملکت دوسری شادی کی اجازت دے سکتا ہے اور اگر یتیم عورتوں کا مسئلہ موجود نہ ہو تو

دوسری، تیسری اور چوتھی شادی احکامات خدا کے خلاف ہے۔ عدل کی شرط بعد میں آئے گی۔ قرآن نے یہ بھی واضح کردیا کہ نکاح کے لیے بالغ عمر میں ہی ہوگا (سورہ نساء آیت ٦)۔ قرآن حکیم کی رو سے نکاح مسیار، نکاح جہاد اور عارضی نکاح کی کوئی حیثیت نہیں۔

پولیٹیکل اسلام اور حصول پاکستان

اسلام مذہب کے طور پر تو جاری رہا بلکہ آگے بڑھتا رہا لیکن پولیٹیکل اسلام کا تسلسل نہ رہ سکا۔ خلفاء راشدین کے دور کے بعد جب ملوکیت نے خلافت کی جگہ لی تو اسلام دین کی بجائے مذہب کا شکل اختیار کر گیا۔ سیاست اور مذہب دو الگ الگ شعبے بن گئے۔ اس طرح اسلام دین کی حیثیت سے ایک قوت نافذہ کے طور پر جاری نہ رہ سکا۔ بقول اقبال اسلام جس نے محکوم انسانوں کو دوسروں کے تسلط سے نجات دلائی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اسی پر ملکوکیت کا غلبہ ہوگیا۔ نسلی و قبیلائی تعصبات اور فرقہ واریت نے اسلام کی ایک ملت اور ایک قوم کے نظریہ کو پس پشت ڈال دیا۔ اسلام کا شورائی نظام محض ایک نظریہ بن کر رہ گیا کیونکہ اسلامی تاریخ میں بنو امیہ، بنو عباس، بنی فاطمہ اور دیگر خاندانی حکومتیں جس کی آخری کڑی خلافت عثمانیہ تھی۔ حصول اقتدار کے لیے ہر جائز و ناجائز ذرائع اختیار کیے گے۔ ریاست کا اقتدار بادشاہوں کے پاس چلا گیا جبکہ مذہبی رسومات طبقہ علماء کا حق ٹھہرا۔ عیسائیت کی طرح اسلام میں بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ ہوگیا اگرچہ علماء حق نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ مذہبی پیشوائیت، بادشاہ وقت کے حق میں سند جاری کرتی اور خطبہ جمعہ میں اس کا درس دیا جاتا۔ حیرت یہ ہے کہ اب بھی کئی بار خطبہ جمعہ میں اس دور ملوکیت کے الفاظ سننے کو ملتے ہیں کہ السلطان

ظل اللہ یعنی سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس ہے۔ ہم اگرچہ یہ نہیں سمجھ سکے لیکن اغیار کو یہ حقیقت معلوم ہے اور کچھ عرصہ قبل معروف سویڈش مصنف اور اسلامی امور کے ماہر Jan Hjärpe نے واضح طور پر لکھا کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت نہیں ہے۔ دین کا مقصد تزکیہ نفس کے ساتھ اسلامی ریاست قیام بھی ہے اور رسول اکرم نے دونوں کام کیے۔

اقوام یورپ نے جب سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر صلاحیتوں کے باعث انیسویں صدی سے اسلامی دنیا کو اپنے نوآبادیاتی نظام کا حصہ بناتے ہوئے انہیں اپنے زیر نگین کیا لیکن ساتھ ہی انہیں مذہبی رسومات ادا کرنے کی آزادی دی۔ مذہبی علماء خوش تھے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ہر غاصب قوم اپنی محکوم قوم پرستش کی آزادی دیتی ہے تاکہ وہ اسی میں مست اور غلامی پر رضامند رہیں۔ برطانوی دور کے مذہبی راہنماء بہت خوشی سے اعلان کرتے تھے کہ

حکومت نے تم کو آزادیاں دی ہیں پرستش کی راہیں سراسر کھلی ہیں

بجتا ہے چرچ میں فقط اتوار کو گھنٹا سن خور و اذان گونجتے ہیں روز برابر

اس دور کے مذہبی طبقہ کی صورت حال کو کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عطا٦ اللہ شاہ بخاری، جمعیت علماء ہند اور دوسرے کانگریسی علماء کی جانب سے دو قومی نظریہ کی مخالفت اسی بنا پر کہ وہ اسلام کو محض ایک عقیدہ اور مذہب خیال کرتے تھے۔ وہ پولیٹیکل اسلام کی اہمیت سے بے بہرہ تھے اور اقوام یورپ کے نیشنل ازم کی بنیاد پر قوم کی تشکیل کے علمبردار تھے۔علامہ اقبال نے اسی لیے کہا کہ ابھی تک ان لوگوں کو دین اسلام کی رمز نہیں جان سکے وگرنہ دیوبند کے ایک عظیم عالم حسین احمد مدنی کیوں یہ کہتے کہ قوم دین سے نہیں بلکہ وطن سے بنتی ہے۔ اُن کے نام اپنے ایک خط میں علامہ نے اپنا نقطہ نظر واضح طور پر بیان کیا۔ کانگریسی علماء کی حقیقت کو اکبر آلہ آبادی نے بہت خوب انداز مین یوں بیان کیا کہ

کانگریس کے مولوی کا کیا پوچھتے ہو حال گاندھی کی پالیسی کا تھے عربی میں ترجمہ

دوسری عالمگیر جنگ کے نو آبادیاتی نظام کی جہت جب بدلنے لگی اور اقوام یورپ نے مسلم دنیا سے اپنا تسلط ختم کرنا شروع کیا اور ساتھ اُن میں نیشنل ازم کا بیج بو دیا۔

خلافت عثمانیہ کے کئی ٹکڑے کرکے ہر ایک کے ہاتھ میں الگ پرچم تھما کر انہیں بتایا کہ تم ایک دوسرے سے مختلف قوم ہو۔ کہنے کو تو آزاد اسلامی ممالک وجود میں لیکن حقیقت میں ایک نئے تسلط کا آغاز ہوا جس

میں اسلام مذہب کے طور پر تو موجود ہے لیکن دین کی حیثیت سے محو ہو گیا۔ مسلم معاشرہ جو پہلے ہی فرقوں اور قبیلوں کی وجہ سے منقسم تھا اور قومیت کے جال میں ایسا پھنسا ہے کہ رہائی کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی اب مسلمانوں کو کسی بیرونی دشمن کی ضرورت ہے۔ دور حاضر میں مسلم دنیا میں جو جنگ و جدل جاری ہے اس کا ایندھن دونوں جانب سے مسلمان ہی ہیں۔ اُن دشمنوں کی کامیاب حکمت عملی کی وجہ سے مسلم دنیا کا جوہر قابل ضائع ہو رہا ہے۔ جدید نیشنل ازم نے نوع انسان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا لیکن اس پر ملمع کاری کرنے کے لیے اقوام متحدہ اور اسلامی کانفرنس جیسے خول چڑھانے کی کوشش کی۔ بقول حکیم الامت

مکے نے دیا خاک جینوا کو یہ پیغام جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

اسلامی تاریخ میں چوہدری رحمت علی وہ پہلے راہنماء ہیں جنھوں نے دین اور نظریہ کی بنیاد پر الگ وطن کا تصور دیتے ہوئے اس کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ اسلام میں سیاست دین کا حصہ ہے۔ اسلام قومیت کی بنیاد رنگ و نسل یا علاقائی نسبت کی بجائے مشترکہ نظریہ اور نظام حیات کو قرار دیتا ہے اور اسی کی تشریح علامہ اقبال نے پوری عمر کی اور یہی نظریہ انہیں جناح کو سمجھانے میں دس سال لگے۔ جب جناح نے اس نظریہ کو سمجھ لیا تو وہ قائدِاعظم کے لقب سے موسوم ہوئے اور دنیا کے نقشہ پر ایک بار پھر مشترکہ نصب العین کی

بنیاد پر پاکستان کی ریاست معرض وجود میں آئی۔ قائد اعظم نے درست کہا تھا کہ پاکستان کا مطالبہ ہم نے محض ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم وہ سرزمین حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلامی قوانین اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اُن کا یہ ارشاد قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ہے۔ پاکستان درحقیقت پولٹیکل اسلام کا احیاء ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان اس مملکت سے محبت کرتے ہیں۔ پاکستان سے محبت کرنے کے لیے اس کا شہری ہونا ضروری نہیں۔

پانچ روز پراگ میں

جینیاتی طبّی تحقیق کی تیرھویں بین الاقوامی کانفرس میں شرکت کے لیے جمہوریہ چیک کے دارالحکومت پراگ میں جانے کا تفاق ہوا۔ ہر ڈیڑھ سال بعد اس نوعیت کی کانفرس کسی ایک ملک میں منعقد ہوتی ہے جس میں دنیا بھر کے سائنس دان، ماہرین اور جینیاتی انجنیئرنگ کے میدان میں پیشہ وارانہ کام کرنے والے افراد شریک ہوتے ہیں۔ بیماریوں کی تشخیص وعلاج ہو یا انسانی خوارک اور دوسرے معاملات ، جینیاتی تحقیق کی حیثیت مسلمہ ہے اسی لیے دنیا بھر کی جامعات اور تحقیقی اداروں میں اس پر بہت زیادہ کام ہو رہا ہے اور اس سال کانفرس میں شرکاء کی تعداد ساڑھے چھ سو سے زائد تھی لیکن اسلامی دنیا سے صرف ترکی، ایران اور سعودی عرب کی نمائندگی تھی باقیسارے عالم اسلام بشمول پاکستان سے کوئی شریک نہیں تھا۔ سائنس اور تحقیق کے شعبہ میں انحطاط کا اندازہ اس سے لگانا مشکل نہیں۔ پراگ جو کہ جمہوریہ جیک کا دارلحکومت ہے اس میں چارلس یونیورسٹی کی بنیاد ۱۳۴۸ء میں رکھی گئی جو کہ یورپ کی قدیم ترین جامعہ ہے۔ یہ وہی دور تھا جب ہندوستان میں محمد بن تغلق کی حکومت تھی لیکن وہاں کے بادشاہوں کو یہ خیال نہ آیا۔ پراگ ایک قدیم تاریخی، صنعتی، تعلیمی، ثقافتی، تجارتی اور سیاسی مرکز ہے۔ اس شہر نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں جس کی بازگشت اس کی تاریخی عمارتوں سے سنائی دیتی ہے۔

دریائے وتاوا بل کھاتا ہوا ست روی سے اس کے درمیان سے گذرتا ہے۔ پراگ ۱۹۱۸ء میں چیکوسلواکیہ کا دارالحکومت بنا جو اس خطہ سے کیمونزم کے خاتمہ کے بعد یکم جنوری ۱۹۹۳ء کو جمہوریہ چیک کا دارلحکومت بنا ور سلواکیہ ایک الگ ملک بن گیا۔ ایک سے دو ملک ایسے بنے کہ دنیا کے دنیا میں مثال قائم ہوئے نہ ہماری طرح کہ مشرقی پاکستان اس قدر رسوائی سے الگ ہوا کہ دونوں ممالک اب بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

چاروں طرف خشکی میں گھرے ہوئے جمہوریہ چیک کے ہمسایوں میں سلواکیہ، پولینڈ، آسٹریا اور جرمنی شامل ہیں۔ اس کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ جبکہ رقبہ صوبہ خیبر پختون خواہ سے تھوڑا سا زیادہ ہے۔ اس خطے کے دو سنہرے ادوار میں سے ایک بادشاہ چارلس چہارم ۷۸۔۱۳۴۶ء اور دوسرا رودلف دوم ۱۶۱۲۔۱۵۷۶ء کا سمجھا جاتا ہے۔

چارلس نے یونیورسٹی قائم کرنے کے علاوہ دریائے وتاوا پر چارلس پل تعمیر کیا جو شہر کا اہم سیاحتی مقام ہے۔ بادشاہ چارلس نے شاہی نجومی کے مشورے پر صبح ساڑھے پانچ بجے ۱۳۵۷ء کو اس پل کا سنگ بنیاد رکھا جو کہ ۱۴۰۲ء میں مکمل ہوا۔ کیتھڈرل، قلعہ اور دیگر تاریخی عمارتیں بھی اس دور کی یادگار ہیں جنہیں سیاح بہت دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

پراگ ایک پیارا شہر ہے جو یورپ کے ماضی، حال اور مستقبل کی جھلک لئے ہوئے ہے۔ ذرائع آمدورفت کا بہت اچھا نظام ہے۔ زیر زمین ریلوے، ٹرام اور بس سب

موجود ہیں۔ مغربی یورپی ممالک کی نسبت سستا شہر ہے۔ موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی سیاحوں سے یہ شہر بھر جاتا ہے۔ وہاں جانے کا ارداہ کیا تو کچھ احباب نے جیب کتروں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ خیر کوئی ناخوگوار واقعہ تو نہیں ہوا لیکن اس ملک کا فون کے لیے بین الاقوامی کوڈ ۴۲۰ ہے۔ وہاں مقیم ایک پاکستانی محمد ارشد نے اس بارے میں کہا کہ جب بھی کسی دوسرے ملک میں مقیم پاکستانی کو اپنا فون نمبر دیتے ہیں تو ساتھ ہی مسکراہٹ کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ پراگ میں ٹیکنکل یونیورسٹی کی بنیاد ۱۷۰۷ء میں رکھی گئی ۔ یہاں کی نیشنل لائبریری، قلعہ، پرانا شہر اور بہت ہی تاریخی عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پراگ میں ایک بڑی جامع مسجد کے علاوہ اور مساجد بھی موجود ہیں۔ شہر کے وسطی علاقہ میں ایک مسجد کی توسیع کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس شہر پر جرمنوں کا قبضہ رہا۔ پراگ دوسرے یورپی ممالک کی ترقی میں دوڑ میں شامل ہے اور نوجوان کیمونزم کے خاتمہ سے خوش ہیں جبکہ عمر رسیدہ افراد اب بھی اس دور کو یاد کرتے ہیں۔

پراگ میں پاکستانی سفارت خانہ نے یوم پاکستان کے موقع پر شام قوالی کا نعقاد کیا جس میں مجھے اہلیہ اور بیٹے حارث کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ یوم پاکستان کی اس تقریب میں عورتیں اور بچے بھی شریک تھے اگرچہ پاکستانی کیمونیٹی وہاں بہت کم ہے۔ مقامی باشندوں کی ایک بڑی تعداد بھی وہاں موجود

تھی۔ پراگ میں غیر ملکی سفارتی عملہ بھی مدعو کیا گیا تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ کا عملہ یوم پاکستان کی اس تقریب میں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا ور ان کی تو ضع کے لیے مصروف تھے۔ ایک مقامی سینما میں ہونے والی اس تقریب کے آغاز میں پاکستان کے بارے میں بہت اچھی دستاویزی فلم دیکھائی گئی اور پھر صوبہ سندھ، بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے علاقائی لباسوں میں ملبوس خواتین نے لوک گیتوں پر رقص پیش کیا لیکن پنجاب کا رنگ غائب تھا جس کی کوئی وضاحت بھی نہ کی گئی۔ ایک مقامی گلوکارہ نے فریدہ خانم کی گائی ہوئی غزل پیش کی۔ سفیر پاکستان تجمل الطاف نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ جس دن میں جمہوریہ چیک کے صدر کو اپنی سفارتی اسناد پیش کرنے گئے تھے وہاں چیک وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر بھی موجود تھے جو اس محفل کے مہمان خصوصی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قوالی سے انہیں بہت لگن ہی اور ان کی خواہش ہے کہ پراگ میں قوالی کا کوئی پروگرام بنایا جائے۔ بعد ازاں ایک اور ملاقات میں انہوں نے جب دوبارہ اسی خواہش کا اظہار کیا تو ہم نے اسی کے پیش نظر قوالی کنسرٹ کا اہتمام کیا ہے۔ جمہوریہ چیک کی وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر نے سفیر پاکستان کی باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانیوں کو جب پہلی دفعہ کوئی کام کہا جائے تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن جب دوسری بار کہا جائے تو پھر کام ہو جاتا ہے جیسے آجکی شام قوالی ہے۔ اُن کے خطاب میں قوالی کی تاریخ، امیر خسرو، تصوف اور اسلامی تاریخ پر گہری نظر اس امر کی

عکاسی کرتی ہے کہ انہیں ان امور سے گہری دلچسپی ہے۔ قوالی کی تاریخ اور ساری تمہید کے بعد موصوف اور آنے والے مہمان توقع کر رہے تھے کہ آج وہ قوالی سے خوب لطف اندوز ہوں گے لیکن اسٹیج پر صرف محمود صابری اپنے طبلہ نواز کے ہمراہ قوالی پیش کرنے آئے تو قوالی شرکاء حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک تیسرے شخص کو محض اسٹیج کا توازن برقرار رکھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ یہ قوالی سے زیادہ خیراتی پروگرام نظر آنے لگا اور شرکاء ایک ایک کرکے جانے لگے۔ ہماری ہمت بھی جواب دینے لگی اور جب ہم دیکھا کہ ہال سے اکثریت چلی گئی ہے تو ہم نے بھی نکلنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ہال سے باہر لوگ قوالی کے نام پر ہونے والے کنسرٹ پر اپنے تبصرے کر رہے تھے اور ہم بھی یہ سوچ رہے تھے کہ چیک وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر نے اگر قوالی کی فرمائش کر ہی دی تھی تو کیا ایسے پوری کی جاتی ہے۔ بحر حال پراگ میں پانچ روز گذارنے کے بعد ہم بذریعہ ریل آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کی جانب روانہ ہوئے جس کا احوال اگلے ہفتے۔

ویانا میں چند روز

پراگ سے ویانا جانے کے لئے ریل کا انتخاب اس لئے کیا کہ ایک تو یورپ میں ریل کا سفر بہت آرام دہ ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ دوران سفر چیک ریپبلک اور آسٹریا کی سرزمین دیکھنے کا موقع ملے گا۔ چند گھنٹوں کے پر لطف سفر کے بعد جب ویانا ریلوے اسٹیشن پہنچے تو چوہدری فاروق اور ارشد باجوہ ہمارے منتظر تھے۔ دونوں احباب سے مل کر محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ ہماری پہلے ملاقات ہے۔ چوہدری فاروق سے تو ایک مدت سے رابطہ تھا جبکہ ارشد باجوہ سے پہلی بار تعارف ہوا۔ دونوں احباب ایک طویل عرصہ سے آسٹریا میں مقیم ہیں۔ آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کے اندر یو این سٹی یعنی اقوام متحدہ کا شہر بھی آباد ہے جس میں اقوام متحدہ کے بہت سے دفاتر قائم ہیں۔ ان دفاتر میں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے روکنے کا ادراہ CTBT، تجارت، مہاجرین، خلاء، منشیات اور دیگر شعبوں سے متعلقہ آٹھ اہم ادارے ہیں۔ انہی میں سے ایک عالمی ادارہ برائے نیوکلیائی توانائی (IAEA) ہے جس میں چوہدری فاروق اکتیس سال کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں۔ اُن کے دل میں پاکستان دھڑکتا ہے اور وہ وہاں کے حالات بدلنے کا عزم رکھتے ہیں۔ حال ہی میں وہ عمران خان سے پاکستان میں جا کر مل کر آئے ہیں جس کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میرے دل سے

آواز آئی یہ سچا اور کھرا انسان ہے جو پاکستان کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے۔ چوہدری فاروق اپنے زمانہ طالب علمی میں گجرات کی معروف درسگاہ زمیندارہ کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر رہے ہیں۔ ان دونوں احباب کو مل کر وہی احساس ہوا کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی حب الوطنی کے جذبہ سے نہ صرف سرشار ہیں بلکہ وہ وطن عزیز کی ترقی اور خوش حالی کے لئے بھرپور کرادر ادا کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

آسٹریا اگرچہ ایک چھوٹا ملک ہے لیکن بڑا ماضی اور تاریخ رکھتا ہے۔ ۴۵۰ قبل مسیح کے آثار رکھنے والا یہ خطہ جنگ عظیم اول کے بعد ری پبلک آف آسٹریا قرار پایا۔ سولویں اور سترھویں صدی میں ترکوں نے اس خطہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وی یانا شہر کے مضافات میں ایک پہاڑی مقام تک ترک پہنچ آئے لیکن محاصرہ کے بعد بھی کامیابی نہ ہوئی اور واپس چلے گئے۔ کچھ عرصہ قبل آسٹریا نے اس پہاڑی مقام پر تین سو سال کی فتح کا جشن بھی منایا۔ ترک واپس تو چلے گئے لیکن کافی کو اس خطہ میں متعارف کرا گئے۔ وی یانا کے کافی ہاؤس بہت شہرت رکھتے ہیں جہاں مختلف قسم کے کیک اور پیسٹریاں واقعی لاجواب ہیں۔ آسٹریا نے ترکوں سے تو شکست نہ کھائی لیکن نپولین نے ۱۸۰۵ء کو انہیں شکست دے دی۔ دونوں عالمگیر جنگوں میں یہ میدان کارزار رہا۔ ہٹلر نے جس بالکونی سے ویانا میں خطاب کیا تھا سیاح اسے دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں آسٹریا کو آزادی اس شرط پر دی گئی کہ آئین میں غیر جانداری پر کاربند رہنے کا وعدہ کیا گیا یہی وجہ ہے کہ یہ ملک نیٹو یا کسی اور اتحاد میں شامل نہیں۔ یورپ کا اہم پہاڑی سلسلہ ایلپس کے تین سلسلے آسٹریا کو مغرب سے مشرق تک قطع کرتے چلے جاتے ہیں اور تین چوتھائی رقبے پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ سیاحت کا اہم مرکز ہے جو قدرتی مناظر کی دلکشی کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یورپ کے دیگر بڑے شہروں کی طرح ویانا بھی دریا کے کنارے آباد ہے اور ڈینوب دریا اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کرتا ہے۔ دریا سے نہریں نکال کا سیلابی صورت سے بچنے اک بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اسلامک سینٹر ویانا کی مسجد بہت خوبصورت اور وہاں کے مسلمانوں کا اہم مرکز ہے۔

ویانا شہر ماضی کی تاریخ کو اپنے اندر اس طرح سموئے ہوئے ہے کہ سیاحوں کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کا بھی یہ شہر ہے۔ اُس نے اعصابی اور نفسیاتی الجھنوں کے حل کے لئے تحلیل نفسی کے نام سے نیا طریقہ علاج وضع کیا۔ انسانی ذہن، خوابوں اور جنس پر اُس کے خیالات کی گہری چھاپ دور حاظر میں بھی موجود ہے اگرچہ مشرق کی طرح مغرب میں بھی اس کے ناقدین بڑی تعداد میں ہیں۔ ویانا میں گوئٹے کے بہت بڑے مجسمے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ جرمن زبان کے اس عظیم مفکر کو علامہ اقبال نے بہت خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ شہر تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں

کا گہوارہ رہا ہے اور اب بھی اپنی ماضی کی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

یونیورسٹی آف ویانا یورپ کی ایک قدیم جامعہ ہے جو ۱۳۶۵ء میں قائم ہوئی اور یہ تعلیم و تحقیق کی دنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اسی یونیورسٹی کی میڈکل فیکلٹی ۲۰۰۴ء سے ویانا میڈیکل یونیورسٹی کی صورت میں قائم ہے۔ پاکستان سے بہت سے ڈاکٹر اور دیگر شعبوں کے ماہرین آسٹریا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے گئے ہیں۔ آسٹریا میں پاکستانی کمیونیٹی اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں لیکن نمایاں مقام رکھتی ہے۔ دو دہایوں سے قائم پاکستان کرکٹ کلب بہت فعال ہے اور پاکستانی ثقافت اور کرکٹ کے فروغ کا باعث ہے۔ گذشتہ سال اس کلب نے ظہیر عباس کو مدعو کیا تھا جبکہ اس سال یوم آزادی کی تقریب میں کرکٹ کے معروف کھلاڑی عبدالرزاق شرکت کریں گے۔ کشمیر کلچر سینٹر و یانا ریاست جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے جو مسئلہ کشمیر کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے کوشاں ہے۔ چوہدری فاروق اور ارشد باجوہ نے میری کتاب افکار تازہ کی تقریب رونمائی بھی منعقد کی جس میں شامل کمیونیٹی کے اہم افراد سے ملاقات کا بھی موقع ملا۔ اسی تقریب میں پروفیسر شوکت علی سے بھی ملنے کا موقع ملا جو ادیب، شاعر، کالم نگار اور صحافی ہیں۔ ان کی تحریروں کے ذریعہ دنیا بھر میں اردو پڑھنے والے آسٹریا کے شب و رز سے آگاہ رہتے ہیں۔ آسٹریا میں مقیم پاکستانی اور کشمیری کمیونیٹی کے جن احباب سے ملاقات ہوئی اُن میں شیخ وحید احمد، مقصود خان، ناصر چوہدری، نعیم خان، ندیم خان، منظور

احمد خواجہ، عبدالسلام، رانا شبیر، عابد ملک، چوہدری رشید، سہیل باجوہ، محمد انور، مجاہد منصوری، عارف خان، غلام اظہر، مظہر جعفری، سرفراز اور بہت سے دیگر احباب شامل ہیں۔ اُن سب سے گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ وہ پاکستان کی بہتری اور خوشحالی کے لئے کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ انہوں نے تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا ایک منصوبہ شروع کیا ہوا ہے کیونکہ تعلیم سے ہی اقوام کی حالت بدلتی ہے۔ وہاں کی پاکستانی کمیونیٹی کی توجہ اس جانب بھی کہ یورپی معاشرہ میں اچھے اور ذمہ دار شہری کی حیثیت سے اپنا کرادر ادا کرنا ہوگا اور اپنی نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دینا اولین فریضہ ہے۔

بچوں کے ادب میں ایک منفرد اضافہ

اس حقیقت کا اعتراف تو اکثر کیا جاتا ہے کہ بچے ہمارا مستقبل ہیں لیکن ان کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ذمہ داری اس طرح سے ادا نہیں کی جارہی جو اس کا تقاضا ہے۔ مستقبل کے معماروں کی فکری تربیت اور دینی تعلیمات کی طرف توجہ نہیں دی جارہی جو قرآن حکیم اور سوہ حسنہ کی روشنی میں کی جائے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہیں یا تو نوجوان نسل بے راہ روی کی طرف جارہی ہے اور یا انتہا پسندی کی طرف۔ والدین اپنے فکر معاش اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس ذمہ داری کو بطریق احسن ادا نہیں کررہے بلکہ خود اُن کی دینی معلومات میں دسترس کی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت اُن بچوں اور والدین کے لئے اور بھی زیادہ ہے جو اُن ممالک میں مقیم ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں۔ ہمارے میڈیا کو لیں، بہت زیادہ ٹی وی چینل ، اخبارات اور آن لائن ویب سائٹس کی موجودگی کے باوجود نوجوان نسل اور بچوں کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ٹی وی پروگراموں میں سب کچھ دکھایا جاتا ہے ماسوائے بچوں کے پروگراموں کے۔ اس وقت بر شمار کالم نگار، ادیب اور منصف ہیں لیکن کتنے ہیں جو بچوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔ڑے ادیب تو بچوں کے لئے لکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ آج ہم بچوں کو نظر انداز کررہے ہیں تو مستقبل میں کس قسم کی قوم تیار ہوگی۔ بچوں کا سوال کرنا ایک معمول سی بات ہے لیکن انہیں تسلی

بخش جواب نہیں ملتا جس کے نتیجہ میں ننھا ذہن بھٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔ معصوم ذہنوں میں آنے والے سوال ہوتے تو بہت چھوٹے اور سادہ ہیں لیکن اُن کے جواب بعض اوقات اتنے بھی آسان نہیں ہوتے۔ لیکن اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے ایسے جواب دیئے جائیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر بچوں کی جانب سے کیئے گئے سوالات کے جوابات کو دلچسپ کہانیوں کی صورت میں لکھنا شروع ہوا جسے بچوں کے ساتھ بڑوں نے بھی بہت پسند کیا۔ جب یہ کہانیاں شائع ہونا شروع ہوئیں تو بہت سے قارئین کی جانب سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ انہیں ایک کتاب کی صورت میں ہونا چاہیے تاکہ یہ مستقل صورت میں بچوں اور والدین کے پاس ہوں۔ اس خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے اسے بچوں کے لئے دلچسپ اور انوکھی کہانیاں کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے اور یہ www.amazon.com پر دستیاب ہے۔ پاکستان میں اسے نیشنل بک فاؤنڈیشن شائع کر رہی ہے۔

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بچے جو کہ مستقبل کے معمار ہیں اُن کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ سچے مسلمان، اچھے انسان، محب وطن اور باوقار شہری بنیں۔ اُن کے ذہن میں کوئی الجھن نہ ہو۔ وہ اپنے دل اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ اپنے دین کی تعلیمات کو سمجھیں اور اُن پر عمل کرکے اپنی زندگی بسر کریں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کے ادب میں ایک خوبصورت

اضافہ ہو گی اور اس سے بچوں کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی تربیت مل سکے گی۔ اُن کا اسلام کی بنیادی باتوں کے بارے میں تصور بہتر ہو گا۔ پاکستان سے باہر جن ممالک میں ایسے بچے رہتے ہیں جو اردو زبان سمجھ تو لیتے ہیں لیکن خود نہیں پڑھ سکتے وہاں بڑوں کو چاہیے کہ وہ بچوں کو یہ کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ بڑے بھی جب ان کہانیوں کو پڑھیں گے تو انہیں بھی پڑھنے میں مزا آئے گا کیونکہ یہ کتاب آٹھ سال سے اسی سال کی عمر کے بچوں کے لیے ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف ادیب، محقق اور ماہر اقبالیات پروفیسر محمد شریف بقا صاحب لکھتے ہیں کہ جب سے یہ عالم رنگ و بو معرض وجود میں آیا ہے، اُس وقت سے لے کر اب تک انسان کسی نہ کسی رنگ کہانیاں سننے اور انہیں بیان کرنے کا عادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نازل کردہ کتابوں میں قصے بیان کیے ہیں جو ہمارے لیے اپنے اندر متعدد حقائق، ہدایات اور عبرت خیز واقعات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف محمود کسانہ نے بھی حکایت نویسی کا مجموعہ تیار کیا ہے تاکہ ہمارے بچے انہیں پڑھ کر اپنی زندگی کو سنوار سکیں اور ان کی روشنی میں اپنی ملّی زندگی کے لیے بھی کارآمد ہوں۔

امید واثق ہے کہ ہمارے بچے اور بچیاں اِن حیات بخش اور دلچسپ حکایات سے متاثر ہو کر دوسروں کے لیے عمدہ نمونہ بن جائیں گے۔ یہ امر باعث صد افسوس ہے کہ ہمارے اکثر اہل علم وادب نے ہماری نئی نسل خصوصاً یورپ اور امریکہ وغیرہ میں مقیم

بچوں اور بچیوں کے بارے میں بہت کم کتب تصنیف یا مرتب کی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کا ہماری ملی روایات اور تاریخ و علم سے گہرا تعلق قائم رہے تو پھر ہمیں اپنے نوجوانوں اور بچوں کو اپنے علمی و ادبی ذخائر سے واقف رکھنا ہوگا۔ یہ بات وجہ صد مسرت ہے کہ محترم عارف محمود کسانہ صاحب نے نسل نو کے لیے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں دور جدید کی علمی اکتشافات کی روشنی میں اسلامی تاریخ سے متعلق کہانیاں اور قرآنی تعلیمات پر مبنی مختصر مگر دلچسپ انداز میں لکھی ہیں۔ ان کی یہ کاوش یقیناً قابلِ ستائش اور لائقِ تقلید ہے۔

سویڈن میں پاکستان کے سفیر جناب طارق ضمیر نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا ایک مشکل کام ہے جس کے لکھنے والے کو نہ صرف بچوں کے رجحانات کو مد نظر رکھنا ہوتا ہے بلکہ کہانی کو معلوماتی بنانے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی بنانا پڑتا ہے یہ کام آجکل کے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانے میں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ آج کل بچوں کے لیے، بالخصوص دیار غیر میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے بچوں کے لئے، مختصر مگر معیاری کہانیوں کی شدید قلت محسوس کی جا رہی ہے۔اس کتاب کے مصنف عارف کسانہ صاحب جو کہ عرصہ دراز سے سویڈن میں مقیم ہیں ن کی کہانیاں بچوں کی پرورش میں بہت مددگار ثابت ہوں گی۔ یہ کہانیاں ہمارے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں امید ہے بہت سے بچوں میں

یہ کہانیاں اردو ادب کے ساتھ پائیدار رشتے کو استوار کریں گی اور اس بات میں معا ون ثابت ہونگی۔

ڈنمارک میں مقیم معروف ادیب نصر ملک جنھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتب لکھی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ یورپ میں رہتے ہوئے ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بچے موجودہ جدید سائنسی و مادی دور میں اپنے دین اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ انہیں سکولوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ اُن کے گھریلو ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا اور بچے مختلف سوالوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں ۔ایک انتہائی پریشان کن مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان بچوں کے دینی وتہذیبی اور قومی تشخص کے حوالے سے اٹھائے جانے والے سوالات کے مناسب اور بڑے احسن طریقے سے جواب دینے میں والدین کی کوششیں بھی بیشتر اوقات ناکافی ہوتی ہیں۔پاکستان میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے اور ایک انتہائی پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچوں کی صحیح اسلامی خطوط پر تربیت کیسے کی جائے کہ نونہالان وطن مستقبل میں معاشرے کی تعمیر و ترقی میں مثبت کردار ادا کر سکیں اور اسلامی طرز حیات اپناتے ہوئے دنیا اور آخرت میں سرخ رو ہو سکیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر عارف محمود کسانہ نے اس ملّی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بچوں کے لیے ایسی کہانیاں اور حکایات لکھی ہیں جو خالصتاً اسلامی سوچ و فکر کی عکاسی کرتے ہوئے بچوں کے لیے بڑی دلچسپ ہیں۔ یہ

کہانیاں قرآن حکیم اور فرمودات نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی روشنی میں اُنہیں اُن سوالوں کے مدلل جوابات بھی مہیا کرتی ہیں جو معصوم ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔

بچوں کے لیے کسی مخصوص سوچ و فکر اور نظریے کے تحت ادب تخلیق کرنا بہت ہی کٹھن کام ہے۔ اور خاص کر اس دورِ پُر آشوب میں یہ کام تو اور بھی مشکل ہے۔ لیکن ڈاکٹر عارف محمود کسانہ نے بچوں کی صالح تربیت کے لیے جو کہانیاں تخلیق کی ہیں انہیں پڑھ کر بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ نونہالان وطن کے لیے قلبی محبت سے سرشار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ہر قسم کی فرقہ بندی، رنگ و نسل اور ذات.برادری سے ہٹ کر ایک مضبوط قومی جذبے اور خالص اسلامی اصولوں پر مبنی طرز حیات اختیار کریں۔ ان کہانیوں میں جس طرح قرآن و سنت کو بنیاد بناتے ہوئے، عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کے آسان ترین جوابات دینے کے لیے بیحد سلیس و سادہ زبان میں بطور مثال یوں پیش کیا گیا ہے کہ بچوں کے لیے انہیں ذہن نشین رکھنا بہت ہی آسان ہے اور یہی ان کہانیوں کی کامیابی ہے۔ مجھے امید ہے کہ بچے جب ان کہانیوں کو پڑھیں گے یا والدین خود انہیں پڑھ کر سنائیں گے تو وہ طبعی طور پر ان میں دلچسپی لیں گے اور خود کو اُسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے جو انہیں اِن کہانیوں اور حکایات میں ایک صحیح انسان بننے کے لیے موجود ہے۔مجھے امید ہے کہ کہانیوں

کی یہ کتاب بچوں کے لیے بیحد مفید اور سبق آموز ثابت ہو گی اور ڈاکٹر عارف محمود کسانہ کی اِس کوشش کو سراہا جائے گا۔ انشاء اللہ ۔کتاب حاصل کرنے کے لیے اس ویب http://goo.gl/LvkGZx لنک پر جائیں۔

امان اللہ خان کی جہد مسلسل

جدوجہد آزادی کشمیر کے ایک عہد کا اختتام جناب امان اللہ خان کے اس دارِ فانی سے چلے جانے کے بعد ہوا۔ پچاسی سالہ زندگی میں انہوں نے اپنے مادر وطن کی آزادی اور مختاری کے لئے جو جدوجہد کی اس کا اعتراف اُن کے نظریاتی مخالفین کو بھی ہے۔ اس طویل جدوجہد انہوں نے اپنے اصول نہ بکنے، نہ جھکنے اور نہ رکنے کی عملی تصویر پیش کی۔ اُن کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ آزادی کشمیر کی جدوجہد کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ اب نہ کوئی کشمیر کے ٹکڑے کرسکے گا اور نہ ہی کشمیری عوام کی منشا کے بغیر کوئی حل ممکن ہوگا۔ وہ ریاست جموں کشمیر کی تمام اکائیوں کے درمیان ایک پل اور رابطہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وادی کشمیر ہو یا جموں، آزاد کشمیر ہو یا گلگت بلتستان، ہر جگہ ان کا نظریہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ دنیا بھر پھیلے ہوئے کشمیری ان کی وفات پر دلی صدمے سے دوچار ہیں۔ بقا صرف ذات خدا ہے باقی ہر شئے نے ایک دن اپنے اختتام کو پہنچنا ہی ہے لیکن کچھ لوگ اس دنیا سے جاکر بھی دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ امان اللہ خان انہی میں سے ایک شخصیت ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کی مکمل آزادی اور خود مختاری کے داعی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پاکستان سے اُن کی محبت کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی اور وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہم پاکستان کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں۔ وہ بانی

پاکستان قائد اعظم کی شخصیت کا بہت احترام کرتے تھے اور اُن سے بہت متاثر تھے۔ وہ قائد اعظم کی کشمیر پالیسی کی روشنی میں اپنے خود مختار کشمیر کے نظریہ کی وضاحت کرتے تھے ۔ اُن کی قیادت میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ تحریک آزادی کشمیر کا ہر اول دستہ بن گئی۔ پاکستان کی اکثر حکومتوں کے ناروا سلوک کے باوجود انھوں نے مملکت پاکستان یا نظریہ پاکستان کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ حکومت اور ریاست کے فرق کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور یہی درس انھوں نے اپنے کارکنوں کو دیا۔ انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح اپنی زندگی کی جدوجہد کی اور ہر طرح کے نامساعد اور مشکل حالات میں ہمت نہیں ہاری ۔ سیاست اور تحریک آزادی کشمیر سے ہٹ کر بھی اُن کے زندگی ہر کسی کے لیے رہنمائی کا باعث ہیں اور اُن کی کتاب جہد مسلسل کا مطالعہ سب کے لیے بہت مفید اور رہبر کا کام دے سکتا ہے۔

اُن میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جو دور حاضر کے بہت سے سیاسی رہنماؤں اور سرکردہ شخصیات میں مفقود ہیں اور میں ذاتی طور پر اس کا گواہ ہوں۔ مجھے یاد اُن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۶ء میں لاہور میں عارف کمال بٹ کے گھر پر ہوئی۔ وہ برطانیہ بدر ہونے کے بعد پاکستان آئے تھے۔ میں اپنے بھائی طارق محمود چوہدری کے ہمراہ انہیں ملنے کے لئے گیا اور ایک تفصیلی نشست ہوئی۔ اس ملاقات میں کشمیر فریڈم موومنٹ کے سپریم کمانڈر سید عبدالحمید دیوانی مرحوم

بھی موجود تھے۔ اس پہلی ملاقات کے بعد پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور سویڈن آکر اُن سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ اُن کی شخصیت میں نہ بناوٹ تھی اور یہ ہی ریا کاری۔ بہت سے سیاسی رہنماؤں اور دیگر شخصیات سے ملنے کا تفاق ہوا ہے لیکن امان اللہ خان جیسا خلوص، عاجزی، اعلیٰ اخلاق اور ملنساری کم ہی لوگوں میں دیکھنے کو ملی۔ وہ ہر ملنے سے بہت احترام سے پیش آتے اور اس میں بڑے یا چھوٹے کا فرق روا نہ رکھتے تھے۔ اپنے کارکنوں کے نام یاد رکھتے تھے اور اکثر انہیں ٹیلی فون بھی کر لیتے تھے۔ ستمبر ۲۰۰۷ء میں اُن سے جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنی خود نوشت جہد مسلسل کا دوسرا حصہ مجھے اپنے دستخط اور ستائش کے الفاظ کے ساتھ عنائیت کیا۔ میرے لئے یہ بھی اعزاز ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں میرا ذکر بھیکیا ہے۔ ان میں اعلیٰ انسانی اوصاف اور ایک قائد کی خوبیاں تھیں۔ کسی لالچ یا خوف نے انہیں اپنے مقاصد سے دور نہ کیا اور وہ ہر فورم پر اپنا نقطہء نظر بیان کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ سیاسی جدوجہد میں غلطیاں اور ایسے فیصلے بھی ہو جاتے ہیں جن کے نتائج مضر رساں ہوتے ہیں۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے قائد کی حیثیت سے انہوں نے وہی فیصلے کیئے جو تحریک آزادی کے لیئے بہتر تھے۔ ان کی وفات پر سرنگر میں کرفیو کا نفاذ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ امان اللہ خان کا نظریہ سے کس قدر پھیل چکا ہے۔ سری نگر، سوپور، بارہ مولہ، ہندواڑہ، اننت ناگ، پلوامہ اور ریاست جموں کشمیر کے اور بہت سے علاقوں غائبانہ نماز جنازہ اور تعزیتی اجتماعات اس بات کا بین ثبوت

ہیں کہ کشمیری عوام کے دلوں میں اُن کے لئے کس قدر محبت اور احترام ہے۔
وہ ریاست جموں کشمیر کے تمام باشندوں کے حقوق کے علمبردار تھے اور مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق کے مخالف تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلام نظریہ حیات کے حامی تھے۔ انہوں نے دومرتبہ عمرہ اور روضہ رسول پاکؐ کی زیارت بھی کی۔ اپنی کتاب جہد مسلسل کی پہلی جلد کے صفحہ ۷۴ پر وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قدروں پر میرا پختہ ایمان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب عمرہ کرنے گئے تو خانہ کعبہ کو دیکھ کر فرط جذبات سے میرے آنسو نکل گئے اور ہچکی بندھ گئی۔ طواف، حجر اسود کو بوسہ دینے اور نماز کی ادائیگی کے دوران بھی دل و دماغ کی ایک عجیب سی کیفیت رہی۔ جب میں نے مسجد الحرام کی پر جلال عمارت کو اندر اور باہر سے دیکھا تو میرا سر فخر سے بلند ہوگیا کہ مسلمان بھی ایسے عظیم ورثے کے مالک ہیں۔ یہ عمارت اپنے جمال اور جلال دونوں حیثیتوں سے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے گرجا گھروں سے کہیں ارفع ہے۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نماز کی ادئیگی کے بعد جب روضہ مبارک کے پاس سے گذار تو دل و دماغ کی میں شدت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں کامیابی کی کسوٹی کے لئے جو اہم رہنماء اصول دیے ہیں انہوں میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھ رکھا ہے۔ ہر شخص ان اصولوں پر عمل کرکے زندگی میں کامیابی اور عروج حاصل کر سکتا ہے۔ اُن صولوں میں خلوص، منزل کا تعین، مسلسل محنت، جھوٹ

سے احتراز، ثابت قدمی، خود اعتمادی، قوت برداشت، اخلاقی جرات، کسرِ نفسی، مشکلات سے استفادہ، یقین محکم، قول و فعل میں ہم آہنگی، بلند نظری، خود احتسابی، دوسروں پر اعتماد، میانہ روی، مناسب معلومات، وسیع النظری، انصاف پسندی، خود داری، منلساری اور زندہ دلی شامل ہیں۔ انہی اصولوں کے تحت وہ باعزت زندگی گذار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں انہیں کامیابی کی منزل نہ ملی لیکن اُن کے اپنے الفاظ میں کہ اگر آج مر جاؤں تو کم از کم اپنی سیاسی کارکردگی کے بارے میں اطمینان سے مروں گا۔ ان کی شروع کی گئی جدجہد جاری ہے اور قافلہ آزادی یٰسین ملک کی قیادت میں رواں دواں ہے جس سے اُن کی روح کو اور بھی اطمینان نصیب ہوگا۔

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

کسی بھی قوم کی ترقی یا تنزلی میں اس کے قائدین کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ قومی رہنماء مشعل راہ اور مینارۂ نور کی طرح ہوتا ہے۔ وہ گاڑی کے انجن کی مانندِ قوم لے کر چلتا ہے۔ اگر وہ درست سمت میں چل رہا ہو تو قوم بھی اس کے پیچھے اسی ڈگر پر چلتی ہے ۔ میرِ کارواں کی اگر نگاہ بلند اور دیدہ ور ہو تو قوم بالآخر کامیابی کی منزل پر پہنچ ہی جاتی ہے اور اگر راہبرِ قوم غلط سمت میں محوِ سفر ہو تو قوم کبھی بھی ترقی کی معراج کو نہیں پہنچ سکتی۔ قومی قائد میں جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کا اظہار اس کے کردار سے ہوتا ہے۔

دراصل ذاتی کردار ہی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں پیدا کر سکتا ہے۔ قومی زندگی میں یا پبلک لائف میں تو ہر کوئی اپنے آپ کو بہتر اور برتر ثابت کرتا ہے سوال یہ ہے کہ وہ نجی زندگی میں اور ذاتی طور پر بھی وہی اوصاف کا حامل ہے جو عمومی طور پر ظاہر میں سامنے ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ کردار ہی کی تعمیر ہے۔ وہ اس کے لئے مومن کا لفظ استعمال کرتا ہے اور تفصیلاً اس کا ذکر کرتا ہے کہ مومن کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔ یہ حقیقت ہے کہ بہتر کیریکٹر یا تشکیل کردار کے بغیر نہ تو انسانی مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی نظریاتی تعلیم عمل کی صورت میں

نظر نہیں آتی۔ قوم کے رہنماء بھی چونکہ اسی کے فرد ہوتے ہیں لہٰذا جیسی قوم ہوگی ویسے ہی رہنماء ہوں گے یا دوسرے الفاظ میں جیسے رہنماء ہوں گے ویسی ہی قوم ہوگی۔ اعلیٰ کردار کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن نہیں اور اس کے لئے قرآن حکیم نے مستقل اقدار واضح طور پر بتادی ہیں جو بھی ان پر عمل پیرا ہوگا کامیابی اور خوشحالی حاصل کرے گا ۔پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اس وقت بونا قیادت نے ترقی اور خوشحالی سے دور کر رکھا ہے۔ ایک تو قیادت یعنی لیڈر شپ میں وہ خوبیاں موجود ہی نہیں جو ہونی چاہیں اور دوسرا منافقانہ طرز عمل صورتِ حال کو مزید بدترین کر دیا ہے۔ذاتی کردار سے عاری قومی قیادت ہماری تباہی وبربادی کا باعث ہے۔ حضور ختم المرسلین نے جب مکہ میں دعوتِ حق دی تو سب سے پہلے اپنا کردار پیش کیا اور بدترین مخالفین نے بھی آپ ﷺ کے کردار پر کوئی انگلی نہ اٹھائی بلکہ صادق وامین کہا۔ یہی گواہی ابوسفیان نے بازنطینی بادشاہ کے دربار میں دی۔ قائدِ اعظم کی مثال لے لیجئے ان کے مخالف ان کے ذاتی کردار کو نشانہ نہیں بنا سکے نہ ہی کسی نے ان پر منافقت کا الزام لگایا اس کے برعکس آج مذہبی ، سیاسی، سماجی اور قومی قیادت کو دیکھئے۔ کرپشن، ٹیکس چوری، قرضے معاف کرانا، جعلی ڈگریاں استعمال کرنا، ناجائز دولت حاصل کرنا، جھوٹ، منافقت ،ریاکاری بددیانتی غرض ایک لمبی فہرست بن سکتی ہے وہ تمام چیزیں ان میں موجود، ہیں۔بیوروکریسی سیاستدانوں، مذہبی رہنما اور عوام بھی سب اس فہرست میں شامل ہیں۔

پانا مالیکس کی بدولت دنیا بھر میں ہلچل مچ گئی اور یورپ میں حکومت اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر فائیز لوگوں نے استعفیٰ دے دیئے لیکن پاکستان میں ابھی ٹی آر او ٹی آر او کھیلا جاتا ہے۔ مذہبی جذبہ سے سرشار لوگ یورپ میں تبلیغ کرنے آجاتے ہیں حالانکہ تبلیغ کی زیادہ ضرورت پاکستان میں ہے۔ یورپ کم از کم اخلاقی طور پر پاکستان کے رہنماؤں اور عوام سے بہت بہتر ہیں۔ تبلیغ کی ضرورت تو خود رائے ونڈ میں ہے، دور جانا بعد کی ترجیح ہونا چاہیے۔ وہاں عدل، انصاف، سچ، ایمان داری، رزق حلال اور سچی گواہی کا درس دینے کی ضرورت ہے۔ اُس جانب رخ کون کرے گا۔ پوری دنیا میں جو پاکستان کی رسوائی اس حوالے سے ہے کہ وہاں بے ایمانی اور کرپشن عروج پر ہے وہ سب پر عیاں ہے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ دنیا کے بد عنوان ممالک کی فہرست میں صف اول میں شامل ہے۔ اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہوگی کہ غیر مسلم اقوام کی نظروں میں مسلمان حکمرانوں کا تعارف بد دیانت اور لوٹ مار کرنے والوں کی حیثیت سے ہو۔ کوئی اربوں روپے مالیت کی دولت رکھنے کے باوجود چند ہزار انکم ٹیکس دے رہا ہے تو کوئی لوٹی ہوئی دولت کو چھپانے کے جتن کر رہا ہے اور پھر یہ کہا جاتا ہے کہ کرپشن ثابت کرو۔ یہ ثابت کون کرے گا؟ حضرت عمرؓ نے ایک جملے میں اس کا جواب دے دیا کہ مال دار کو خود ثابت کرنا ہے کہ دولت کیسے حاصل کی اور کہاں خرچ کی۔ بس اس اصول کا قانون بنادیں سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مگر قصور عوام کا بھی

ہے کہ وہ پھر انہی کو اپنے سر پر بٹھاتے ہیں جو ان کی تباہی کے ذمہ دار ہیں انہیں ہی اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، بقول میرؔ

میر بھی کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

قرآن حکیم عمل پر زور دیتا ہے زندگی میں کامیابی اور عزت اسی سے ملتی ہے۔ اپنا احتساب کرتے ہوئے جھوٹ اور منافقانہ طرز عمل چھوڑ کر سچائی کا راستہ اپنانا چاہیے۔مذہبی اور سیاسی قیادت کا ظاہر اور باطن ایک ہو اوران پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ عوام بھی ذمہ دار ہیں کیوں وہ ایسے رہنماؤں کو خود اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں۔ لیڈر اور عوام دونوں جہنم میں آپس میں کیا گفتگو کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو کیسے موردِالزام ٹھہراتے ہیں، یہ منظر کشی بہت وضاحت کے ساتھ قرآن حکیم نے کی ہے جسے اگلے کالم میں ملاحظہ فرمائیں۔

سطح سمندر سے نیچے سرزمین کی سیر

عوام اور اُن کے قائدین جہنم میں کیا مکالمہ کر رہے ہوں گے اور قرآن حکیم اس کی منظر کشی کیسے کرتا ہے جس میں ہمارا اپنا چہرہ دیکھائی دیتا ہے۔ اس ہفتے کالم تو اس موضوع پر لکھنا تھا لیکن دی نیدرلینڈز جسے عرف عام میں ہالینڈ بھی کہا جاتا ہے حالانکہ ہالینڈ صرف ایک صوبے کا نام ہے اور پچاس فی صد سے زائد رقبہ سطح سمندر سے نیچے سرزمین کی سیاحت کا دوبارہ موقع ملا تو قارئین کے لئے اس حوال کو لکھنا مناسب سمجھا۔ نیدرلینڈز کا معنی ہی نشیبی دیس کے ہیں۔ بارہویں آل یورپ عظیمی مقابل حسن نعت میں اعزازی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی دعوت ملی اور ساتھ ہی میری کتابوں، افکار تازہ اور بچوں کے لئے دلچسپ اور انوکھی کہانیوں کی تقریب پذیرائی بھی تھی ۔ میرے لئے یہ باعث خوشی تھا کہ آسٹریا، سویڈن اور ڈنمارک کے بعد کسی چوتھی ملک میں میری کتابوں کے حوالے سے تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ ایمسٹرڈیم کے ہوائی اڈہ پر میرے دیرینہ دوست اور ممتاز صحافی راجہ فاروق حیدر، حاجی جاوید عظیمی، چوہدری خالد جاوید چوہدری اقبال، عامر نقوی، چوہدری ذاکر اور سید عامر نے پر تپاک استقبال کیا۔ مقابل، حسن نعت کے منتظم حاجی جاوید عظیمی کے ہاں دی ہیگ شہر میں عشائیہ میں ان دوستوں کے ساتھ روزنامہ دھرتی کے چیف ایڈیٹر جناب اے وسیم، ساجد مغل اور صاحب دیوان

شاعر احسان سہگل میں شامل ہو گئے۔ کھانے کے بعد علمی، ادبی، دینی اور دیگر موضوعات ایک طویل نشست کے بعد ساجد مغل اور اے وسیم کے ساتھ روشنیوں میں شہر کا منظر بہت بھلا لگا۔ عالمی عدالت انصاف کی پر شکوہ عمارت کو بھی دیکھنے کا تفاق ہوا جس میں کئی پاکستانی اعلیٰ عہدوں پر فائیز رہے ہیں۔ صبح ہوٹل سے ناشتہ کرنے بعد راجہ فاروق حیدر کے ساتھ دی ہیگ شہر کی سیاحت کے لیئے نکلے۔ اس شہر میں ملک کی سپریم کورٹ، پارلیمنٹ، عالمی عدالت انصاف، انٹر نیشنل کریمنل کورٹ اور دوسرے کئی قومی اور عالمی امور کے اداروں کے دفاتر موجود ہیں۔ پینوراما میوزیم دنیا میں اپنی نوعیت کا منفرد عجائب گھر ہے۔ پریس کارڈ دیکھانے پر ہمیں مفت داخلہ کی سہولت بھی مل گئی۔ راجہ فاروق بتا رہے تھے کہ اس میوزیم کے دورہ کے بغیر دی ہیگ کی سیاحت ادھوری ہے۔ میوزیم کے درمیان ایک بڑا چبوترہ بنایا گیا ہے جس پر سیڑھیاں چڑھ کر جائیں تو چاروں طرف حد نگاہ تک انیسویں صدی کا دور ہالینڈ سامنے آجاتا ہے۔ یہ منظر کشی کس طرح سے کی گئی ہے اسے لفظوں میں لکھنا ممکن نہیں کیونکہ یہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دن بھر کی تھکاوٹ راجہ فاروق حیدر کے عشائیہ نے دور کردی جس میں کشمیر سینٹر ہالینڈ کے ڈائریکٹر راجہ زیب خان، محفل علی کے منتظم کاظم حسین، اے وسیم، ساجد مغل کے علاوہ ڈنمارک سے آئے ہوئے میرے دوست اور ہم جماعت سید اعجاز حیدر بخاری شریک تھے۔ عشائیہ کے بعد اے وسیم، ساجد مغل اور سید اعجاز حیدر بخاری کے ساتھ دی ہیگ ایک چکر لگایا۔

پاکستانیوں نے اس دیس میں آ کر جس طرح محنت کرکے اپنا مقام بنایا اور ترقی اور خوشحالی کی منازل طے کیں وہ ہمیں ڈاکٹر اجمل ملک کو ملکر اور اُن کا کاروبار دیکھ کر ہوا۔ اُن کے والد اور خاندان کے لوگ تین دھائیوں سے زائد عرصہ قبل یہاں آئے اور کاروبار کے ساتھ سماجی اور دینی سرگرمیوں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اجمل نے اسی ملک سے میڈیکل سائنس میں تعلیم حاصل کرکے کچھ عرصہ ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اپنے خاندان کے کاروبار کا سنبھالا۔ اُن کے والد ملک صدیق یہاں کی ایک مخیّر اور غیر متنازعہ شخصیت تھے۔ ڈاکٹر اجمل کے تایازاد ملک جمیل ضلع گجرات سے رکن قومی اسمبلی تھے جبکہ اُن کے چچا ملک حنیف اعوان اس وقت رکن پنجاب اسمبلی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں روٹرڈیم کی سیر کرائی جو کہ یورپ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ یہ دریا Nieuwe Maas کے کنارے آباد ہے جسے دوسری عالمی جنگ میں تباہ کردیا گیا تھا۔ اب یہاں بلند و بالا عمارتیں اور دنیا بھر کے کاروبار کا مرکز ہے۔ سپیڈو کشتی سے دریا کی سیاحت جس میں شہر اور بندرگار کو دیکھنے کا موقع ملا، ایک یادگار سفر تھا۔ ڈاکٹر اجمل کے صاحبزادے موحد جو بہت ہونہار ہے اور جماعت ہفتم کے طالب علم ہیں، وہ بھی دوران سفر ہمارے ساتھ تھے۔ روٹرڈیم میں دو بڑی گنبد اور میناروں والی مساجد کے علاوہ اور مساجد بھی ہیں۔ روٹرڈیم اور دی ہیگ کے درمیان ڈیلف شہر ہے جس میں قائم یونیورسٹی عالمی شہرت رکھتی ہے۔

اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ روٹرڈیم سے واپس دی ہیگ پہنچے جہاں مقابلہ حسن نعت اور افکار تازہ کی تقریب پذیرائی منعقد ہو رہی تھی۔
جامع مسجد نورالاسلام دی ہیگ میں ہونے والے بارھویں عظیمی مقابلہ حسن نعت میں سات ممالک کے نعت خواں حضرات نے حصہ لیا۔ تقریب میں خواتین اور بچوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ سید اعجاز حیدر بخاری کونسلر بلدیہ برانڈبی، ڈنمارک کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہوا، ان کے ساتھ مولانا عبداللطیف چشتی اور سید علی جیلانی نے منصفین کے فرائض ادا کئے۔ سید علی جیلانی نے بہت خوبصورتی سے نظامت کے فرائض ادا کئے۔ پروگرام کی صدارت حاجی جاوید عظیمی کی تھے جبکہ مہمان خصوصی سفیر پاکستان معظم احمد خان تھے۔ معروف صحافی راجہ فاروق نے اس موقع پر افکار تازہ کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے افکار تازہ کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ یہ ایک منفرد کتاب جس میں بہت سے اہم موضوعات پر مضامین شامل ہیں اور اس کا مطالعہ ہر ایک کے لئے بہت مفید ہوگا۔ اس میں عورتوں، اقلیتیوں، نوجوانوں، جہاد، فکر اقبال، میاں محمد بخش، تحریک پاکستان، یورپ مقیم تارکین وطن کے مسائل، قرآنی تعلیمات، سائنسی اور سماجی موضوعات پر بہت اہم اور معلوماتی تحریریں موجود ہیں۔ پاکستان کے سفیر جناب معظم احمد خان نے اس حوالے سے خطاب کرتے

ہوئے کہا کہ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ یورپ میں عارف کسانہ جیسے لکھنے والے موجود ہیں جن کی تحریروں سے بہت سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ وہ خود یورپ میں رہنے کی وجہ سے یہاں کے مسائل سے آگاہ ہیں اور اس بارے میں لکھ رہے ہیں۔ مجھے ان کی کتاب افکار تازہ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں اسے بہت مفید پایا ہے۔ اس میں موجودہ وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآنی تعلیمات اور فکر اقبال سے رہنمائی لی گئی ہے۔ تقریب کے شرکاء نے افکار تازہ میں گہری دلچسپی لی اور اسے اپنے مطالعہ کے لئے حاصل کیا۔ یہ مقابلہ حسن نعت کی بارھویں تقریب تھی اگرچہ انتظامی نقائص کو دور کر لیا جاتا تو تقریب اور بھی بہتر انداز میں منعقد ہو سکتی تھی۔ تقریب کے صدر کی جانب سے بار بار خود اعلانات کرنا اور نظامت سنبھالنا، رابطہ کا فقدان اور کچھ دوسری خامیوں امید ہے آئیندہ دور کی جا سکیں گی۔

تقریب سے اگلے روز رات کو واپسی تھی اس لئے راجہ فاروق نے تجویز پیش کی جانے سے قبل ہالینڈ کے مشہور کیوکنہوف پارک جو کہ ٹیولپ پارک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کی سیر کی جائے۔ یہ پارک سال میں صرف آٹھ ہفتے مارچ سے وسط مئی تک کھلا رہتا ہے ہے اور اس روز یعنی ١٦ مئی کو اس سال آخری دن کھلا تھا۔ خوشگوار موسم میں راجہ فاروق اور راجہ ناصر کے ساتھ وہاں پہنچے اور دنیا کی اس معروف پھلواری کو دیکھنے کا موقع ملا جو ٧٩ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہے

اور جہاں ہر سال دس لاکھ سے زائد لوگ آتے ہیں۔ یہ وسیع پارک ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا اور یہاں ستر لاکھ پودے اگائے جاتے ہیں۔ اس میں ہر قسم کے ٹیولپ ہیں اور فضا میں ایک مہک ہے۔ ویانا کے دورہ کے موقع پر چوہدری فاروق نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ ٹیولپ ترکی سے درآمد کیا گیا جو ویانا میں مزید نشوونما پا کر کیوکنہوف پارک کی زینت بنا۔ دورہ ہالینڈ کی اچھی یادیں لے کر ایمسٹرڈیم ہوائی اڈہ پر راجہ فاروق اقبر راجہ ناصر نے الوداع کہا اور قارئین سے بھی اجازت کیونکہ ایک کالم سب تفصیلات لکھنا محال ہے۔

لیڈر اور عوام دونوں جہنم میں !

واہ کیسی بات کہی کہ اس میں تمہارا ذکر ہے۔ یہ خوبی صرف اسی میں ہو سکتی ہے جسے خالق کائنات نے انسانیت کے لئے اپنی آخری کتاب قرار دیا ہو اور سورہ الانبیاء کی دسویں آیت میں صاف کہہ دیا ہے کہ اس میں تمہارے بارے میں بات کی گئی ہے اور تمہارا ہی ذکر ہے لیکن ہم ہیں کہ یہ کہتے ہیں نہیں یہ اقوام گذشتہ کے بارے میں کہا گیا ہے اور وہ جو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں ان ذہنیت کا سورہ النحل کی آیت چوبیں میں بیان کیا ہے کہ اور جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اگلی قوموں کے واقعات ہیں۔ ان کے خیال میں یہ محض قصے کہانیاں ہیں، اُن میں اور کھا ہی کیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو وحی الٰہی کو سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں اور پھر مہلت کا وقت گذر جاتا ہے جسے سورہ الانبیاء کے ابتداء میں یوں بیان کیا ہے کہ لوگوں کے لئے ان کے حساب کا وقت قریب آ پہنچا مگر وہ غفلت میں پڑے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے جب بھی کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو وہ اسے یوں بے پرواہی سے سنتے ہیں گویا وہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نیتجہ یہاں اور آخرت دونوں میں خسارے کا ہے۔

حیات آخرت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے قرآن حکیم جہنم میں عوام اور اُن کے قائدین درمیان ہونے والی گفتگو اور بحث کو مختلف مقامات

پریوں بیان کیا ہے۔ سورہ الصفات کی آیت ۲۷ تا ۳۴ میں ہے کہ اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم سوال کریں گے۔ وہ کہیں گے بے شک تم ہی تو ہمارے پاس اپنے حق پر ہونے کی قسمیں کھاتے ہوئے آیا کرتے تھے۔ انہیں گمراہ کرنے والے پیشوا کہیں گے کہ تم خود ہی ایمان لانے والے نہ تھے اور ہمارا تم پر کچھ زور اور دباؤ نہ تھا بلکہ تم خود سرکش لوگ تھے۔ پس ہم پر ہمارے رب کا فرمان ثابت ہوگیا۔اب ہم عذاب کا ذائقہ چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تمہیں گمراہ کر دیا بے شک ہم خود گمراہ تھے۔ پس اس دن عذاب میں وہ سب باہم شریک ہوں گے۔ بے شک ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ سورہ سبا کی آیت ۳۲ اور ۳۳ میں اُن کے باہمی مکالمہ کو یوں بیان کیا ہے کہ لیڈر عوام سے کہیں گے کہ تم خواہ مخواہ کیوں باتیں بنا رہے ہو۔کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آچکی تھی، بلکہ تم خود ہی مُجرم تھے۔ پھر عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تمہارے رات دن کے مکر، چال بازیوں اور فریب کاریوں ہی نے ہمیں روکا تھا جب تم اس قسم کے قوانین بناتے تھے جن سے ہم قوانین خداوندی کے انکار کے مرتکب ہوجاتے تھے اور ہم اللہ کے احکامات میں دوسروں کے احکامات کو شریک کرتے تھے۔ لیڈر اور عوام دونوں عذاب کو آتے ہوئے دیکھ کر اپنی ندامت چھپائیں گے اور ہم انکار کرنے والوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے، اور انہیں اُن کے کیئے کا ہی بدلہ دیا جائے گا۔

قرآن حکیم سورہ ابراھیم کی آیت ۲۸ اور ۲۹ میں دعوت غور وفکر دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے دیکھو کہ جن کو خدا نے زندگی کی خوشگواریاں عطا کی تھیں لیکن انہوں نے اس کی قدر نہ کی اور اپنی قوم کو تباہی اور بربادی کی جانب جھونک دیا جس کا نتیجہ دوزخ ہے جو بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ لیڈروں کے ستائے ہوئے عوام کی دہائی کو سورہ الاحزاب کی آیت ۶۷ اور ۶۸ میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ اپنے رب سے کہیں گے کہ اے ہمارے رب ! بیشک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہا مانا تھا تو انہوں نے ہمیں سیدھی راہ سے بہکا دیا۔ اے ہمارے رب ! انہیں دوگنا عذاب دے اور اُن پر بہت بڑی لعنت کر۔ اسی صورت حال کو سورہ ص کی آیت ۶۱ سے ۶۴ میں بھی بیان کیا گیا ہے جب عوام عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب چونکہ یہ ہمارے مصائب اور پریشانیوں کے ذمہ دار ہیں اس لئے انہیں دوگنا عذاب دے۔ سورہ فصلت کی آیت ۲۹ کے مطابق عوام بارگاہ الٰہی میں عرض کریں گے کہ اے رب ہمیں وہ رہنماء دیکھا دے جنھوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا تاکہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے کچل دیں۔ عوام اور لیڈروں کے آپس میں جھگڑنے کی ایک اور تصویر سورہ المومن کی آیت ۴۷ اور ۴۸ میں بڑے سبق آموز انداز پیش کی ہے جس کے مطابق اُس جہنم میں لوگ ایک دوسرے ساتھ جھگڑیں گے ۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں اپنے پیچھے لگایا ہوا تھا اب ہم سے یہ عذاب دور کرو جس پر لیڈر کہیں گے کہ ہم سب اس عذاب میں مبتلا ہیں جو اہمارے اعمال کا نتیجہ ہے اور اس میں

ردوبدل ممکن نہیں کیونکہ کہ خدا کا فیصلہ ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ اور ۱۶۷ میں حسرت ناک انجام کی ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ بات عوام کو اُس وقت سمجھ آئے گی جب اُن کے رہنماء اور پیشوا اں کا ساتھ چھوڑ جائیں گے اور وہ سوچیں گے کہ اے کاش وقت واپس لوٹ جائے اور ہم بھی اپنے ان لیڈروں اور پیشوأوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ لیڈر چونکہ عوام کو غلط راستے پر لے جانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اسی لئے سورہ النحل کی آیت ۲۵ میں واضع طور پر بتا دیا کہ لیڈروں اور پیشوأوں کا ان عوام کے کچھ اعمال بھی بوجھ اٹھانا پڑے گا جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا۔

قرآن حکیم بار بار ہمیں غور و فکر کی دعوت اس لئے دیتا ہے کہ ہم سوچیں اور اگر ہم مذکورہ بالا آیات پر تدبر کریں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ تو ہمارے بارے میں ہی بات کی گئی ہیں۔ چشم تصور سے دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے عوام اللہ تعالیٰ سے التجا کر رہے ہوں کہاے ہمارے رب ہمارے ان رہنماؤں کو سخت اور دہرا عذاب سے جنھوں ہمیں غلط راستے پر چلایا۔ ان رہنماؤں میں وہ شامل ہیں جو کسی نہ طرح قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قوم کو لسانی، علاقائی، مذہبی، سیاسی اور رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم کیا اور جنہیں اختیارات و اقتدار حاصل رہا۔ وہ بھی جو اپنا ضمیر فرخت کرکے غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور حق کی آواز بلند نہ کی۔ اسی تصویر کے دوسرا رخ

یہ بھی ہوگا کہ قائدین اور پیشوا عوام سے کہیں گے کہ تم خود ذمہ دار ہو اور تم نے خود ہمیں اپنے اوپر مسلط کیا تھا۔ اگر ہم اتنے ہی بُرے تھے تو تم نے بغاوت کیوں نہ کی۔ ووٹ ایک طرح کی گواہی ہوتا ہے لیکن جب ہم غلط تھے تو ہمیں کیوں اپنا ووٹ دیتے تھے۔ اپنی ذاتی زندگی میں تم لوگ اپنا معمولی سا نقصان بھی براداشت نہیں کرتے تھے لیکن ملک و قوم کے معاملات کیوں غلط لوگوں کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہم نے تمہیں فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا تم قرآن کی آواز کیوں نہ سنتے تھے کہ فرقہ واریت شرک ہے۔ یہ تم ہی تھے جو ہمارے جلسوں میں بھنگڑے ڈالتے اور نعرے لگاتے تھے، آوے ای آوے،، سب سے بہتر، کون آیا اور کون گیا اور معلوم نہیں ہمارے لئے کیا نعرے گلے پھاڑ کر لگاتے تھے۔ لہٰذا ہم پہ لزام نہ دو تم نے معمولی مفاد کی خاطر حیات آخرت کا سواد کیا اس لئے اب آؤ دونوں اس عذاب کا مزا چکھیں۔ اس بحث کے بعد فرشتے ہانکتے ہوئے سب کو اس جہنم کی طرف لے جائیں گے جو بہت بُرا ٹھکانہ اور اُس روز کوئی اُن کے کام نہیں آئے گا۔ کاش ہم سوچیں۔۔

دیار غیر نہیں بلکہ وطن ثانی

یورپ ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے رہنے والوں کے لئے یہ دیار غیر نہیں البتہ وہ لوگ جو عارضی طور پر بیرون ملک رہ رہے ہوں اُن کے لئے وہ ملک دیار غیر ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے کسی دوسرے ملک میں قیام کے بعد وہاں کی شہریت حاصل کر لی، وہاں اپنا گھر بنا لیا، وہاں کی زبان سیکھ لی اور اُن کے بچے اس معاشرہ میں پروان چڑھ رہے ہیں وہ ملک اُن کے لئے دیار غیر نہیں بلکہ وطن ثانی ہے۔ اُن کی یہ ہجرت مستقل ہے اور اب اُن کا اور اُن کی آنے والے نسلوں کا مستقبل اسی ملک سے وابستہ ہے جہاں وہ مستقل شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ اُن کا وطن اب وہی ہے اور اُن کا جینا مرنا اسی سے وابستہ ہے۔ انسانی تاریخ کی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہجرت میں واپسی کا راستہ نہیں ہوتا۔ خود رسول اکرم ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے اور ۵۳ سال وہاں رہنے کے بعد جب مدینہ ہجرت کر گئے تو پھر فتح مکہ کے بعد بھی واپس مدینہ تشریف لے گئے اور مکہ جو کہ اُن کا آبائی شہر تھا قیام نہ کیا۔ نہ صرف رسول پاکؐ بلکہ تمام صحابہؓ بھی واپس مدینہ چلے گئے اور انہوں نے مکہ میں دوبارہ رہائش اختیار نہ کی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے تو پھر وہی اُس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے اور وہ اس کے لئے دیار غیر نہیں ہوتا۔ پاکستان ہمارا وطن تھا

اور اُس سے محبت کبھی دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتی۔ پاکستانی دنیا کے کسی خطہ میں بھی رہ رہے ہوں وہ ارض پاک کی مٹی کی خوشبو کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اُن کے دل پاک وطن میں اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور وہ دل وجاں سے پاکستان کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے دعا گو ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان اُن کا ماضی تھا اور جن ممالک میں اب وہ مستقل شہری کی حیثیت سے رہ رہے وہ اُن کا حال اور مستقبل ہے اور اس اعتبار سے سویڈن ہمارے لئے دیار غیر نہیں بلکہ وطن ثانی ہے۔ ایک مسلمان جغرافیائی طور پر مقید نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است۔ ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہر ملک رب کائنات کا ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو مغربی ممالک میں اپنے نظریات کی وجہ سے ذہنی کشمکش کا شکار ہیں اور اپنے آپ کو یہاں مس فٹ سمجھتے ہیں۔ شہریت حاصل کرنے کے باوجود جہاں رہ رہے ہیں اسے پنا ملک نہیں سمجھتے انہیں چاہیے کہ یک طرفہ ٹکٹ لے کر اپنے آبائی وطن واپس چلے جائیں۔ جب میزبان ملک کی شہریت اختیار کرلی ہے تو اُسے اپنا ملک سمجھتے ہوئے حب الوطنی کا مظاہرہ کریں اور اس کی تعمیر وترقی میں ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے کردار ادا کریں۔ یورپ میں ہمارے مذہبی اجتماعات میں جہاں پاکستان کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں وہاں میزبان ملک جہاں ہم رہ رہے ہیں اُسے بھی دعا میں یاد رکھنا چاہیے۔

چھ جون کو سویڈن کا قومی دن منایا جاتا ہے۔ یہ دن جدید سویڈن کے معمار اول سمجھے جانے والے بادشاہ گستاف واسا کی ۱۵۲۳ء میں ہونے والی تخت نشینی کی یاد میں منایا جاتا ہے اور اس دن کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا جب سویڈن میں اولمپک کھیلیں منعقد ہوئیں۔ شروع میں یہ قومی دن نہیں تھا بلکہ اسے یوم پرچم کے نام سے منایا جاتا تھا اور اس دن سرکاری چھٹی بھی نہیں تھی۔ ۱۹۸۳ء سے سویڈش پارلیمنٹ نے اسے قومی دن قرار دیا لیکن سرکاری چھٹی ۲۰۰۵ء سے شروع ہوئی۔ چھ جون کو چھٹی دینے کے لئے مئی میں white monday ہونے والی کی چھٹی ختم کی گئی۔ اب یہ دن سرکاری اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ نیلے اور پیلے رنگ کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ سٹاک ہوم میں دنیا کے سب سے بڑے کھلی فضا والے عجائب گھر میں بادشاہ سلامت تقریب کے مہمان خصوصی ہوتے ہیں جہاں تمام ممالک کے سفیر بھی موجود ہوتے ہیں۔ فضاؤں میں سویڈن کے قومی ترانے کی گونج ہوتی ہے۔ یہ ترانہ رچرڈ ڈیبیک نے ۱۸۴۴ء میں لکھا اور ۱۸۹۰ء میں اسے قومی ترانے کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ سویڈن کا قومی اس ملک کے قابل فخر ماضی اور روشن مستقبل کی عکاسی کرتے ہوئے جذبہ حب الوطنی ابھارتا ہے۔ اس میں وطن کی توتعریف اور محبت کے لئے وہی جذبات ہیں جو پاکستان کے ملی نغموں سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد اور اے وطن پاک وطن میں ہیں۔ اس ترانے کا اردو ترجمہ میرے مطابق کچھ یوں ہے۔ سویڈن کی سرزمین کو مخاطب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ

تو قدیم ہے اور بے شک تو آزاد ہے۔ تیرے شمال کا پر وقار پہاڑی سلسلہ۔ تیری پر سکون فضاؤں کو سلام

تیری سوہنی دھرتی، روئے زمین کا حسین ترین خطہ، تیرا سورج، تیرا آسمان، تیری سر سبز زمین۔ تو زمانہ قدیم کے عظیم دور کا مظہر

دنیا بھر میں تیرے نام کے توقیر کی دھوم۔ میں جانتا ہوں تو ایسے ہی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مجھے جینا بھی یہیں ہے اور مرنا بھی اسی شمالی خطہ ارضی میں ہے

میں ہمیشہ تجھے سنواروں گا اے میرے پیارے وطن۔ قسم ہے موت تک تیرا وفادار رہوں گا تیری ارض وطن کی حفاظت کے لئے جسم و جاں قربان

تیرا پرچم ہمیشہ سربلند رہے، معزز رہے۔ خدا کی قسم اس گھر کے لیئے لڑوں گا اور سب کچھ کروں گا۔ سویڈن، میرے محبوب وطن تیری مٹی کے لئے.

تجھے پوری دنیا کے عوض بھی نہ دوں، کبھی نہ دوں۔ اے میرے محبوب وطن میرا جینا بھی تیرے لئے اور مرنا بھیتیرے لئے ہے۔ اسی شمالی سرزمین کے لئے۔

بیرون ملک مقیم پاکستانی بہت حساس اور درد دل رکھتے ہیں اور اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ پاکستان کے عوام کے حالات بدلیں۔ بہت سے لوگ تعلیمی، سماجی فلاح و بہبود اور ایسی ہی دوسری سرگرمیوں کے ذریعہ دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے کوشاں ہیں۔ انہی میں سے ایک ناروے میں مقیم جناب شاہد جمیل ہیں جنھوں نے

سکون کے نام سے ایک فلاحی تنظیم قائم کی ہے جو پاکستان میں چلنے پھرنے سے معذور افراد کو مفت وہیل چیئر wheelchair مہیا کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مستحق بچوں کے لئے تعلیمی سہولتوں بھی فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بلا شبہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ صرف پانچ ہزار روپے میں ایک شخص کو وہیل چیئر مل سکتی ہے جس سے اُس کے چلنے پھرنے کی معذوری دور ہو جائے گی۔ جب آپ ایک ایسے شخص کو وہیل چیئر دیں گے اور وہ اسے استعمال کرے گا تو اُس کے دل سے جو دعا نکلے گی اُس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور یہ کام صرف چانچ ہزار روپے میں ہو سکتا ہے۔ بیرون ملک مقیم احباب صرف چالیس یورو کی ایک معمولی رقم سے ایک معذور شخص کو چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔اس تنظیم کے رکن بننا چاہیں تو صرف بیس یورو سالانہ سے آپ یہ نیک کام کر سکتے ہیں۔آپ دنیا میں کہیں بھی رہتے ہوں تنظیم کی ویب سائیٹ پر جا کر رکن بھی بن سکتے ہیں اور اپنے عطیات بھی آن لائین دے سکتے ہیں۔ رمضان المبارک کے اس بابرکت مہینہ میں نیکی کا یہ کام ضرور کریں بلکہ گھر کے ہر فرد کی جانب سے ایک وہیل چیئر ضرور تحفہ کریں۔ میں اور میرے گھر کے تمام افراد اس فلاحی تنظیم کا رکن بن گئے ہیں اور آپ سے بھی گذارش ہے کہ سکون دینے والی اس تنظیم کا رکن ضرور بنیں۔ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے یقینا خوش ہوں گے۔

ویب سائیٹ کا پتہ ہے http://www.scoon.no اور ای میل info@scoon.no فون 0047-92036102 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسروں کو سکون دیں تاکہ آپ کو بھی سکون ملے۔

خوف اور موت

ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ خوف انسانی شخصیت کو مسخ کرتا ہے اور اس سے جسم انسانی میں بہت سی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں لیکن ہمارے ہاں جب بھی لوگوں کو مذہب کی طرف مائل کرنا مقصود ہو تو انہیں خدا سے بہت ڈرایا جاتا ہے۔ مذہبی حلقوں کی جانب سے لوگوں کو اتنا زیادہ خدا سے ڈرایا جاتا ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی کو کہنا پڑا کہ

واعظو، آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ڈر خدا سے نہیں بلکہ اس کے حکم کی نافرمانی سے پیدا ہونے والے نتائج سے ہو، تاکہ حکم عدولی سے بچا جائے اور وہی کچھ کیا جائے جو رب نے کہا ہے۔ اپنے رب سے محبت کا یہ عالم ہو کہ اس کی رضا کے کو اپنی رضا بنا لیا جائے۔ قرآن حکیم جو امراض نفس کے یا دور جدید کی اصطلاح میں نفسیاتی امراض کو انسانی شخصیت سے دور کرتا ہے وہ اہل ایمان کے تمام خوف اور دلوں میں چھپی پریشانیاں دور کردیتا ہے۔۔ خوف اور حزن سے وہ ہی مبرا ہو سکتا ہے جس پر کسی کا دباؤ نہ ہو اور وہ آزاد منش ہو۔ قرآن حکیم اس پر شاہد ہے کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف یا حزن نہیں ہوتا۔ حزن اُن انجانے خدشات کا نام ہے جن سے دل پریشان ہو کہ کہیں یہ نہ ہو جائے۔ بندہ مومن ایسی پریشانیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

حکم ہوتا ہے کہ سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے (سورہ یونس ۶۲)۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

وہ فرماتے ہیں کہ غلامی سے اپنی آزاد فطرت کو رسوا نہ کر۔ جب تک معبود گھڑتا رہے گا، برہمنوں سے بڑھ کر کفر کرے گا۔ حکیم الامت مزید فرماتے ہیں کہ

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست پیش فرعونی سرش افکندہ نیست

مطلب یہ کہ رب کا بندہ ہے یعنی مسلماں کبھی بھی غیر کا بندہ نہیں نہیں ہو سکتا اور وہ کسی فرعون کے آگے وہ شرمندہ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کی تابندہ یادیں کے عنوان سے ڈاکٹر ندیم شفیق کی لاجواب کتاب ہے اس میں وہ علامہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ''یاد رکھو غم اور خوف یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ خودی کو تباہ کر دیتی ہیں اور ایک مسلمان جب تک ان دو عیبوں سے پاک نہ ہو جائے حقیقی معنی میں مسلمان نہیں ہو سکتا اور ان کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ انسان، توحید الٰہی کو اپنے دل میں پختہ کر لے بایں طور کہ شک دل میں راہ نہ پا سکے۔ یعنی اسے یقین ہو جائے کہ جب تک خدا نہ چاہے، کوئی طاقت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ پھر اس کے دل میں نہ حزن راہ پا سکتا ہے۔ اگر غیر اللہ کا خوف کسی درجے میں بھی دل میں موجود ہے تو خودی کبھی ہرگز

نہیں ابھر سکتی"۔ مزید فرمایا کہ ہم جملہ مظاہر فطرت سے ڈرتے ہیں۔ زلزلے سے، آگ سے، امراض سے، سانپ سے، تاریکی سے، شیر سے وغیرہ۔ محض اس لئے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ موت ایک مرحلہ ہے جس کے بعد ہی روحانی ترقی حاصل ہو گی۔ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں بلکہ وہ دروازہ ہے جس میں سے ہو کر ہم نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور موت بھی زندگی ہی کی ایک شان ہے۔ اگر ہم یہ یقین کرلیں کہ کائنات میں یا میں ہوں یا خدا ہے، تیسری کوئی ہستی نہیں ہے تو پھر خوف کیسا؟ ہم مومن تب ہی بن سکتے ہیں جب خدا کے سوا کسی کا وجود ہماری نگاہ میں نہ سمائے۔

ایک مومن کے لیے موت ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہے اور وہ خندہ پیشانی سے موت کا استقبال کرتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۹۴ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ بندہ مومن تو موت کا آرزومند ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ مرد مومن موت کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتا ہے۔

نشان مرد مومن باتو گویم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اپنے آخری لمحات میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں اپنے سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس جارہا ہوں ۔ موت تو آپؐ کی سنت ہے جسے کیا خوبصورت انداز میں احسان دانش نے یوں کہا کہ دانش میں خوف مرگ سے بالکل ہوں بے نیاز میں جانتا ہوں

کہ موت ہے سنت رسول کی

علامہ اقبال موت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی، صبح دوام زندگی

موت ، تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جو اپنی خودی کی نشو ونما کرتا ہے اور اُسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے تو اُسے موت بھی نہیں مار سکتی۔ اس نقطہ کو حکیم الامت نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ

ہو اگر خود نگر و خود گر و خودگیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

پنجاب کے عظیم صوفی شاعر بھی کہہ گئے کہ بُلھے شاہ اسیں مرنا نا ہیں گور پیا کوئی ہور

یہ محض ایک کتاب نہیں!

یہ واقعی حیرت انگیز حقیقت ہے اور دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ ایک کتاب پروف ریڈنگ کے بغیر منظر عام پر آئے اور اُس میں املا اور گرامر کی ایک بھی غلطی نہ ہو۔ مزید یہ کہ وہ کتاب ۲۳ سال کے طویل عرصہ میں مکمل ہو، صاحب کتاب لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں اور اس کی کتابت بھی بہت سے لوگوں نے کی ہو۔ دور جدید کی لکھنے پڑھنے کی سہولتیں، کمپوزنگ کے ذرائع، کمپیوٹر، لغات اور دوسری آسانیاں بھی میسر نہ ہوں اور چودہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی کوئی ایک غلطی یا سہو بھی سامنے نہ آیا ہو اور نہ اس کی مثل بلکہ چھوٹا سا ٹکڑا بھی کوئی نہ بنا سکا ہو تو ماننا پڑے گا کہ یہ ایں کتاب نیست چیزے دیگر است یعنی یہ محض ایک کتاب نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اس جدید دور میں لکھنے پڑھنے کے بہترین ذرائع ہونے کے باوجود کوئی کتاب پروف ریڈنگ کے بغیر چھپ ہی نہیں سکتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف کی تمام تر احتیاط کے بعد اور پروف ریڈنگ کرنے والوں کی محنت اور یہاں تک کہ کمپیوٹر کی مدد کے بعد بھی بعض اوقات کتاب میں اغلاط موجود ہوتے ہیں۔ صرف قرآن حکیم واحد مثال ہے جو اس سے مبرا ہے اور منجانب خدا ہونے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے۔ قلب نبوی پر جو قرآن اترتا تھا وہ محفوظ ہوتا جاتا تھا اور کاتبین وحی لکھتے جاتے تھے۔ وہی حتمی اور آخری ورژن تھا اور

کسی کانٹ چھانٹ کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کتاب کا ادبی حسن بھی اپنی مثال آپ ہے اور اس میں بیان کیے گئے حقائق کے سامنے دور جدید کی سائنسی تحقیق سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔ نہ اس میں بیان کی گئی پیشین گوئی میں سے کوئی غلط ثابت ہوئی ہے اور نہ اس میں بیان ہوئے حقائق کو جھٹلا سکا ہے۔ یہ عظیم کتاب قرآن حکیم ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالق کائنات نے لی ہے۔ اس کا ہر حکم ہر دور کے لئے ہے اور اس کا کوئی حکم معطل یا منسوخ نہیں ہے۔ خدا نے جو کہنا تھا اس کتاب عظیم میں کہہ دیا اور وحی صرف قرآن حکیم میں ہے۔ یہ بندے اور رب کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے اور انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتی ہے۔ مختلف موضوعات اور مضامین بیان کرنے کے باوجود اس میں ربط بھی ہے انداز بیان بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وہ معجزہ ہے کہ عرب کے اُس دور کے عظیم شاعر لبید کو بھی کہنا پڑا کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔ یہ خود نور ہے اس لیے اسے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی تفسیر خود کرتی ہے۔ اس کی سورتیں اور آیات ایک مربوط حسابی نظام کے تحت ہیں۔ اس میں دیئے احکامات بہت واضح اور سمجھنے میں آسان ہیں۔ صاحب قرآن کی پوری زندگی اس کی عملی تفسیر تھے۔ ارشاد ربانی ہے کہ اسوہ حسنہ تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ قلب جتنا عشق مصطفےٰ ﷺ کی شمع سے فروزاں ہوگا اسی قدر قرآن سے گہرا تعلق ہوگا اور زندگی اس کی پیروی میں ہوگی۔

سورہ حم سجدہ کی آخری دو آیات میں کیا زبردست دعویٰ کیا اور وہ بھی اُس وقت جب مکہ میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔اس وقت کے مخاطبین نے اسے اہمیت نہ دی لیکن تاریخ نے ثابت کیا ور دور حاضر بھی اس کی سچائی پر گواہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم عنقریب اُن کو نفس انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے کہ اُن پر ثابت ہو جائے کہ قرآن ایک سچی کتاب ہے۔ یہ لوگ قرآن کی صداقت سے اِس وقت انکار کرتے ہیں لیکن ہم ایسے حالات پیدا کرتے جائیں گے کہ جب یہ نظامِ عرب سے آگے بڑھ کر اور علاقوں میں پھیل جائے گا اور ہمارے قانون کی صداقت کی محسوس نشانیاں نظر آجائیں گی۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ان کے سامنے نکھر کر آجائے گی کہ قرآن نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہ حق پر مبنی تھا۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا اور دنیا پر نئے نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے، حیاتیات، طبعیات، علم طبقات الارض، نفسیات اور دوسرے علوم سے حقائق واضح ہوتے جائیں گے اور یوں دنیا رفتہ رفتہ دیکھ لے گی کہ قرآن کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ کتاب اُس خدا کی طرف ہے جو کائنات کی ہر شے پر نگران ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ خدا کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کے متعلق شک کرتے ہیں اور اُس کے حضور پیش ہونے پر یقین نہیں رکھتے ۔ اُس خدا کا علم اور قانون کائنات کی ہر شے کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ان واضح حقائق کے باوجود جو اس کا انکار کرتے ہیں ان کے بارے میں اسی سورہ کی آیات ۴۱ اور ۴۲ میں ہے کہ و لوگ اس قرآن سے انکار کریں، جب

وہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے اس انکار سے قرآن کے قوانین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ایک ایسا ضابطہ حیات ہے کہ آخرالامر اسی کو غالب آنا۔ باطل کی تخریبی قوتیں اس سے براہ راست ٹکراؤ پیدا کریں یا دَرپردہ سازشیں کریں اِس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں کیونکہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو بہترین تدابیر کا مالک ہے۔

قرآن کا رمضان کے ساتھ خصوصی تعلق ہے کیونکہ یہ اس کے نزول کا مہینہ ہے۔ روزہ کے لئے عربی میں صوم کا لفظ آیا ہے جس کا معنی رک جانا، ضبط کرنا اور غلط رستوں پر نہ چلنا ہے۔ روزے کے بہت سے طبّی اور دوسرے فائدے ہو سکتے ہیں لیکن قرآن حکیم نے سورہ بقرہ میں تین مقاصد بیان کیے ہیں۔اوّل تقویٰ کا حصول یعنی اللہ کے احکامات کی پیروی کے قابل ہو جاؤ، اس کے لئے پختہ عزم پیدا ہو اور غلط راستوں سے بچنے کی جدوجہد کرو۔ دوم ولتکبروااللہ علی ماھدایکم یعنی ہدایت اور قوانین خداوندی کو سب پر غالب کرسکو اور سوم تشکرون یعنی اس سے حاصل ہونے والی جدوجہد بھرپور نتائج کی حامل ہو اوراس پر بارگاہ ایزدی میں شکرادا کرو۔ اپنے عظیم مقاصد کے لیے یہ روزے فرض کئے گئے ہیں اور جو قوم سخت گرمی میں بیس گھنٹے سے زائد بھوک اور پیاس کا سامنا کرسکتی ہے وہ دنیا کا ہر کام کرسکتی شرط یہ ہے کہ وہ اس کی روح سے آگاہ ہو لیکن ہمارا حال یہ ہے روزے رکھنے کے باوجود اس کے مقصد اور روح سے دور ہیں جیسا کہ

حکیم الامت نے فرمایا تھا کہ

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں، تُو باقی نہیں ہے

روح رمضان المبارک

رمضان المبارک اپنی تمام تر رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ ہم پر ایک بار پھر سایہ فگن ہے۔ یہ دین سلام کی منفرد خصوصیت کہ اس نے اپنے پیرکاروں کے لیے ایک سالانہ عملی تربیت کا پروگرام رکھا ہے جس سے ان میں نظم و ضبط اور مجاہدانہ تربیت پیدا ہوتی ہے۔ اکٹھے سحری وافطاری کرنے سے مضبوط سماجی روابط اور قربت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جب گھر کے افراد دونوں اوقات میں ایک ہی جگہ بیٹھ کر خورد و نوش کرتے ہیں تو خوشگوار گھریلو زندگی نظر آتی ہے۔ رمضان میں دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور عبادات کے ماحول میں دین کے طرف مزید قربت بڑھتی ہے۔ دین کے روحانی پہلو کا احساس انہیں بھی ہوتا ہے جس کا احساس شائد عام دنوں میں نہ ہوسکے۔ واقعی رمضان کی صورت میں اللہ نے انسانوں کی تربیت کی جو نعمت عطا کی ہے اس پر جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ روزہ جہاں انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتا ہے وہاں جسم انسانی کو افعال پر بھی بہتر اثرات مرتب کرتا ہے اور ساتھ انسانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے جس سے صبر وبرداشت، ایثار و قربانی اور ضبط نفس کے اعلیٰ اوصاف کی تکمیل ہوتی ہے۔ روزہ قدرتی صبریوں بھی دیتا ہے چونکہ ہمارا دھیان کھانے اور پینے کی طرف نہیں ہوتا اس لیے ہمارے دماغ میں موجود Hunger Center کو کوئی محرک نہیں ملتا اور اس طرح ہمیں بھوک اور پیاس کا ویسا احساس نہیں

ہوتا جیسا عام دنوں میں ہوتا ہے۔ہمارے ساتھ یہاں کام کرنے والے یورپین ہمیں روزے رکھتا دیکھ کر محو حیرت ہوتے ہیں اور وہ اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔

شمالی یورپ کے ممالک جن میں سویڈن ، فن لینڈ، ناروے اور آئس لینڈ شامل ہیں وہاں روزے کا دورانیہ بیس گھنٹوں سے زائد ہے۔ قطب شمالی کے اس خطہ کے کچھ علاقوں میں تو ان دنوں دن رات کا تصور ہی نہیں۔ ان لمبے روزوں کی بابت اکثر لوگ سوال کرتے ہیں اور مختلف قسم کے فتوے بھی گردش میں ہیں کہ مکہ یا استنبول کے قوت کے مطابق روزہ رکھ لیا جائے یا پھر سولہ گھنٹے کا روزہ رکھیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ روزہ فاقہ کشی کا نام نہیں کہ سولہ گھنٹے یا کسی اور شہر کے وقت کے مطابق رکھا جائے۔ نماز اور روزہ کے اوقات مقامی ہوتے ہیں اور روزے کا دورانیہ خوداللہ تعالٰی نے صبح صادق سے رات تک مقرر کیا ہے (۲،۱۸۷) پھر کون اسے تبدیل کرسکتا ہے۔ اجتہاد اس معاملہ میں ہوسکتا ہے جو قرآن میں موجود نہ لیکن جو قرآن میں واضح طور ہو اسے کوئی بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔ لمبے روزوں کا حل بھی قرآن میں موجود ہے اور اگر قرآن حکیم میں تدبر کیا جائے تو سورہ بقرہ میں بیماروں، مسافروں اور بہت مشکل سے رکھنے والوں کو قضا کی سہولت دی گئی ہے۔ جن ممالک میں دن رات کا تعین مشکل ہے، یا بہت لمبے روزے ہیں یا موسم کی وجہ سے کوئی بہت ہی مشقت سے سیے رکھتا ہے کہ کوئی کام ہی نہ کرسکے تو وہ اس زمرے میں آجاتا ہے اور یورپی فتویٰ کونسل جس

میں یورپ مین رہنے والے بہت سے علماء شامل ہیں انہوں نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔
یہاں ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اگرچہ شمالی یورپ کے ان ممالک میں بہت لمبے روزے ہیں لیکن چونکہ موسم گرم نہیں ہوتا تو یہاں رہنے والے بڑے تو ایک طرف اکثر بچے بھی روزہ دار ہیں۔ اگر انسان نے کوئی کام کرنا ہو تو وہ کرلیتا ہے لیکن اگر فرار کی راہ تلاش کرنا ہو تو ہو وہ پھر کٹھ حجتوں پر اتر آتا ہے۔لوگ کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ روزے فرض ہوتے ہی اسی سال یعنی سن ۲ھ میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر جنگ لڑنا پڑی تھی اور موسم بھی گرمیوں کا تھا لیکن انہوں نے روزے رکھ کر کفار سے جنگ لڑی اور فتح مبین حاصل کی۔ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے کہ احکامات پر عمل کرنے میں پوری صدق دل سے کوشش کرنی چاہیے۔

مسئلہ کشمیر اور عالمی امن

محمد فاضل مغل ناروے

ریاست جموں و کشمیر جو 84570 مربع میل پر محیط اور دو کروڑ انسانوں کا ملک ہے۔ یہ تقریباً پانچ ہزار سال سے تاریخ کے اوراق پر موجود ہے۔ یہ ریاست جموں وکشمیر برصغیر کی ایک مصدقہ آزاد خود مختار مملکت کے طور پر چلی آ رہی ہے۔ بد قسمتی سے اپنوں کے ہاتھوں سے غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں چلی گئی۔ مغلوں کے بعد انگریز آئے اور یہ ریاست انھوں نے پچھتر لاکھ کے عوض ڈوگرہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دی۔ جس کے اوپر فرزند علامہ اقبال نے کہا کہ

قوم فروختند چے ارزاں فروختند

ڈوگرہ راج میں ریاست جموں کشمیر ایک سو سال آزاد و خود مختار رہی۔ انگریز تقسیم ہند پر ایک ایسا معمہ چھوڑ گئے جو آج تک حل نہ ہو سکا۔ تقسیم برصغیر پر بابائے قوم حضرت محمد علی جناح نے متعدد بار بیانات دیے کہ ریاستوں کا معاملہ ان کی صوابدید پر چھوڑا جائے۔ وہ اگر ہندوستان سے الحاق کرتے ہیں یا پاکستان سے یا پھر خود مختار بھی رہ سکتے ہیں۔ مگر چودہ اگست انیس سو سنتالیس کو دو ملک آزاد ہو گئے مہاراجہ نے دونوں ملکوں سے معاہدہ کی درخواست کی۔ بھارت نے کوئی جواب نہ دیا لیکن مملکت پاکستان نے معاہدہ جوں کا

توں کر کے تسلی دی۔ادھر بائیس اکتوبر کو کشمیر کے فاتح بننے کے شوق میں پاکستانی وزیر داخلہ عبدالقیوم نے قبائلی لشکر کشمیر میں داخل کر دیے۔جنھوں نے ریاست میں داخل ہو کر خوب لوٹ مار کی خواتین کی آبرو ریزی کی۔ریاست جموں کشمیر میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی ریاست میں لوٹ مار اور آبرو ریزی دیکھی اپنی ریاست بچانے کی خاطر بھارت سے مدد طلب کی۔

چنانچہ ستائیس اکتوبر انیس سو سنتالیس کو بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہوئیں اور دونوں ممالک کی افوج پٹھان کوٹ پر متصادم ہوئیں۔اس کے بعد بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو اس معاملے کو اقوام متحدہ لے گئے۔جہاں دونوں ممالک کے مابین ایک معاہدہ ہوا کہ ریاست جموں کشمیر میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی رائے شماری کرائی جائے گی۔اور قوم کا رائے شماری کے بعد فیصلہ کر دیا جائے گا۔لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ رائے شماری کے بعد دونوں ممالک اس کے مالک بن گئے۔اس کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں تین جنگیں ہوئیں۔کشمیری قوم غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ان دونوں ممالک ی افواج کا کشمیری نشانہ بنے مگر رائے شماری نہ ہو سکی۔جس کے نتیجے میں دونوں ممالک اسلحہ کے انبار لگاتے چلے گئے اور آج دونوں عالمی طاقت بن چکے ہیں۔جو پوری دنیا کے لیے انتہائی خطرناک صورر تحال اختیار کرتے جا رہے ہیں۔بنیادی وجہ کشمیر کا حصول ہے کہ وہاں کے وسائل پہ قبضہ ہو جائے۔اب دونوں مملک کو پانی

درکار ہے اور یہ کہ وہاں کے وسائل پہ قبضہ ہو جائے۔ جبکہ وہاں کے انسانوں سے کوئی مطلب نہیں کشمیر کے جنگلات جو کہ وہاں کا قدرتی حسن تھے۔ برباد کر دیے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ماحول خطرناک حد تک گرم ہو گیا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے گلیشیر پگھلنے شروع ہو گئے ہیں۔

یہ پانی کی جنگ عالمی خطرہ کی علامت بن رہی ہے۔ مگر دنیا کے ممالک اس خطرہ سے بے خوف ہیں۔ اگر دو بم چل گئے تو کرہ ارض پر کوئی ذی روح نہ رہ سکے گی۔ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں گے اور یوں قیامت برپا ہو جائے گی۔ دنیا کے امن کی خاطر اور اپنی ترقی کے لیے اگر یہ دونوں ممالک ماس مسئلہ کو باہمی مفاہمت حاصل کر لیں تو ترقی کی دوڑ میں یورپ سے بھی آگے نکل جائیں۔

مسئلہ کشمیر کا حل یہ ہے کہ دونوں ممالک کشمیر سے اپنی افواج نکال لیں۔ اور اقوام متحدہ کے زیر نگرانی آزاد رائے شماری کرائی جائے۔ تاکہ دنیا کا امن قائم رہ سکے اور اور ماحولیاتی آلودگی کے خطرے سے محفوظ رہا جا سکے۔

نزول قرآن اور خطابات اقبال

رمضان نزول قرآن کا مہینہ ہے جس کی وضاحت سورہ بقرہ میں کردی ہے۔ سورہ القدر میں اس کی پوری تفصیل بیان کردی کہ ہم نے اس قرآن کو اُس وقت جبکہ ساری دنیا وحی کی روشنی سے محروم ہو کر تاریکی میں ڈوب چکی تھی ، نئی اقدار اور قوانین کے ساتھ نازل کیا۔ جس رات میں اس کے نزول کا آغاز ہوا' وہ ایک جہانِ نو کے نمودار کی رات تھی۔ قرآن کو بھیجنے والے رب سے بڑھ کر اور کون بتا سکتا ہے کہ یہ نئی اقدار اور نئے پیمانوں کی شب جس میں یہ نازل ہوا ہے وہ کس قدر با عظمت ہے۔اس رات کی عظمت بتا رہی ہے کہ رفتہ رفتہ قانونِ خداوندی کے مطابق انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا جائے گا' اور وحی خداوندی کی روشنی میں زندگی کے ہر گوشے میں امن وسلامتی کی فضا عام ہوتی جائے گی۔ یہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا یا بیت العزت پر قرآن کے نزول کا ذکر ہے جہاں سے تئیس سال میں 610 ء سے 623 ء تک قلب نبوی پر نازل ہوتا رہا پھر سورہ مائدہ کی تیسری آیت نازل ہوئی کہ آج دین مکمل ہوگیا ہے ۔ اس کتاب عظیم کے نازل کرنے کا مقصد سورہ ابراہیم میں بتایا کہ یہ کتاب جسے ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے تاکہ اس سے آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی جانب لے آئیں اور ان کے رب کے حکم سے اس کی راہ کی طرف جو غلبہ والا سب خوبیوں والا ہے۔خدا نے قرآن کیوں بھیجا اس کا جواب بھی خود

بھیجنے والے نے سورہ الدخان میں یوں دیا ہے کہ یہ کتاب مبین ہے جس میں واضح ضابطہ حیات اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔اس کا آغازِ نزول ایک ایسی رات میں ہوا جو ساری دنیا کے لئے صد ہزار برکات وسعادت ہے۔یہ ہمارے اسی سلسلہ کے مطابق نازل ہوئی جس کی رُو سے ہم روز اول سے انسانوں کو ان کی غلط رَوش کے نتائج سے آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں اور اب یہ اسی سلسلہ شدوہدایت کی آخری کڑی ہے۔ سورہ الاسراء میں بھی نزول قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل فرمارہے ہیں جو ایمان والوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے لئے تو صرف نقصان ہی بڑھتا ہے۔ اس قدر عظیم ضابطہ قوانین اور ہدایت ملنا کوئی معمولی بات نہیں جس بارے میں سورہ یونس میں فرمایا کہ یہ وہی قانون ہے جو اب اے نوعِ انسان ! تمہارے رب کی طرف سے ایک ضابطہ ہدایت کی شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔اس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ جو اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔ان سے کہہ دیں کہ اس قسم کے ضابطہ ہدایت کا مل جانا خدا کے فضل ورحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر۔ رمضان کے اختتام پر عید الفطر دوسرے لفظوں میں نزول قرآن کی خوشی میں جشن مسرت ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں قرآن مجید کے پیغام کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے جس بارے میں اکثر لکھا جاتا ہے لیکن اپنے خطبات میں انھوں نے قرآن حکیم کی نابت جو کچھ لکھا ہے اس طرف عمومی طور پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ معروف ماہر اقبالیات محمد شریف بقا نے اپنی کتاب موضوعات خطبات اقبال میں وہ اقتباسات پیش کیے ہیں جو علامہ نے قرآن کے بارے میں لکھے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ حکیم وہ کتاب ہے جو تصور اور عقیدے سے زیادہ عمل پر زور دیتی ہے۔قرآن حکیم خدا تعالٰی کا عطا کردہ مکمل ضابطہ حیات اور صحیفہ ہدایت ہے۔قرآن حکیم نے ہمارے اعمال سے پہلے ہمارے افکار، نظریات،احساسات،جذبات بلکہ خیالات کی اصلاح و تطہیر پر زور دیا ہے۔چونکہ ہمارے اعمال ہمارے افکار ہی کے غماز ہوتے ہیں اس لیے سب سے پہلے ان کی پاکیزگی ضروری ہے۔قرآن حکیم خدا تعالٰی کو ہمارے ہر فعل میں ہمارا حاکم بنانے پر زور دیتا ہے تاکہ ہم لامحالہ ہر شعبہ حیات میں کی بلا شرط اطاعت اختیار کر سکیں۔جب خدا تعالٰی کا تصور ہمارے دل ودماغ میں اچھی طرح جاگزیں ہوجائے گا تو ہم اپنی عملی زندگی میں اس کا ثبوت بہم پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔خدائی قوانین کی ابدی صداقت کا یقین اور اس کی ہمہ وقت اطاعت کا تصور ہی ہمارا عقیدہ اور ایمان ہوتا ہے۔ایسی حالت میں ہم بلاچون وچرا اس کو ہر کام میں اپنا حاکم خیال کرنے لگتے ہیں۔ ایمان، عقیدے، اور تصور کی پختگی کے بعد قرآن حکیم ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل سے

بھی اپنے قول کا ثبوت دیں۔ کسی بات کو محض عقلی طور پر ماننے کے بعد اس کے مطابق عمل نہ کرنا منافقت اور بزدلی کی علامت ہے۔علامہ تسخیر کائنات کے حوالے سے قرآن عظیم کا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں "The Quran opens our eyes to the great fact of change, through the appreciation and control of which alone it is possible to build a durable civilization."

اسلامی میں قرآن حکیم کی سپریم حیثیت بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے مبارک عہد سے لے کر عباسی حکمرانوں کے ابتدائی دور حکومت تک مسلمانوں کے پاس قرآن کے علاوہ اور کوئی ایسا آئینی ذریعہ نہیں تھا جو اس کی طرح مدوّن اور مرتب ہوتا۔جب مسلم حکومت کا دائرہ اثر وسیع ہوگیا اور نئے علاقوں کے رہنے والے حلقہ بگوش اسلام ہوئے یا ذمّی رعایا کی حیثیت سے مسلم مملکت میں زندگی گذارنے لگے تو باہمی میل جول نے نئے نئے مسائل کو جنم دیا۔علامہ مزید فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم محض عقائد وعبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں حیاتِ اجتماعی کی ترقی وکامرانی کی بھی تعلیم ہے۔اس لحاظ سے دین اور سیاست وآئین میں کوئی ثنویت نہیں۔ حضرت عمرؓ نے بجا فرمایا تھا: ”حسبنا کتاب اللہ“ (ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے)۔ اس نقطہ نگاہ سے قرآن حکیم ہی ہمارے قوانین کا اوّلین اور بنیادی سرچشمہ ہونا چاہیے۔امت مسلمہ آگ

بھی اپنے مسائل کے گرداب سے نکل سکتی ہے اگر وہ روح عمرؓ کے مطابق یہ طے کرلے کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

تاریخی واقعات بیان کرنے سے مراد یہ نہیں کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں۔ بلکہ اقوام سابقہ کے جو واقعات اس میں دیئے گئے ہیں وہ فلسفہ تاریخ ہے۔ قرآن اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے پھر اس کو تاریخی شہادتوں سے ثابت بھی کرتا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے آئندہ بھی جو قوم اس طرح کے کام کرے گی اُس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ ویسے تو پورے قرآن حکیم میں تاریخی شہادتیں اور گذری ہوئی اقوام کے واقعات موجود ہیں لیکن صرف سورہ الشعراء میں آٹھ اقوام کا ذکر کرکے ایک ہی باب میں بہت خوبصورت انداز میں بات واضح کی ہے۔ مکہ میں نازل ہونے والی اس سورہ کی آیت میں شعرا کا لفظ آیا ہے جس کی وجہ سے اس سورہ کا نام االشعراء ہے۔ اُس دور ۲۲۴ میں عرب میں شاعری عام تھی اور شعراء کا ان کی زندگی میں بہت عمل دخل تھا۔ ابتداء میں اہل مکہ نے قرآن کو بھی شاعری ہی سمجھا۔ اس سورہ میں اُن کے اس طرز عمل کو رد کرتے ہوئے دور جاہلیت کی شاعری کی مذمت کی اور کہا کہ شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے خود تسلیم کرلیا کہ یہ شاعری نہیں کچھ اور ہی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں ہونے والے شاعری کے ایک مقابلہ مین جب حضرت علیؑ نے قرآن کی سب سے مختصر سورہ کوثر آویزاں کی تو عرب کے سب بڑے شاعر لبید کو یہ اعتراف لکھنا پڑا کہ یہ کسی بشر کا کلام

نہیں۔ چونکہ اس سورہ میں شاعری بھی زیر بحث ہے اس لیے اس سورہ میں قرآن کا ادبی حسن بلندیوں پر ہے اور اس میں الفاظ اور اُن کا ردھم ایسا ہے کہ انسان پڑھتے ہوئے جھوم جاتا ہے۔

اس سورہ کے ابتداء میں صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ کے ذکر سے ہے جو آیات ۱۰ تا تک ہے پھر خلیل اللہ حضرت ابراھیمؑ کی جدوجہد آیات ۶۹ تا ۸۹ ہے اور حضرت ۶۶ نوحؑ کا تذکرہ جلیلہ آیات ۱۰۵ تا ۱۲۱ ہے۔ حضرت نوح کی جانشین قوم عاد کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبر حضرت ہودؑ اذکر ۱۲۳ تا ۱۳۹ اور حضرت صالحؑ اور ان کی قوم ثمود جنھیں اصحاب الحجر بھی کہتے ہیں کا تذکرہ ۱۴۱ تا ۱۵۸ میں ہے۔ حضرت لوطؑ کی قوم کے بارے میں ۱۶۰ تا ۱۷۳ تک آیات میں ہے اور حضرت شعیبؑ کا ذکر ۱۷۶ تا ۱۸۹ ہے۔

اقوام سابقہ کے بعد آیت ۱۹۰ کے بعد رسول اکرم کی جدوجہد کا ذکر، اہل مکہ اور اس دور کی شاعرانہ ذہنیت کا ذکر ہے۔ سورہ میں دو آیات آٹھ اور نو دہرائی گئی ہیں اور ہر پیغمبر اور ان کی قوم کے تذکرہ کے بعد یہ آیات آئیں اور آٹھ مرتبہ غور و فکر کا پیغام دیتی ہیں۔ ان دہرائی جانے والی آیات میں فلسفہ تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ غور و فکر ہی نہیں کرتے اس لئے اس کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔ ان کے ایمان نہ لانے سے خدا کے قانون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے کیونکہ وہ اُس خدا کا قانون ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ مخالفین

کتنے ہی صاحب قوت کیوں نہ ہوں' اس کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہی خدا ہے جو ہر شے کو نشو و نما دینے والا ہے۔

اسی فلسفہ تاریخ کو سورہ الانفال میں واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اِن مخالفین سے کہہ دو کہ اگر یہ اب بھی اپنی مخالفت سے باز آجائیں تو جو کچھ یہ اس وقت تک کر چکے ہیں، اُس کا اِن سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ وہی کچھ پھر کرنے لگ گئے تو جو کچھ اقوامِ گذشتہ کے ساتھ ہوا ہے، وہی ان کے ساتھ ہو گا۔ اپنے دعویٰ کی صداقت میں قرآن حکیم ثبوت پیش کرتے ہوئے سورہ آل عمران اور سورہ محمد میں کہتا ہے کہ تم سے پہلے گذشتہ امتوں کے لئے قانونِ قدرت کے بہت سے ضابطے گزر چکے ہیں سو تم زمین میں چلا پھرا کرو اور دیکھا کرو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ کیا انہوں نے زمین میں سفر و سیاحت نہیں کی کہ وہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ اللہ کے قانون کے انکار کی وجہ سے ان پر ہلاکت و بربادی ڈال دی اور انکار کرنے والوں کے لئے اسی طرح کی بہت سی ہلاکتیں ہیں۔

قرآن حکیم بار بار ہمیں سوچنے، سمجھنے، غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ تاریخی شہادتیں ہمارے لیے اسی غرض سے پیش کی گئیں تاکہ ہم ان سے سبق سیکھیں۔ ہم نے نزول قرآن کا مقصد فراموش کر دیا اور اس کتاب عظیم کو صرف نمائش کے

لیے رکھا ہے جس طرف حکیم الامت نے یوں اشارہ کیا ہے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کردیا تو نے

گیا سے واشنگٹن تک

چھ عشروں سے زیادہ کی تاریخ گویا انہوں نے کھول کر سامنے رکھ دی۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں سے لے کر ملک کے دولخت ہونے تک کے اہم واقعات کے وہ عینی شاہد تھے اور یادداشت ایسی کمال کہ چھوٹی اور معمولی باتیں بھی ایسی ذہن نشین جیسے کل کی بات ہو۔ تین ہجرتوں پر مشتمل نصف صدی سے زیادہ عرصے کی تاریخ کا یہ سفر وائس آف امریکہ اردو سروس کے مینیجنگ ایڈیٹر جناب رضی احمد رضوی کا ہے۔ خوش نصیبی سے اسٹاک ہوم میں ان سے ایک یادگار ملاقات ہوئی۔ پاکستان کے ابتدائی دور سے انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور بتایا کہ ان کی پیدائش ۱۲ جنوری ۱۹۴۴ء کو بھارت کے صوبہ بہار میں ضلع گیا کے ایک چھوٹے سے قصبے رفیع گنج میں ہوئی۔ گیا وہی مقام ہے جس کے قریب ہی واقع بودھ گیا میں روایات کے مطابق گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں وہ اپنے خالہ زاد بھائی واعظ الرحمٰن جو بعد میں حبیب بینک کے سینئر وائس پریذیڈنٹ بنے) اور اپنے چچازاد بھائی امان اللہ بخاری کے ہمراہ اپنے بڑے بھائی غیور حسین کی نگرانی میں مشرقی پاکستان جانے کے لیے کلکتہ کے سیالدہ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ جب اسٹیشن پر ریل گاڑی پر اردو میں پاکستان ریلوے لکھا دیکھا تو سمجھے کہ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور گاڑی دیکھتے ہی جذباتی ہو گئے اور زور زور سے تینوں

نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ حالات ان دنوں خوش گوار نہیں تھے۔ ان کے بڑے بھائی صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے تینوں کو انتظار گاہ میں لے آئے۔ پہلے وہ راج شاہی اور پھر ڈھاکہ پہنچے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے اردو میں مقامی خبریں پڑھنا شروع کیں۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انہوں نے 'پی پی آئی' نیوز ایجنسی سے جو اس وقت 'پی پی اے' کہلاتی تھی — اپنی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے ذیلی ادارے 'ایشین ٹیلی وژن' میں کراچی میں شمولیت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے قبل وہ پی ٹی وی کراچی کے شعبہ خبر سے منسلک ہوگئے۔

اس کا پس منظر بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ ۱۹۷۰ء کے تاریخی انتخابات سے پہلے کی بات ہے جو متحدہ پاکستان کا آخری الیکشن ثابت ہوا۔ اس موقع پر الیکشن ۷۰ء کے نام سے پاکستان ٹیلی وژن پر طویل نشریات کا اہتمام کیا گیا تھا جو لوگوں کو آج تک یاد ہے۔ اور اتنے برس گزر جانے کے باوجود اس وقت جنھوں نے یہ نشریات دیکھی تھیں، وہ اسے اب بھی یاد کرتے ہیں۔ ان دنوں کراچی ٹیلی وژن سینٹر کے جنرل منیجر اسلم اظہر صاحب تھے جو بعد میں پی ٹی وی کے منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے اور ٹیلی وژن کے لیے جن کی گراں

قدر خدمات کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جب وہ الیکشن ۷۰ء کی خصوصی نشریات کو کراچی میں منظم کر رہے تھے تو انہیں کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو مشرقی پاکستان کی سیاست اور وہاں کی سیاسی شخصیات سے بخوبی واقف ہو اور ان کے بارے میں مستند معلومات رکھتا ہو۔ انہوں نے ایشین ٹیلی وژن سروس کے جنرل منیجر نور الاسلام صاحب سے رابطہ کیا جو بنگالی تھے اور نہایت باصلاحیت شخص تھے۔ انہوں نے میرا نام تجویز کیا اور کہا کہ وہ آپ کے لیے بہت کارآمد رہے گا۔ اسلم اظہر صاحب سے اس طرح ملاقات طے ہوئی اور گفتگو کے بعد انہوں نے بلاتامل میرا انتخاب کرلیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈھاکے میں قیام کے دوران ای دشت کی سیاحی میں میرا وقت گزرا تھا۔ اس طرح میں ایشین ٹیلی وژن سے عارضی طور پر کراچی ٹیلی وژن سینٹر آگیا۔ ادارہ چونکہ ایک ہی تھا، اس لیے اسلم اظہر صاحب نے بہ کمالِ شفقت مجھے پھر نہ چھوڑا اور میں یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ تاوقتیکہ میرا تبادلہ اپریل ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی ٹیلی وژن سینٹر پر نہ ہوگیا جہاں مجھے نیوز ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان ٹوٹنے کے بعد بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تھا۔ اس وقت ملک کو بے پناہ داخلی اور خارجی مسائل کا سامنا تھا اور فضا میں ایک عجیب بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ آگے کی کہانی بہت طویل بھی ہے اور دل چسپ بھی جو پھر کبھی سہی۔

رضی احمد رضوی صاحب سے ملاقات کے دوران مختلف النوع موضوعات زیرِ گفتگو آتے رہے اور انہوں نے بہت سی یادوں کا احاطہ کیا۔ اسی دوران ۱۹۶۹ء میں رباط میں ہونے والی پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ بھارت نے گربچن سنگھ کو کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیج دیا تھا جو ایک سکھ تھے۔ لیکن جب صدر یحیٰ خان نے انہیں کانفرنس ہال میں دیکھا تو سخت موقف اختیار کیا جس پر بھارتی وفد کو کانفرنس میں شرکت سے روک دیا گیا۔ یحیٰ خان کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان میں کئی خامیاں ہوں گی لیکن وہ محبِ وطن انسان تھے۔ مزارِ قائد کی تعمیر برسوں سے تعطل کا شکار تھی جسے انہوں نے ہی اپنے دورِ حکومت میں جلد مکمل کرایا۔ پاکستان کی سیاست میں ان کا کردار خاصا متنازع سمجھا جاتا رہا ہیاور یہ الگ لمبی بحث کا موضوع ہے۔ انہوں نے ضمناً یاد دلایا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یحیٰ خان کے دورِ صدارت میں پاکستان کے دولخت ہونے سے کچھ ہی عرصہ پہلے نائب وزیرِاعظم اور وزیرِ خارجہ کے عہدے قبول کیے۔

گفتگو کے دوران صحافتی کیریئر کے دوران کسی یادگار سیاسی واقعے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ میں اس واقعے کا عینی شاہد ہوں کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب ڈھاکے میں فوجی ایکشن کیا گیا تو بھٹو صاحب وہیں موجود تھے اور دو دن بعد غالباً ۲۷ مارچ کو کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈے کے ٹرمیک پر

صرف دو اخباری نمائندوں سے ان کی ملاقات ہوئی جن میں میرے علاوہ اے پی پی کے نمائندے آئی اے خان تھے جو آج کل لندن میں رہتے ہیں۔ ڈھاکے سے کراچی ایئر پورٹ پر اپنی آمد کے بعد بھٹو صاحب نے وہاں اوپر گیلری میں موجود لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے یہ تاریخی جملہ کہا، "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کو بچالیا گیا"۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ یقیناً پاکستان کی تاریخ کا ایک سبق آموز باب ہے اور اس پر کافی بحث ہوتی رہی ہے لیکن سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کو کیا کیجئے کہ شاید احساسِ زیاں ہی جاتا رہا۔

شملہ کانفرنس میں جانے سے قبل رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے بھٹو صاحب نے مختلف وفود سے ملنا شروع کیا۔ اس حوالے سے رضی احمد رضوی بتاتے ہیں کہ ایک دن علما کے وفد کے ساتھ مری میں ملاقات ہو رہی تھی اور وہ پی ٹی وی کے لیے وہاں کارروائی ریکارڈ کر رہے تھے۔ وہیں محکمہ اطلاعات کے ایک عمر رسیدہ فوٹو گرافر بھی تصاویر بنا رہے تھے کہ کچھ علما نے اپنا چہرہ چھپانا شروع کر دیا۔ جس پر بھٹو نے اجلاس کے دوران خود بھی ناگواری کا اظہار کیا اور اس بزرگ فوٹو گرافر کی اتنی تنبیہ کی کہ وہ بے چارے سکتے میں آ گئے۔ انہوں نے بھی اپنے کیمرہ مین کو پیچھے کھینچا اور فوری ریکارڈنگ بند کرنے کو کہا۔

جنرل ضیاالحق کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات جس سے بہت سے لوگ متفق تھے کہ وہ بظاہر ایک منکسر المزاج انسان تھے اور لوگوں کا دل جیتنے کا فن جانتے تھے، اس سے قطعِ نظر کہ بہت سے لوگ ان کے بارے میں مختلف نقطہء نظر رکھتے ہیں اور ان کی پالیسیوں اور کار گزاریوں، خاص طور پر ان کی افغان پالیسی کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

عالمی شخصیات سے اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر جب پہلی بار چین گئے تو راول پنڈی میں ان کا انٹرویو کیا۔ سابق ایرانی صدر ڈاکٹر ابوالحسن بنی صدر، سابق بھارتی وزیرِ اعظم آئی کے گجرال، ایل کے ایڈوانی، مشہور صحافی کلدیپ نیر، شاعر اور ادیب جگن ناتھ آزاد، عبدالستار ایدھی، بے نظیر بھٹو، میاں نواز شریف، الطاف حسین، خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، عبدالصمد خان اچکزئی، نوبیل انعام یافتہ سائنس دان نورمن.برلاگ اور بہت سی دیگر عالمی شخصیات کے بھی انٹرویو کیے جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

مختلف واقعات کے حوالے سے گفتگو جاری تھی کہ رضی احمد رضوی نے بتایا کہ جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کراچی ٹیلی ویژن سے خبر نشر ہوئی تو ایسے میں جب پوری قوم ایک سانحے سے دوچار تھی، ایک ناظر نے نیوز ایڈیٹر کو ٹیلی فون کیا کہ

سقوط کے لفظ کا تلفظ درست ادا نہیں ہوا، اس پر توجہ کریں۔ ان کے فون پر پہلے تو نیوز ایڈیٹر برہان الدین حسن صاحب نے تحمل اور خاموشی سے انہیں ٹالنے اور ٹیلی فون بند کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا اور انہوں نے ان صاحب کی اچھی خبر لی۔

انہوں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر بہت سے بھارتی اور پاکستانی رہنماؤں اور اعلیٰ عہدیداروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری ناقص رائے میں پاکستان کے سیاست دان اور افسران رعونت، نمود و نمائش اور فضول خرچی کو اپنی شان سمجھتے ہیں جب کہ اس کے برعکس بھارتی رہنما بظاہر عاجزی، سادہ طرزِ زندگی کے حامل اور ظاہر پرستی سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی سال پہلے بھارت کے دورے میں میں نے دیکھا کہ بیشتر اعلیٰ عہدے دار جن میں سینئر فوجی افسران بھی شامل تھے بھارت ہی کی بنی ہوئی کار 'ایمبیسیڈر' استعمال کر رہے تھے۔

اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دنیا میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں اور اس سے مختلف لہجے بھی سامنے آ رہے ہیں۔ یہ لہجے اردو کی خوب صورتی میں اضافہ ہیں اور ہمیں انہیں ہدفِ تنقید نہیں بنانا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے اور علاقوں کی طرح پنجاب نے یقیناً

اردو کی بہت خدمت کی ہے اور اب یہ اردو کا بہت بڑا خطہ خیال کیا جاتا ہے۔ خبروں کے معیار کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ بیشتر صورتوں میں کم از کم دو مستند ذرائع سے تصدیق کے بعد ہی خبر قابلِ نشر و اشاعت ہونی چاہیے۔ انہوں نے بتایا کہ وائس آف امریکہ میں اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ صحافت، سیاست، تاریخ، ادب اور عالمی امور پر ان سے اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں جنہیں ایک کالم میں سمونا محال ہے۔ ان کا دھیما لہجہ اور خوب صورت باتیں دل پر اثر کرنے والی ہیں، اسی لیے قارئین کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

مسئلہ کشمیر بند گلی میں

آخر کشمیری کیا کریں اور کتنی قربانیاں دیں۔ کیا دنیا آخری کشمیری کے مرنے کا انتظار کر رہی ہے؟ کشمیریوں کا کوئی کوئی پرسان حال نہیں۔ یتیم بچے، بیوی عورتیں، معذور افراد اور وادی میں بہتا ہوا خون بھی عالمی ضمیر کو بیدار نہیں کر سکا۔ بے حس اور خواب غفلت کا شکار اسلامی ممالک کے کانوں تن آسانی کا شکار ہیں۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے سیاستدان کرسی اقتدار کی شرمناک جدجہد میں دست وگریباں ہیں۔ مورخ یہ ضرور لکھے گا کہ جب وادی کشمیر میں شہادتوں کی داستاں رقم ہو رہی تھی تو دوسری جانب مراعات اور کرسی کی جنگ جاری تھی۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا جائے گا کہ پاکستان کی نام نہاد سول سوسائٹی نے کشمیریوں کی چیخیں سُن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کہاں ہیں حقوق انسانی کے علمبردار جن کی زبانیں گنگ ہو گئی ہیں۔ حقوق انسانی کی جدوجہد کے حوالے سے عاصمہ جہانگیر جب سویڈن اپنا ایوارڈ لینے آئیں تو انہوں نے سویڈش انسٹیٹیوٹ برائے امور خارجہ میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان اور دیگر ممالک میں خواتین کے مسائل اور جبر کے حوالے سے اظہار خیال کیا لیکن کشمیری خواتین پر ہونے والے ظلم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ جب وقفہ سوالات میں راقم نے کشمیر میں عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم پر ان کی توجہ مبذول کرائی تو پھر بھی انہوں نے خاموشی ہی

اختیار کی۔ برہان وانی کی شہادت کے بعد کشمیر میں ہونے والے مظاہروں میں ان سطور کے لکھنے تک ساٹھ سے زائد افراد شہید کر دیئے گئے ہیں۔ وادی کشمیر میں پیلٹ گن کا قہر بہت سے نوجوانوں کی بینائی چھین چکا ہے۔ چار ہفتوں سے اب تک نہتے کشمیری کرفیو اور چھ لاکھ فوج کی موجودگی کی باوجود احتجاج کر رہے ہیں۔ سینکڑوں تشدد کا نشانہ بنے ہیں۔ محکوم اور مجبور کشمیری جن کی طرف مدد کے لئے دیکھ رہے ہیں وہ خاموش ہیں۔ وہ زبان حال سے فریاد کر رہے ہیں کہ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر۔ اگرچہ دنیا کے کئی ممالک میں کشمیریوں نے اس ظلم کے خلاف مظاہرے بھی کئے ہیں لیکن کیا یہ اس کا حل ہے۔ کشمیری شہید ہو رہے ہیں، معذور ہو رہے ہیں اور دنیا میں ہونے والے مظاہرے بھی بھارت کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ کب تک کشمیری قربانیاں دیں۔ طویل عرصہ سے جاری جد جہد آزادی میں شہید ہونے والوں کی بیواؤں، یتیم بچوں، بوڑھے ماں باپ اور بے سہاروں سے کبھی کسی نے پوچھا کہ اُن کی پہاڑ جیسی زندگی جس طرح گذر رہی ہے۔ ان کے گھروں کا چولہا کیسے چلتا ہے۔ معذور ہونے والے اور اپنی آنکھیں گوانے والوں کے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں کیا کبھی کسی نے ان پر غور کیا۔ یاسین ملک، میر واعظ عمر فاروق، سید علی گیلانی، شبیر احمد شاہ اور دیگر کشمیری رہنماؤں کا سنجیدگی سے بیٹھ کر اس پر غور کرنا ہوگا کہ وہ اپنی قوم سے مزید کتنی قربانیاں چاہتے ہیں۔ وہ مستقبل کا لائحہ عمل سوچیں کہ مسئلہ کشمیر کیوں بین الاقوامی توجہ نہیں لے سکا۔ وہ اس بات پر بھی غور

کریں کہ پاکستان کو کیوں سفارتی کامیابی نہیں مل سکی۔ پاکستان کی کشمیر پالیسی کوئی ہے بھی یا نہیں۔ دنیا بھر میں پاکستانی سفارت خانے مسئلہ کشمیر کو کس حد تک اجاگر کر رہے ہیں۔ عالمی رائے عامہ کو کیسے ہموار کیا جاسکتا ہے۔ بھارت کی ہٹ دھرمی اور جبر کے خلاف کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے۔ کشمیریوں کے حق میں خود بھارت سے اٹھنے والی آوازوں کو کس طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری قیادت کی بصیرت کا امتحان ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ باوجود ہزاروں قربانیوں کے مسئلہ کشمیر بین الاقوامی توجہ نہیں لے سکا جس کی براہ راست ذمہ داری حکومت پاکستان کی ناکام سفارتی پالیسی ہے۔ چونکہ پاکستان کشمیریوں کا وکیل ہے اس لیے یہ ذمہ داری خود اس نے اپنے سر لی ہے لیکن پاکستانی حکومتوں کی مسئلہ کشمیر کے ساتھ دلچسپی کا اندازہ اس سے لگالیں کہ پارلیمانی کشمیر کمیٹی کا صدر اُس شخص کو بنایا ہے جسے نہ کشمیر سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی وہ اس مسئلہ کو سمجھتے ہیں، جس کا ثبوت اُن کی آٹھ سالہ کارکردگی ہے۔ حکومت پاکستان کے پاس عالمی رائے کو بیدار کرنے اور مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں اور نہ سفارت خانوں کو اس ضمن میں ہدایات دی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں پاکستانی سفارت سفارت خانے پانچ فروری کو خانہ پُری اور رسمی کاروائی کرتے ہوئے کشمیریوں کے ساتھ اظہار یکجہتی منانے کی تقریبات ہوتی

ہیں جن میں آج تک میزبان ملک کے سیاستدانوں، حقوق انسانی کے اداروں، صحافیوں اور مقامی لوگوں کا مدعو نہیں کیا گیا۔ صرف اپنے لوگوں کو بلا کر صدر اور وزیر اعظم کے پیغامات سنا کر اورہائی ٹی پیش کرکے اپنا فرض ادا کیا اور ایک سال کے لیے لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ کیا اس طرح بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر اجاگر ہوگا۔ اگر پاکستان عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو متعارف نہیں کراسکتا اور پاکستانی سفارت خانے کچھ مجبوریوں کے باعث ایسا نہیں کر سکتے تو یہ ذمہ داری آزاد کشمیر کی حکومت کو کیوں نہیں سونپی جاتی کہ وہ خود عالمی برادری کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرے۔ یہ ایک خوش آئند قدم کہ سابق سفیر مسعود خان کو آزاد جموں کشمیر کا صدر بنایا جارہا ہے۔ وہ چین اور اقوام متحدہ میں سفیر رہے ہیں اور وزارت خارجہ میں طویل عرصہ ملازمت کی وجہ سے بین الاقوامی حالات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار اور مشکل صورت حال میں بھی کام کرنے اور اپنا نقطہء نظر پیش کرنے کی خوبیوں کے حامل ہیں۔ صدر آزاد جموں کشمیر کی حیثیت سے وہ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو بہتر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ انہیں مسئلہ کشمیر کو پاک بھارت تنازعہ سے ہٹ کر کشمیری عوام کے غیر مشروط حق خود آرادیت کی بنیاد پر عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ مسعود خان کے صدمنتخب ہونے کے بعد پارلیمانی کشمیر کمیٹی کو ختم کر دینا چاہیے اور اس کمیٹی کے وسائل اور مینڈیٹ صدر آزاد کشمیر کے سپرد کر دینا چاہیے اور انہیں یہ ذمہ داری دی جائے

کہ وہ دنیا کو مسئلہ کشمیر سے آگاہ کریں۔ مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں۔

بھارت کو اپنی ملک کے اندر سے اٹھنے والی آوازوں پر کان دھرنا چاہیے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ظلم و ستم اور ہر طرح کے حربے اختیار کرنے کے باوجود کشمیری اس کا تسلط قبول نہیں کر رہے تو کسی حل کی طرف جانا ہوگا۔ اور نہیں تو اپنی افواج کے سابق سربراہ جنرل سی پی سنگھ کی نصیحت پر ہی توجہ دینی چاہیے کہ کشمیر کا مسئلہ موجود ہے اور یہ طاقت سے حل نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک کی ہی بات غور سے سُن لیں کہ کشمیر پر بھارت پہل کرے، گولی کا سہارا نہ لے بلکہ کشمیری قیادت سے بات کرے اور بغلیں جھانکنا بند کرے۔ بھارت جتنی جلد اس حقیقت کو سمجھ لے یہ اس کے لیے اچھا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ آخر کار کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کرنا ہی ہوگا۔

بیت الحکمت اور عمران خان

مسلمانوں کی تاریخ کا سنہرا دور وہ تھا جب علم و تحقیق اور سائنس و فلسفہ عروج پر تھا۔بغداد اس دورزریں کا مرکز تھا اور عباسی خاندان کی حکومت تھی۔ اس دور میں خلیفہ ہارون الرشید نے علم و تحقیق کے ایک مرکز کی بنیاد رکھی جسے دنیا دارالحکمت کے نام سے جانتی ہے۔ ہارون الرشید کے بعد اُن بیٹے مامون House of Wisdom الرشید نے اس بیت الحکمت کو مزید ترقی دی اور اُس وقت وہ دنیا کا سب سے بڑا تعلیم و تحقیق کا مرکز تھا جہاں تمام اہم علوم کے ماہرین اپنے اپنے شعبہ میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ طب، زراعت، فلکیات، کیمیا، طبیعات، فلسفہ، ادب، آرٹ، انجینئرنگ اور دیگر تمام علوم و فنون کے ماہرین دن رات تعلیم و تحقیق میں مصروف رہتے تھے اور علم کی روشنی آگے پھیلاتے تھے۔ اسی علم کی روشنی سے یورپ سے گذر رہا تھا۔ دنیا میں علم اور Dark Ages منور ہوا جو اس وقت تاریک دور سائنس جو ترقی ہمیں آج نظر رہی ہے اس میں بغداد کے بیت الحکمت کا اہم حصہ ہے۔اسلامی سلطنت اور بغداد جب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تو امت مسلمہ کا زوال شروع ہوا اور پھر کوئی اور بیت الحکمت قائم نہ ہوا جبکہ اہل مغرب نے اُس بیت الحکمت جیسے کئی ادارے بنائے اور علم و تحقیق کی میراث وہ لے اڑے جس کی بدولت وہ آج دنیا میں ترقی کی معراج پر متمکن ہیں۔ دور حاضر

میں پچاس سے زائد مسلمان ممالک ہیں لیکن کسی ایک اسلامی ملک میں بیت الحکمت جیسا ادارہ نہیں بنایا گیا۔ نوے لاکھ کے ملک سویڈن کی تین جامعات کارولنسکا انسٹیٹیوٹ، اپسالا اور لند دنیا کی پہلی سو بہترین یونیورسٹیوں میں شامل ہیں لیکن عالم اسلام کی کوئی ایک یونیورسٹی پہلی پانچ سو میں بھی نہیں۔ مالی وسائل رکھنے کے باوجود کسی جگہ ہمیں بیت الحکمت جیسا علم و تحقیق کا مرکز نظر نہیں آتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حکمران جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں اور علم و تحقیق اُن کی ترجیح ہے ہی نہیں۔

عمران خان کی سیاست اور طریقہ کار اور انداز سے اختلاف ممکن ہے۔ کارزار سیاست میں انہوں نے کئی غلطیاں بھی کی ہیں۔ اُن کے کئی سیاسی فیصلوں اور سیاسی جدجہد سے اتفاق لازمی نہیں لیکن اُن کی پاکستان کے لیے تڑپ اور جذبہ سے ہر ذی شعور اور منصف المزاج شخص اتفاق کرے گا۔ شوکت خانم کینسر ہاسپیٹل لاہور، پشاور اور اب کراچی اس کی مثالیں ہیں۔ میں ہمیشہ اپنی تحریوں میں یہی زور دیتا ہوں کہ معاشرہ کی ترقی کی تکون صحت، تعلیم اور عدل ہے۔ عمران خان عدل کے لیے سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں جبکہ صحت عامہ کے لیے انہوں نے شوکت خانم کی صورت میں پاکستانی عوام کے لیے گراں قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ تعلیم و تحقیق کے میدان میں انہوں نے نمل کالج قائم کرکے ایسا عظیم کام سرانجام دیا ہے کہ جس کی تعریف بھی ممکن نہیں۔ میاں والی کے پسماندہ علاقہ

میں دشوار گذار علاقہ میں علم و حکمت کے پھول اگانے میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کی ہمشیرہ اور نمل کالج کے بورڈ آف گورنر کی رکن محترمہ علیمہ خانم شاک ہوم تشریف لائیں اور جب وہ شرکاء کو نمل کالج کی تفصیل بصری سلائیڈوں سے دیکھا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا یہ کس قدر مشکل کام تھا جس کا بیڑا اٹھانے کا انھوں نے ذمہ لیا۔ ۲۰۰۸ء میں اس کی ابتداء کی جہاں نوے فیصد طالب علم مفت تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور انہیں ڈگری بریڈ فورڈ یونیورسٹی کی ملتی ہے۔

Namal نمل کالج کا قیام اپنی جگہ ایک عظیم کارنامہ ہے لیکن اس سے بھی اہم کام وہاں Knowledge City قائم کرنے کا منصوبہ ہے جو میرے نزدیک بغداد میں قائم بیت الحکمت کا اجراء ہے۔ اس نالج سٹی میں بھی بیت الحکمت کی طرز پر سائنس، زراعت، طب، انجینئرنگ، ادب، بزنس اور ٹیکنالوجی پارک شامل ہے۔ اس منصوبے کی تعمیر کا آغاز گذشتہ سال سے ہو چکا ہے اور ۲۰۲۰ء میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ اس بیت الحکمت میں چھ سکول مل کر علم و تحقیق کی دنیا میں اپنا نام پیدا کریں گے۔ محترمہ علیمہ خانم سے اس منصوبہ کے بارے میں گفتگو کرکے امید کی کرن نظر آئی جس کے ہم سب منتظر ہیں۔ اُن سے ایک گذارش بھی کہ نمل کالج میں صرف تعلیم ہی نہ دی جائے بلکہ تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے جس کا ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی فقدان ہے جس سے انہوں نے مکمل اتفاق

کیا۔ عمران خان کی طرح وہ بھی فکر اقبال کی شیدائی ہیں اور انہوں نے مجھے یہ دعوت بھی دی کہ نمل کالج جا کر وہاں لیکچر دوں جو میرے لیے بہت عزت افزائی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام تر سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان کے عوام اور حکومت نمل کالج اور نالج سٹی کے منصوبہ میں تعاون کریں کیونکہ اس سے فائدہ کسی ایک سیاسی جماعت یا علاقہ کے طلبہ نے نہیں اٹھانا بلکہ پورے ملک کو اس کا فائدہ ہوگا۔ بیرون ملک مقیم لوگوں کو اس منصوبہ کی بھرپور مالی معاونت کرنی چاہیے جو پاکستان کا مقدر سنوارنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ انشاء اللہ

ابھرتے سورج کی سرزمین میں (حصہ اول

اس سال تعطیلات گذارنے کے لیے چین کا انتخاب تو اہلیہ نے جاپان جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر چین جارہے ہیں تو کیوں نہ جاپان سے بھی ہوآئیں کیونکہ دونو ں ایک دوسرے کی قریب ہی واقع ہیں اور پھر بچپن سے جاپان دیکھنے کی خواہش ہے۔ تو پھر کیوں کا سوال ہی نہیں تھا کہ بیگم کی خواہش کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا تھا، سو جانے کی تیاری کرنے لگے تو صاحبزادے نے بھی جانے پر اصرار کیا اس طرح ہمارا تین رکنی وفد سویڈن سے .براستہ دوہا، ٹوکیو کے لیے روانہ ہوا۔ جانے سے قبل سویڈن میں مقیم چین اور جاپان کے ملنے والوں نے وہاں گرم موسم سے خبردار کیا لیکن وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ کوئی ایسی شدید گرمی نہ تھی۔ دوہا سے جب جہاز نے ٹوکیو کے لیے اڑان بھری تو پاکستانی فضا میں سے ہوئے سیالکوٹ کے قریب سے گذرے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان کی فضا میں سے گذرے لیکن سرزمین پاکستان پر نہ اترے۔ ہمارے لیے یہ بھی پہلا موقع تھا کہ بھارتی فضا میں سے گذرے۔ ساڑھے دس گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز ٹوکیو کے ہانیدا کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ پر اُترا۔ کسی بھی ملک میں پہلا تجربہ بہت اہم ہوتا ہے چاہے یہ اچھا ہو یا ناخوشگوار۔ جہاز کسے نکلتے ہی دروازے پر ہمیں ایسا خوشگوار تاثر ملا کو آج تک کسی ملک میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ جونہی جہاز سے

باہر قدم رکھا تو ایک باوردی پولیس آفیسر ہر مسافر کو سلوٹ کرکے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ جاپان میں آنے والوں کا اس انداز سے استقبال ایک نہایت خوشگوار اور آداب کا اظہار ہے۔ اپنے دورہ کے دوران ہمیں یہ احساس ہوا کہ جاپانی بہت باخلاق، مودب اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ سلام بھی جھک کر کرتے ہیں اور اگر خریداری کریں تو بل اور بقایا ریزگاری ایک چھوٹے سے ٹرے میں رکھ کر دیتے ہیں۔ کئی جاپانی منہ پر مساک چڑھائے ہوتے ہیں تاکہ کود کو ماحولیاتی آلودگی سے بچائیں اور دوسروں کو بھی اپنے جراثیم سے محفوظ رکھیں۔ ہوائی اڈہ پر عزیزم شاہد مجید ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے جو ایک طویل عرصہ سے جاپان میں مقیم ہیں اور اُن سے میری ملاقات بھی کوئی بیس سال بعد ہوئی۔ ہوائی اڈہ سے ہوٹل جانے کے لیے ٹیکسی لی جس کا کرایہ سویڈن جیسا ہی تھا۔ جاپان بھی سویڈن کی طرح مہنگا ملک ہے لیکن کئی چیزیں سویڈن سے بھی سستی ہیں جیسے مقامی ذرائع آمدورفت اور کھانا پینا وغیرہ۔ جاپان کرنی تبدیل کروانا یورپ بلکہ پاکستان کی طرح نہیں ہے بلکہ وقت طلب اور تھوڑا پیچیدہ ہے جس کا تجربہ ہمیں ائیرپورٹ پر ہوا۔ کرنسی تبادلہ کے لئے باقاعدہ ایک فارم پر اپنی تفصیلات دی جاتی ہیں جسے پہلے کھڑکی پر موجود شخص دیکھتا ہے پھر اپنے افسر کو دیتا ہے وہ چیک کرکے پھر دوبارہ اُسے دیتا ہے اور یہی کام پھر ہوتا ہے جب انہیں کرنسی نوٹ دیے جاتے ہیں اس طرح روایتی انداز اب بھی انہوں نے اپنایا ہوا ہے۔

ٹوکیو دنیا کا سب بڑا شہر ہے ، بلند و بالا عمارتیں ، منظم نظام ، صفائی اور اچھے شہری اس کی پہچان ہیں۔ زیر زمین ریلوے کا بہت شاندار انتظام ہے۔ نابیناؤں کے لیے خصوصی راستے بنے ہوئے ہیں۔ جاپان میں مقیم معروف صحافی، مصنف اور اردو نیٹ جاپان کے مدیر اعلیٰ ناصر ناکاگاوا شہر کی سیاحت کے لیے ہمارے رہبر تھے۔ وہ بہت باخلاق، مہمان نواز اور کھرے انسان ہیں۔ مشرق بعید بلکہ دنیا بھر میں اردو کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں اور دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ جند ماہ قبل جب وہ سویڈن تشریف لائے تو مجھے ان کی میزبانی کا بھی موقع ملا اور کئی تفصیلی نشستیں ہوئیں۔ وہ پہلے پاکستانی مرد ہوں گے جنھوں نے شادی کے بیوی کے نام کے ساتھ اپنا نام لگانے کی بجائے بیوی کا خاندانی نام ناکاگاوا اپنے نام کے ساتھ ایسا لگایا کہ اب یہ نام اُن کی پہچان بن گیا ہے۔ اُن کی اہلیہ اور خوش دامن سے ملاقات بھی ہوئی اور انھوں نے روایت جاپانی مہمان نوازی اور خوش خلقی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ناصر ناکاگاوا نے ٹوکیو شہر کی سیاحت کے حوالے سے بتایا کہ شہر کا قدیمی علاقہ آساکوسا سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہے جو بدھ مت مذہب کا گڑھ بھی ہے اور جاپان کی ثقافت بھی وہاں دیکھنے کو ملے گی۔ آساکوسا میں یک میلے کا سماں تھا اور بارش کے باوجود سیاحوں کی بہت بڑی تعداد وہاں گھوم پھر رہی تھی۔ بہت سی جاپانی خواتین بھی اپنے روایتی لباس میں وہاں نظر آئیں۔ پرانی عمارتیں جو

جاپان کے عہد قدیم کی گواہ ہیں، دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ روایتی کھانے پینے کے سٹال اور خرید وفروخت کی اشیاء سب کچھ موجود تھا۔ بدھ مت کی درگاہ پر سیاحوں اور زائرین کا رش تھا اور وہاں ہونے والی سرگرمیوں کا دیکھ کر بالکل ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئی برصغیر کی درگاہ ہے۔ کوئی مقدس پانی سے ہاتھ منہ دھو رہا تھا اور کسی جگہ کسی اور تبرک سے فیض یاب ہونے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ایک جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا جس کے اردگرد لوگ اپنے عضا کو دھویں سے مس کررہے تھے تاکہ درد اور دیگر بیماریوں سے نجات مل سکے۔ کہیں لوگ منتیں مانگ رہے تھے اور دھاگے باندھ رکھے تھے۔ تعویز بھی خوب بک رہے تھے اور اُن کی قیمت خواہش اور کام کے اعتبار سے متعین تھی۔ ہماری درگاہوں کی طرح زائرین یہاں بھی نذرانے دے رہے تھے۔ محبوب کو رام کرنے کے لئے بھی وہاں اشیاء دستاب تھیں جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں کا خوب رش تھا۔ جاپانی ایک ترقی یافتہ قوم ہونے کے باوجود اس طرح کی تواہمات پر اس قدر عمل کیسے کرسکتے ہیں۔ جب ناصر ناکاگاوا سے میں نے یہ پوچھا انہوں نے بتایا کہ وہ ہمارے لوگوں کی طرح پختہ یقین کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ اسے سرسری اور غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ شہر کا یہ وسطی علاقہ بہت پررونق اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وقت کی کمی اور بارش کے باعث ٹوکیواسکائی ٹری نہ دیکھ سکے جو ۶۳۴ میٹر بلند ہونے کی وجہ سے جاپان کا سب سے بلند اور بُرج الخلیفہ کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا ٹاور ہے۔ اگلے روز شاہد مجید کے ساتھ ٹوکیو ٹاور

دیکھنے سے کسی حد اس کمی کی تلافی ہو گئی جس کا احوال اگلے ہفتے۔

صدر بنایا ہے تو کردار بھی دیں

شائد اسلام آباد نے یہ محسوس کر ہی لیا ہے کہ وہ خود عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو موثر انداز میں نہیں اٹھا سکتا ہے اور نہ اس بارے میں دنیا کی حمایت حاصل کر سکا ہے۔ پالیسی سازوں کو ممکن ہے اس بات کی سمجھ آ ہی گئی ہے کہ دنیا کشمیر کی بات جب کشمیریوں کی زبان سے سُنتی ہے تو اس پر توجہ بھی دیتی ہے لیکن جب پاکستان بین الاقوامی دنیا میں کشمیر کی بات کرتا ہے تو اُسے کوئی شنوائی حاصل نہیں ہوتی اور دنیا اسے پاک بھارت تنازعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے ممکن ہے اسی وجہ کے پیش نظر آزاد جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والے سابق سفیر جناب مسعود خان کے نام قرعہ فال نکلا اور وہ آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر کے صدر کے عہدہ پر فائیز کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک مستحسن فیصلہ ہے اگرچہ انہیں صدر بنانے کے طریقہ کار پر بہت سے تحفظات ہیں اور انتخابی عمل شروع ہونے کے بعد کسی بھی شخص کے ووٹ کا اندراج غیر قانونی عمل ہے جس پر الیکشن کمیشن نے بھی فیصلہ دیا۔ جو سہولت مسعود خان کو دی گئی ہے کیا آزاد کشمیر کے باقی شہریوں کو بھی حاصل ہو سکتی ہے؟ فیصلہ سازوں میں دور اندیشی کا فقدان ہے اور وہ عجلت میں فیصلے کرنے کے عادی ہیں۔ قانونی تقاضوں کو بہت پہلے پورا کر لینا چاہیے تھا تاکہ صدر ریاست کے انتخاب سے قبل ہی جو صورت حال پیدا ہوئی تھی وہ سامنے نہ آتی۔ بحر حال اب

یہ سارا عمل مکمل ہو چکا ہے اور جناب مسعود خان صدر ریاست ہیں اس لئے اب آگے دیکھا ہو گا کہ وہ کیا کردار ادا کریں گے۔ اپنے ایک گذشتہ کالم میں بھی ان کی بابت لکھا تھا کہ وہ وہ چین اور اقوام متحدہ میں سفیر رہے ہیں اور وزارت خارجہ میں طویل عرصہ ملازمت کی وجہ سے بین الاقوامی حالات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار اور مشکل صورت حال میں بھی کام کرنے اور اپنا نقطہء نظر پیش کرنے کی خوبیوں کے حامل ہیں۔ وہ بہت ذہین، معاملہ فہم اور اپنا نقطہ نظر موثر انداز میں فریق ثانی کو سمجھانے کی خوبیوں کے حامل ہیں۔ صدر آزاد جموں کشمیر کی حیثیت سے وہ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو بہتر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

ایک غیر سیاسی شخص کو صدر آزاد جموں کشمیر بنانے کے پیش نظر جو حکمت عملی اور منصوبہ بندی ہے اُسے فعال بنانے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں جب صدر بنایا ہے تو انہیں کردار بھی ادا کرنے دیں۔ کشمیر کے حوالے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی دنیا کو متاثر نہیں کر سکی ۔ دوسری جانب پارلیمانی کشمیر کمیٹی ایک کاغذی ادارہ ہے جو سیاسی رشوت کے طور پر دی جاتی ہے کیونکہ کشمیر کمیٹی کے صدر کا عہدہ ایک وفاقی وزیر کے برابر ہے اور یہ مراعات دے کر سیاسی مخالفوں کا منہ بند کیا جاتا ہے۔ اس لئے بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لیے وزارت خارجہ اور کشمیر کمیٹی کا مینڈیٹ صدر آزاد

کشمیر کا دیا جائے جو عالمی سطح پر بہت بہتر اور موثر انداز میں سرانجام دے سکتے ہیں۔
وزیر خارجہ کی عدم موجودگی میں تو یہ اور بھی ضروری ہے۔ پارلیمانی کشمیر کمیٹی ختم کرکے اس کے چیئرمین اور دیگر عہدیداران کو کوئی اور عہدہ دے کر مراعات کو جاری رکھا جاسکتا ہے تاکہ وہ نہ بے روزگار ہوں اور نہ ہی حکومت مخالف ہوں۔ صدر ریاست آزاد جموں کشمیر کو بحر صورت مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اٹھانے کا کردار دینا ہی وقت کا تقاضا ہے۔ پاکستان اپنے دوست ممالک میں آزاد جموں کشمیر کے دفاتر قائم کرکے انہیں مسئلہ کشمیر کی ترویج کی ذمہ داری دی جاسکتی ہے۔ بیرونی ممالک میں پہلے سے قائم کشمیری تنظیموں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ جناب مسعود خان کی بھی صلاحیتوں کا بھی امتحان ہے کہ وہ کچھ کرتے ہیں یا محض نمائشی صدر کی حیثیت سے اپنی مدت پوری کرکے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہ مسئلہ کشمیر اور عالمی رائے عامہ کو بہت بہتر سمجھتے ہیں۔انہیں مسئلہ کشمیر کو پاک بھارت تنازعہ سے ہٹ کر کشمیری عوام کے غیر مشروط حق خود آرادیت کی بنیاد پر عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ کشمیر میں بہنے والے خون اور جاری تحریک کو سفارتی محاذ پر سرگرمی سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی وقت نہیں اور امید یہی ہے نو منتخب صدر ریاست کشمیری قوم کی بہتر طور پر ترجمانی کریں گے اور اُن کی توقعات پر پورا اُتریں گے۔

ڈاکٹر کسانہ صاحب کی خدمت میں مفت مشورہ

سائیں رحمت علی ناتھن شاہی ۔ سٹاکہولم سویڈن

عارف محمود کسانہ صاحب سے کافی پرانی یاد اللہ ہے ۔ تمام تر مصروفیات کی بنا پر کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جاتی ہے ورنہ اکثر فون پہ تمام شکایتیں سنا دیتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب حوصلہ سے سب کچھ سن بھی لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی حکم صادر کر دیتے ہیں کہ سائیں جی مشورے اور تنقید کو ضابطۂ تحریر میں لے آئیں تو رہنمائی ہوگی ۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اپنے قیمتی وقت کو کسی کی رہنمائی میں ضائع کروں ۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میرا اکثر وقت فضولیات میں گذرتا ہے ۔ تنقید برائے تنقید کرنا، کسی کی عیب جوئی کرنا، ہر اچھے کام میں کیڑے مکوڑے نکالنا اور برے کام میں مزید کیڑے ڈالنا میرے پسندیدہ مشاغل میں سے ہے ۔ لسٹ تو بہت لمبی ہے مگر امید ہے کہ قارئین کرام کے لئے میرا اتنا سا تعارف کافی ہوگا ۔ اپنی تنقید کو تحریری شکل نہ دینے کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی حوصلہ شکنی ہوگی بلکہ وجہ یہ تھی کہ مجھے اردو عبارت لکھنے میں بہت دشواریاں پیش آتی ہیں اور خاص طور پہ اگر کمپیوٹر پہ عبارت لکھنے کو کہا جائے ۔ اس کے علاوہ اردو میں تین مرتبہ فیل ہونے کی وجہ سے میرے اساتذ محترم نے مجھ سے اردو نہ لکھنے کا عہد لیا

تھا۔ ایک ہونہار شاگرد ہونے کے ناطے اس عہد وپیاں کو نباہ رہا ہوں اور اسی لئے یہ مضمون کسی اور سے لکھوایا ہے۔

ایک دفعہ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو گئی اور موقع غنیمت جانتے ہوئے یہ سب کچھ آپکی خدمت میں گوش گذار کردیا مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ میرے تمام ترعیوب کے باوجود مجھے اہل دانش و قلم گردانتے ہیں۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ جہاں اتنے الزامات ہیں وہاں ایک اور صحیح۔ اپنی اس غلط فہی کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اپنے ھفتہ وار کالم بھیتجے رہتے ہیں۔

کوئی تین ماہ قبل ڈاکٹر صاحب نے اپنے تمام کالمز کا مجموعہ افکار تازہ کے نام سے شائع کروایا اور اپنی کتاب کی تقریب رونمائی میں اس حقیر کو فقط مدعو ہی نہیں کیا بلکہ تقریر کرنے کا حکم بھی بھی صادر فرما دیا۔ اب میں نے بھی دل کھول کر اوٹ پٹانگ مارا اور نہایت ہی فضول قسم کی تقریر کرکے حاضرین محفل کو اچھی طرح بور کیا۔ امید تو بہت ہے کہ آئیندہ مجھے بلانے کی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔

بات ڈاکٹر صاحب کی تحریر پہ تنقید کی ہو رہی تھی لیکن میں جوش خطابت میں دور نکل گیا اور اللہ اللہ کرکے جلدی واپس لوٹ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے کالمز

جیساکہ عرض کیا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود پڑھ لیتا ہوں۔ آپکے کالمز میں روانگی ہوتی ہے اور اپنی تحریر میں عنوان کی مطابقت کے ساتھ حقائق بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو اس واقعہ کے تمام تر محرکات پہ بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ یورپ میں پاکستانیوں کو خصوصی طور پر اور غیر ملکیوں کو عمومی طور پر جو مسائل درپیش ہیں اس پہ سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ آپ معاشرے کے تمام تر پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر کسی تاریخی واقعہ پہ قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا تجزیہ کرتے ہیں مگر کسی ہچکچاہٹ یا تذبذب کے بغیر اپنا نقطہء نظر بھی واضع کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے واقعہ کربلا پہ ایک نہایت ہی دلچسپ مضمون لکھا۔ اس مضمون میں آپ نے جذباتی روایت سے ہٹ کر حضرت امام حسینؑ کے قیام کے محرکات پہ تفصیل سے گفتگو کی اور ساتھ ساتھ یہ بھی واضع کیا کہ یزید پلید نے اپنے مختصر سے دور حکومت میں دین اسلام پہ کون کون سے مظالم ڈھائے۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب جب سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پہ لکھتے ہیں تو صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ ساتھ ساتھ حل بھی تجویز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بچوں کے مسائل سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اور اسی لئے آپ نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ آپ دین اسلام کو جذبات اور عقیدت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ آپکے نزدیک کلمہ توحید و رسالت پڑھنا دینی

عقیدت نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا نام ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کو صرف ثواب کی حد تک نہیں رکھتے بلکہ آپ قرآن کے عین مطابق دعوت غور و فکر دیتے ہیں اسی لئے آپ نے ہفتہ وار قرآنی سٹڈی سرکل کا اہتمام کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے احباب آپکی تمام کاوشوں کو تعریفی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مزید کاوش کی دعا بھی دیتے ہیں۔ ان تمام کارہائے نمایاں کے باوجود ڈاکٹر صاحب اپنی تحریروں میں بسا اوقات (دانستہ یا نادانستہ) نہایت سخت الفاظ کا استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ شکوہ فقط اس فقیر نے ہی نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب نے بھی کیا۔ کسی نے سویڈن کو دیار غیر لکھ دیا ڈاکٹر صاحب نے اس پہ بھی تجزیہ کر ڈالا۔ بھئی اگر ہمیں چالیس چالیس سال یہاں رہتے ہوئے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ اگر ہمارے بچے یہاں کے سکولوں میں پڑھتے ہیں تو کیا ہوا؟ اگر ہمارے بچوں کے بچے یہاں پیدا ہو گئے تو کیا ہوا؟ اگر حکومت ٹیکس میں کمی بیشی کرتی ہے تو بھلا ہمیں کیا لینا دینا؟ اگر اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو ہماری صحت پہ کونسا برا اثر پڑتا ہے؟ اگر ہمارے گھر سے نزدیک سڑک ٹوٹ جائے تو کون سی مشکل ہے؟ ڈاکٹر صاحب آپ خود ہی فرمایئے کہ مندرجہ بالا حقائق کے باوجود کیا سویڈن دیار غیر نہیں؟ ہم نے دفن بھی سویڈن میں ہی ہونا ہے تو اس سے دیار غیر کا لیبل اتر جائے گا؟ بلکل نہیں۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ سویڈن کے متعلق اپ ڈیٹ انفارمیشن کے سیاپے

میں پڑیں۔ گھر میں ٹی وی ہے جس پہ انڈیا و پاکستان کے ڈرامے اور فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس لئے آپ سے گذارش ہے کہ یورپ، امریکہ اور کنیڈا میں رہنے والے پاکستانیوں کو واعظ و نصیحت کریں کہ بھائی ہم دیار غیر میں رہتے ہیں اور آپ بھی سویڈن کو یہی کچھ سمجھیں۔

حال ہی میں یوم آزادی کے موقع پر آپ نے پاکستانی مایہ ناز سیاستدانوں پہ یلغار کر دی۔ واقع کچھ یوں ہے کہ تیرہ اگست کو سویڈن کی ایک وزیر مستعفی ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ مذکورہ نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے پکڑی گئی۔ وزیر محترمہ نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے وزیر اعظم کی خدمت میں استعفیٰ پیش کر دیا۔

اب اس واقع کا پاکستان کے سیاستدانوں سے کیا تعلق؟ پہلی چیز تو پاکستان کے رہنما خود گاڑی چلاتے ہی نہیں اور دوسرا یہ کہ اتنی کم مقدار میں شراب پینے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ آپ نے بیس کروڑ عوام کو مردہ قرار دے دیا لا حول ولا۔ نعرے بھی تو زندہ لوگ ہی لگاتے ہیں نا۔ جلسے جلوس، دھرنے، سیاسی و مذھبی اجتماع اور نعرے بازی کیا قبرستان میں ہوتے ہیں؟ ہمارے وزرا بھی اتنی چھوٹی سی غلطی پہ استعفیٰ دے دیں، تو ملک کون چلائے گا جی؟ ہمارے وزرا اتنے سمجھدار ہیں کہ بڑی سے بڑی غلطی پہ بھی مستعفی نہیں ہوتے اور بڑے حوصلہ کے

ساتھ تنقید کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پناما لیکس بھی یہود و نصارا کی ایک سازش ہے جس کے تحت فرزندان امیر المومنین کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی رہنما ہیں جو آرام سے گھر چلے جائیں۔ رہنما میدان کارزار میں تلوار بکف ہیں۔ آپ نے جے آئی ٹی اور کمشن بنانے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ڈاکٹر صاحب اگر ایسا نہیں ہوگا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیسے ہوگا؟ ہمارے رہنما کلین چٹ لینے کے لئے اب یہ بھی نہ کریں؟ بارہ مئی، سانحہ ماڈل ٹاون اور دیگر واقعات میں اگر ایک یا دو کانسٹیبل کو معطل کر دیا تو کیا ہوا؟ کیا کسی بڑے افسر کو معطل کیا جاتا؟ اس سے تو ہماری پولیس فورس کا مورال ڈاون ہو جائے گا جس سے اس مقدس ادارے کی کارکردگی پہ نہایت ہی برے اثرات پڑیں گے۔ آپ نے رہنماوں کو لٹیرے لکھا ہے جو کہ ایک نہایت ہی ناشائستہ لفظ ہے۔ کذاک ذرا ادبی لفظ ہے یہ لکھنا چاہئے تھا۔ قانون شکن اور کرپٹ جیسے نامناسب الفاظ استعمال کرکے آپ نجات دہندگان ملت کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہمارے رہبران کے ہاتھ میں کوئی ہتھوڑا نہیں پکڑا ہوا جس سے قانون توڑیں بلکہ اس سے تو ریل کی پٹری اور گٹر کے ڈھکن توڑ کر اتفاق کی بھٹیوں میں ڈھال دیتے ہیں تاکہ مارکیٹ میں صارف کو اصلی مال میسر ہو اور ملاوٹ شدہ نہ ہو۔ مجھے یقین ہے اس تشریح کے بعد آپ اس کار خیر کو نگاہ تحسین سے دیکھیں گے۔ کرپٹ کی جگہ اگر الراشی لکھتے تو ذرا بہتر معلوم ہوتا۔ آخر میں لیڈران کو چلو بھی پانی میں ڈوب کر مرنے کا مشورہ دیکر بے عزت کرنے کی آپ نے حد ہی

کر دی۔ بھلا کیا ہمارے رہبران اس قابل ہیں؟ کم از کم آپکو ایک بڑی جھیل لکھنی چاہیے
تھی جس میں ذرا آرام سے ڈوب کے مرتے۔ بحر حال ڈاکٹر صاحب امید ہے میرے
مختصر سے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے آئندہ آپ ذرا نرم الفاظ کے ساتھ قوم و ملت
کے رہبران کی کلاس لیں گے۔

ابھرتے سورج کی سرزمین میں (حصہ دوم

حویلیاں شہر جو کہ ضلع ہزارہ کی تاریخ میں ایک روشن ماضی کے ساتھ اپنا ثانی نہ رکھتے ہوئے ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے، اس شہر میں زندگی کے جن بنیادی مسائل سے عوام دوچار ہے ان میں صحت کا مسئلہ ایک سنگین نوعیت کا بنتا جا رہا ہے۔ حویلیاں شہر کئی گاؤں کا بنیادی شہر ہونے کے ساتھ سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد کا واحد مقام تجارت و مقام سہولیات زندگی اسی شہر سے منسلک ہیں جن کے حصول کے لیے عوام کا رُخ اسی شہر کی طرف ہی ہوتا ہے، چاہے اس کے لیے ان کو کس قدر تکالیف برداشت کرکے ہی کیوں نہ آنا پڑے۔ اس شہر بے مثال میں 1968 کے اندر ہسپتال کا قیام کیا گیا تھا جو کہ اس وقت کی مناسبت سے بلکل ٹھیک اور اچھی RHC ایک اہمیت کا حامل ہسپتال تھا۔ مگر رفتہ رفتہ آبادی کے اضافے نے جدھر زندگی کے دیگر مسائل میں اضافے کے ساتھ صحت کے مسائل میں بھی دگنا اضافہ اس انداز میں کیا کہ حادثات میں زخمی یا کسی بھی ایمرجنسی مریض کو اس ہسپتال میں اکثر صرف ایک انجکشن کے علاوہ ایک ریفر سلپ کے ساتھ ابتدائی طبّی امداد اور ایک ٹاسک چند مختصر الفاظ کی شکل میں دیا جاتا ہے کہ: "جلد از جلد اپنے مریض کو ایوب میڈیکل کمپلیکس، ایبٹ آباد پہنچایا جائے نہیں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔" جس سلپ کو مریض کے لواحقین اپنے لیے زندگی کا انمول

چیلنج سمجھتے ہوئے جلد از جلد پورا کرنے کی کوشش اس انداز میں کرتے ہیں کہ جس طرح وہ سیف یا اولمپنگ گیمز کی کسی ریس میں حصہ لے چکے ہوں۔ان الفاظ کی تلخی، گہرائی، درد اور بے بسی کس قدر سخت ہوتی اس سے صرف مریض کے لواحقین ہی جانتے ہیں کیونکہ نہ ایبٹ آباد کا راستہ کھلا ملے گا اور نہ کمپلیکس آئے گی اور رفتہ رفتہ بمشکل ایبٹ آباد بڑے موڑ تک پہنچتے ہی مریض اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

پچھلے دنوں میرا پاؤں زخمی ہو گیا، چھوٹے بھائی کے ساتھ ہسپتال گیا تو ہسپتال کے عملے کا ایک لڑکا جو کہ شاید 20 سے 22 سال کا تھا پہلے تو ہماری طرف متوجہ ہی نہیں ہوا پھر مجھ کو بولا کہ اوہ چھوٹے۔۔۔!!! ادھر آؤ۔۔۔!!! مجھ کو تھوڑا تعجب بھی ہوا کہ شاید چھوٹے بھائی کو اس نے بولا مگر بھائی نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آپ سے مخاطب ہے، اب ایک تو میرے پاؤں میں درد تھا اور دوسرا میرا بحث کرنے کا موڈ نہ تھا، خیر میں گیا تو مجھ کو مزید حکم دیتے ہوئے بولا۔۔۔کہ یہ جو پٹی پاؤں پر کی ہوئی ہے اس کو کھولو۔۔۔!!! اب یہ میرا کام ہے۔۔۔؟؟؟ یا کہ اس کا۔۔۔؟؟؟ جس کو سرکار نے ہسپتال میں رکھا ہی اسی کام کے لیے ہے، ابھی میری حیرت ختم ہی نہ ہو پائی تھی کہ اس نے چھوٹے بھائی کو حکم دیا کہ جاؤ باہر میڈیکل سٹور سے انجکشن لے آؤ ہسپتال میں ختم ہو چکے ہیں۔۔۔!!! تب مجھ کو معلوم ہوا کہ واقعی لوگ جو قصے بیان

کرتے ہیں وہ سچ ہی ہیں۔ سٹاف کے نخرے اور ڈرامے انسان کو اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہتا ہے کہ "بھلا میں ادھر آیا ہی کیوں تھا"۔ بے حسی کی مثال تو یہ دیکھیں کہ تمام ڈاکٹروں نے اپنے اپنے کاروبار چمکائے ہوئے ہیں کسی کو پرواہ ہی نہیں ہے کہ وہ سرکاری ڈیوٹی سرانجام دے، ہر ایک کا اپنا پلازہ ہے، معمولی نوعیت کے ڈیلوری کیس کو سنجیدہ کیس بنانے میں ماہر اس قدر ہوتے ہیں کہ ایک مریض سے ہزاروں نہیں لاکھوں بٹورے جاتے ہیں، جب بات کی جائے کہ اس قدر بل کس چیز کا۔۔۔؟؟؟ تو جواب جو پہلے سے تیار ہوتا ہے کہ اتنی بڑی ہسپتال کے اخراجات بھی تو ہیں اور عوام بھی اس لیے چلی جاتی ہے کہ سرکاری ہسپتال میں سہولتیں نہ ہونے کا بہانا ڈال کر ان کو ڈرایا جو جاتا ہے، یہ واقعات آئے روز، ہر خاص و عام اور ہر زندہ و مردہ کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔

دن بدن بڑھتی آبادی، ٹریفک کا ہجوم، حادثات کی شرح میں اضافہ، بڑھتی و رنگا رنگ بیماریاں، سہولیات کا فقدان، ڈاکٹروں اور طبّی امداد کی تعداد و معیار کی کمی ان سب کا آپس میں ایک نہ ٹوٹنے والا جوڑ ہے، جس کی طرف نہ کسی کی توجہ مرکوز ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے حالانکہ یہ وقت ان مسائل کے حل کرنے کا ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ حویلیاں کی عوام کے ان مسائل کی طرف کوئی نہیں سوچ رہا جبکہ اس شہر میں زیادہ تر اموات مرض یا

حادثات کی وجہ سے نہیں بلکہ ابتدائی طبّی سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے ہوتی ہے ہاں ادھر ہسپتال میں RHC معذرت کے ساتھ ایک بات بیان کرتا جاؤں کہ ہماری حویلیاں کی ہم کو ایک سہولت ضرور میسر ہے اور وہ پوسٹ مارٹم کی سہولت ہے، جس سے ہم انکاری نہیں کر سکتے اور اس سہولت کے ملنے پر ہم بڑے خوش بھی ہیں کہ کم از کم ہم کو اپنے مرُدے ایوب میڈیکل کمپلیکس لے کر نہیں جانے پڑتے مگر ہمیں اس سہولت کے میسر ہونے کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس مسئلہ کی طرف سنجیدہ ہو کر اگر نہ سوچا گیا تو ایک دن یہ ہسپتال صرف اور صرف مرُدوں کے پوسٹ مارٹم سے مشہور ہو جائے گی، اس ہسپتال کی جدید و عمدہ عمارت کے مطابق ہماری اس ہسپتال کو اپ گریڈ کرکے عوام کو صحت کی ابتدائی سہولیات سے آراستہ کیا جائے تاکہ ہمارے مریض ایبٹ آباد جاتے ہوئے زندگی کی کشمکش میں ہارجیت کا کھیل نہ کھیل سکیں اور نہ ہی ہمارے لواحقین سفر و ہجر کے مسائل سے دوچار ہو سکیں۔۔۔ہماری عوام کو بنیادی سہولیات سے آراستہ ہسپتال دینا ہمارا حق بھی ہے۔

سات دن چین میں

چین دیکھنے کا شوق اس وقت سے تھا جب اپنے اسکول کے دور میں ابن انشاء کا سفر نامہ چلتے ہو تو چین کو چلیئے پڑھا تھا۔ جاپان سے جب اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ساتھ بیجنگ کیپیٹل ایئرپورٹ پر پہنچے تو میرے دوست اور ہم جماعت شاہد مقصود وہاں ہمارے منتظر تھے۔ وہ چین میں پاکستانی سفارت خانہ میں سائنٹفک قونصلر کے عہدہ پر فائیز تھے ۔ ہماری ملاقات کوئی تیس سال کے بعد ہو رہی تھی۔ میٹرک کے بعد اسکول سے ایسے بچھڑے کہ بعد میں ایک دو بار ہی ملے ہوں گے۔ انھوں نے چین کی اوہان یونیورسٹی سے انجنیئرنگ کی ڈگری کی اور ساتھ ہی چینی زبان میں مہارت بھی حاصل کی۔ ملتے ہی ہم نے اس دور کو یاد کیا جب ابن انشاء کا چین چلنے کا پڑھا تھا اور معلوم نہ تھا ایک طویل مدت بعد ہماری ملاقات بھی وہیں ہو گی۔ چینی دارالحکومت بیجنگ بہت بڑا شہر ہے۔ حکومت نے ٹریفک کے مسئلہ سے نپٹنے کے لئے منصوبہ بندی کر رکھی ہے اور گاڑیوں کی رجسٹریشن کے لحاظ سے ہر روز ایک مخصوص نمبر والی گاڑیوں کو سڑک پر آنے کی اجازت نہیں اور ساتھ ہی بیجنگ سے باہر والی گاڑیوں کے بھی شہر میں داخلے کے اوقات مقرر ہیں۔ چین اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ مغربی تہذیب کی گہری چھاپ ہر شعبہ زندگی میں نمایاں ہے ۔ کھانا پینا، لباس اور طرز معاشرت سب بدل گیا ہے۔ غیر ملکی برانڈ کی اشیاء بہت

مہنگی ہیں بلکہ یورپ سے بھی ان کی قیمتیں زیادہ محسوس ہوئیں البتہ مقامی اشیاء، کھانا پینا اور سفر بہت سستا ہے۔گاہک چینی دوکانوں پر تو بھاؤ تاؤ کرکے دام کم کرتے ہیں۔ خریداری کے لئے نقد رقم ساتھ ہونا ضروری ہے کیونکہ ویزا اور ماسٹر کارڈ بہت کم جگہوں پر قبول کیئے جاتے ہیں۔ مضافاتی علاقوں میں کچی بستیاں اور کوڑے کے ڈھیر بھی دیکھنے کو ملے۔چین نے ثابت کیا ہے کہ فیس بک، گوگل اور یوٹیوب کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ بیجنگ میں مقامی سفر کے لئے بس کی یک طرفہ ٹکٹ صرف سولہ روپے پاکستانی ہے۔ بیجنگ کا مرکزی علاقہ، تھیان آن مین سکوائر بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ ماؤزے تنگ مقبرہ اور ایک بڑی تصویر یہاں سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ چینی کھانے کے ساتھ گرم پیتے ہیں۔ ائیرپورٹ پر بھی پینے کے لیے ابلتا ہوا پانی دستیاب ہے ۔ بیجنگ دیکھنے کے بعد صاحبزادے نے اصرار کیا کہ شنگھائی بھی ضرور جانا چاہیے جسے مشرق کا پیرس اور چین کا نیویارک کہتے ہیں۔بلٹ ٹرین جسے ہائی اسپیڈ ٹرین بھی کہتے ہیں ہم بیجنگ سے روانہ ہوئے اور تیرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ یعنی راولپنڈی سے حیدرآباد کا سفر صرف پانچ گھنٹے میں طے ہوا۔ بہت آرام دہ سفر کرتے ہوئے چین کی سرسبز سرزمین کو دیکھنے کا حسین موقع ملا۔ شنگھائی شہر ہانگ پو دریا کے دونوں جانب بلند و بالا عمارتوں کے ساتھ اپنے تابناک مستقبل کی نوید دے رہا ہے۔ یہ شہر نہ صرف چین بلکہ پوری دنیا کا اقتصادی مرکز ہے اور تمام عالمی بینکوں اور مالیاتی اداروں کے دفاتر یہاں موجود

ہیں۔ ٹورسٹ بسوں اور کشتی کے ذریعہ شہر کی سیاحت کے ساتھ تاریخی پس منظر سے بھی آگاہی ہوئی اور مزید تفصیل وہاں ہمارے میزبان شاہد باجوہ نے بتا دی۔ یہ ایک جدید شہر ہے جس کی تعمیر وترقی جاری ہے۔ یہ تعلیم و تحقیق اور معاشی و صنعتی شعبہ میں یہ دنیاکے لئے بہترین مثال ہے۔ شنگھائی تعاون کونسل اس وقت دنیا کا اہم ادارہ بن چکا ہے۔

چین میں اسلام کا تعارف حضور ﷺ کے صحابہ اکرام کے ذریعہ ہوااور دو صحابی رسولؐ اسی سرزمین میں آسودہ خاک ہیں۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کا روضہ چین کے شہر گونزاؤ میں ہے۔ طویل فاصلہ اور وقت کم ہونے کی وجہ سے ہم وہاں حاضری نہ دے سے۔ بیجنگ میں ایک چینی مسلمانوں کا علاقہ ہے اور حلال کھانے کی دوکانیں اور رسیتوران بھی موجود ہیں۔ بیجنگ قیام کے دوران وہاں پاکستانی سفارت خانہ میں میری کتابوں، بچوں کی دلچسپ کہانیوں اور افکار تازہ کی تقریب رونمائی میرے لئے بہت عزت افزائی تھی۔ سفارت خانہ پاکستان کے چانسری ہال میں منعقد ہونے والی اس پروقار تقریب میں اہم سفارتی شخصیات اور بیجنگ میں مقیم پاکستانی صحافیوں نے شرکت کی۔ سفارت خانہ کے سائنٹیفک قونصلر اور میرے ہم جماعت شاہد مقصود، پولیٹیکل قونصلر شوذب عباس اور ایجوکیشن اتاشی نوید حسن نے افکار تازہ کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ جناب شوذب عباس نے بہت علمی انداز میں کتاب پر تبصرہ کیا۔ ریڈیو چائینا انٹر نیشنل کی اردو سروس کے

محمد کریم احمد سے بہت مفید ملاقات رہی انہوں نے ریڈیو کے لئے تفصیلی انٹرویو بھی لیا۔

چین جائیں اور دیوار چین نہ دیکھیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ شاہد مقصود کی رہنمائی میں ہم دیوار چین کی سیاحت کے لئے نکلے۔ اگرچہ ان دنوں گرمی تھی لیکن اُس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ شاہد مقصود کی فیملی بھی ہمارے ساتھ تھی اور ابھی دیوار چین بیس کلومیٹر کی مسافت پر ہو گی کہ گاڑی خراب ہونے پر ہمیں ہائی وے پر ہی رُکنا پڑا۔ گاڑی چیک کی تو معلوم ہوا اب اس گاڑی پر سفر ممکن نہیں ہو گا۔ تھوڑی ہی دیر میں چینی پولیس کی گاڑی آ کر رکی اور انہیں ماجرا سُنایا۔ شاہد مقصود نے چینی زبان میں پولیس آفیسر سے جب بات کی اور اپنا تعارف کروایا کہ وہ پاکستانی سفارت کار ہیں تو پھر ہمارے لئے فوری طور پر پولیس کی دو گاڑیاں منگوائی گئیں اور دیوار چین تک چھوڑنے کا نہ صرف انتظام کیا بلکہ دوران سفر بار بار پولیس کنٹرول روم سے فون کر کے ہماری خیریت بھی پوچھی جاتی رہی۔ یہ ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ دیوار چین پر سیاحوں کا ہجوم تھا اور ہم ٹکٹ لے کر چیئر لفٹ سے دیوار تک پہنچے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً تین سو سال پہلے چین کے بادشاہ چن شی ہوانگ نے اپنے ملک کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ کرنے کے لیے شمالی سرحد پر ایک دیوار بنانے کی خواہش کی۔ دیوار چین کل لمبائی تقریباً اکیس ہزار کلومیٹر ہے

اور یہ بیس سے لے کر تیس فٹ تک اونچی ہے۔ چوڑائی نیچے سے پچیس فٹ اور اوپر سے بارہ فٹ کے قریب ہے۔ ہر دو سو گز کے فاصلے پر پہریداروں کے لیے مضبوط پناہ گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ خراب بھی ہوتی رہی اور اس کی تعمیر نو بھی ہوتی رہی۔ دیوار چین کے ایک حصہ کی تعمیر نو کے لئے پاکستان نے چین کو امداد بھی دی اور وہاں پر ایک تختی بھی لگی ہوئی جس پر حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔
دیوار چین دیکھنے کے بعد ہمیں ٹرین سے واپس آنا تھا لیکن جب ریلوے اسٹیشن پہنچے تو ہجوم دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے کہ ٹکٹ کس طرح لیں گے اور پھر گاڑی میں سوار کیسے ہوں گے۔ بڑی مشکل سے ٹکٹ تو لے لی لیکن پلیٹ فارم پہنچنے سے قبل ہی گیٹ بند کر دیا گیا۔ اب ہم اور بھی پریشان ہوئے کیونکہ اگلی گاڑی تین گھنٹے بعد روانہ ہونی تھی۔ یہ بہت حیرت ہوئی کہ سیاحوں کی سب سے بڑی دلچسپی کے مرکز سے گاڑیاں اتنی کم کیوں روانہ ہوتی ہیں۔ ہماری پریشانی اس وقت دور ہوئی جب شاہد نے وہاں کے عملہ کو اپنا تعارف کروایا تو ہجوم سے ہمیں نکال کر پلیٹ فارم تک جانے کی اجازت مل گئی۔ چین میں قیام کے دوران پاکستانی سفارت خانہ کے ڈاکٹر رضا اور کرنل جواد کے ہاں پر تکلف دعوتیں بھی ہوئیں جہاں فسٹ سیکریٹری جانب راجیل محسن، فنانس کونسلر جنید، پاک نیوی کے کیپٹن جناب شفاعت اور دوسروں سے بہت اچھی ملاقات رہی۔ ایک ہفتہ چین میں گذارنے کے بعد ہم براستہ دوہا واپس سویڈن پہنچے۔ ایک دن کے لئے قطر کے دارلحکومت دوہا کی سیاحت کا بھی موقع ملا۔ یہ

بہت خوبصورت اور تیزی سے ترقی کرتا ہوا شہر ہے۔ بہت سہولتوں سے آراستہ ہوائی اڈہ، واقعی بہترین ایوارڈ کا مستحق تھا۔۔ 2020ء اولمپکس کے لیے تعمیراتی کام تیزی سے جاری ہے اور میٹرو بھی تعمیر کی جارہی ہے۔ قطر نے اپنے ثقافتی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی طرف پوری توجہ دی ہے۔ دوہا سے محو پرواز ہونے کے چھ گھنٹوں بعد ہم اپنے شہر سٹاک ہوم پہنچ گئے۔

سینچری کا سفر (حصہ اول

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صرف عقلِ انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی بلکہ اسے رہنمائی کی ضرورت ہے جو وحی یعنی قرآنِ حکیم سے ہی مل سکتی ہے۔زندگی کے عملی مسائل اور مغربی معاشرہ میں قرآنی فکر سے رہنمائی کے لئے نومبر 2007ء میں کچھ احباب نے سٹاک ہوم سٹڈی سرکل تشکیل دیا تاکہ قرآنِ حکیم کو سمجھ کر اور اس پر عمل کرتے ہوئے سفر زندگی اس کی روشنی میں طے کیا جائے۔ یہ بھی ایک حسین اتفاق ہے کہ اس عظیم کام کا آغاز پیامبر قرآن، حکیم لامت علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر ہوا۔ نو سال سے قرآن فہمی کا یہ سفر مسلسل جاری ہے اور ایک سو دروس کی تکمیل سے اہم سنگ میل عبور کیا ہے۔ سینچری کا یہ سفر علمی و دینی افکار کی رہنمائی میں جاری رہا۔ سٹاک ہوم سٹڈی سرکل کے تعارف اور طریقہ کار کی تفصیل سابق وفاقی وزیر جناب ڈاکٹر غلام حسین نے افکار تازہ میں یوں لکھی ہے کہ " عارف کسانہ فہم قرآن میں بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ قرآن فہمی میں ان کا علم و فضل کافی عمیق ہے اور پُر تحقیق ہے۔ کافی سالوں سے وہ اپنے گھر میں ماہانہ محفل قرآن باقاعدگی سے منعقد کرتے ہیں جس میں موضوع پہلے دیا جاتا ہے اور اس موضوع کو قرآنی حوالوں سے بیان کرتے ہیں اس دینی محفل میں پڑھے لکھے پاکستانی شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ محفل کا آغاز عارف

کسانہ قرآنی آیات اور تفسیر کے ذریعے ٹی وی سکرین پر کمپیوٹر کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور دوستوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں اور پھر سب حاضرین باری باری موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بہت اچھے ماحول میں دو گھنٹے کی محفل میں ایمان تازہ کرنے اور قرآن فہمی کا موقع ملتا ہے۔ مجلس کے اختتام پر High Tea سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ ان محافل میں جو دوست باقاعدگی سے شمولیت کرتے ہیں وہ خود بھی صاحب علم و دانش ہوتے ہیں اور اکثر ہمارے پاکستان کے سفیر صاحب بھی تشریف لاتے ہیں۔پاکستان سے باہر ایسی دینی ، علمی محفلیں اللہ تعالیٰ کا خاص انعام اور رحمت باری تعالیٰ ہیں کہ ہم لوگ سویڈن میں رہتے ہوئے بھی اپنے دین اور کلچر کے قریب تر رہتے ہیں اور دین اسلام کے بارے میں سیر حاصل معلومات میسر ہوتی ہیں۔ہر نشست کے بعد اُس کی تفصیل ویب سائیٹ www.ssc.n.nu پر دی جاتی ہے اور ای میل کے ذریعہ دنیا بھر میں علم و دانش کے متلاشیوں کو بھیج دی جاتی ہے تاکہ وہ بھی فہم قرآن سے فیضیاب ہو سکیں۔اس ماہانہ مجلس میں دینی معاملات کے علاوہ فکر اقبال، سائنسی و تحقیقی موضوعات، سماجی معاملات، حالاتِ حاضرہ اور سیاسی امور پر بھی بحث ہوتی ہے اور صاحب علم دوست مختلف موضوعات پر اپنے مقالے بھی اس محفل میں پڑھتے ہیں اور پھر دیگر دوست اس پر تبصرہ کرتے ہیں''۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات کا اصول اپنایا گیا ہے یعنی ہم قرآن

حکیم کو مضامین کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک موضوع پر قرآن حکیم کی تمام آیات کو ایک نشست میں لیا جاتا ہے اوراس طرح سے متعلقہ موضوع کے بارے میں مکمل فہم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُن آیات کی مطابقت میں صحیح اور احسن احادیث مبارکہ بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اسوہ حسنہ اور تاریخ اسلام میں اگر اُن کی بابت کچھ موجود ہو تو اُسے بھی شامل کیا جاتا ہے۔ متعلقہ موضوع کے بارے میں علوم جدیدہ اور فکر اقبال سے رہنمائی درس کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ زندگی کے عملی مسائل بھی موضوع میں لازمی زیر بحث آتے ہیں۔ سیشن کا دسرا حصہ راؤنڈ ٹیبل ڈسکشن ہوتا ہے جس میں تمام شرکاء کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم پر غور وفکر اورزندگی کے عملی مسائل کا حل تلاش کرنے میں سویڈن میں موجود برصغیر سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانش جن میں ڈاکٹر، انجنئیر، ماہرین تعلم، سیاستدان، تاجر، طالب علم اور زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے احباب شرکت کرتے ہیں۔پاکستان کے علاوہ بھارت اور بنگلہ دیش کے صاحبان علم ودانش کا ایک حلقہ سٹاک وہم سٹڈی سرکل کی صورت میں قائم ہوگیا ہے جو دین کے حوالے سے فکری رہنمائی کرتا رہے گا۔فرقہ واریت، شخصیات اور غیر ضروری بحث سے اجتناب کیا جاتاہے۔ ان محافل میں شرکت کرنے والے اپنے پس منظر میں مختلف مکاتب فکر رکھتے ہوں گے لیکن کبھی بھی فرقہ وارانہ بحث اور ماحول پیدا نہیں۔جب قرآن کی دعوت دی جاتی ہے تو فرقوں کا کوئی تصور نہیں رہتا اور قرآن نے واضح کیا

ہے کہ وہ اختلاف مٹاتا ہے۔ ہر ماہ مہینہ دو گھنٹے کی یہ محفل قرآن فہمی کے ساتھ فکر اقبال اور اردو کے فروغ کے لئے بھی کوشاں ہے۔۔ اردو ہم عصر ڈنمارک کی نائب مدیرہ ہما نصر نے اپنے ایک تحقیقی مقالے '' سویڈن اور مسلمان'' میں ہماری اس کوشش پر کچھ اس طرح سے تبصرہ کیا کہ ''سٹاک ھولم اور اس کے مضافات میں اس سلسلے میں ڈاکٹر عارف کسانہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں جو نہ صرف اپنے ہم وطنوں بلکہ سویڈش حلقوں میں بھی اپنی اسلامی دینی و رفاعی اور سماجی خدمات کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف کسانہ دینی درس وتدریس کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو سویڈش سماج میں آگے بڑھانے کے لیے مختلف اجتماعات منعقد کرتے اور سویڈشوں کے ساتھ مشترکہ میل ملاپ کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے حلقے میں '' قرآن فہمی'' اور مسلمان بچوں کی '' دینی تعلیم '' کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور یہ حلقہ بتدریج وسیع ہوتا جا رہا ہے''۔

اردو نیٹ جاپان کے ایڈیٹر ناصر ناکاگاوا اپنے دورہ سویڈن کے دوران سٹڈی سرکل کی ایک نشست میں شریک ہوئے اور انہوں نے اس بارے میں اپنے سفرنامے میں لکھا کہ سٹاک ہوم سٹڈی سرکل کی ماہانہ نشست کا بنیادی مقصد قرآن کی روشنی میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا اور متعلقہ موضوع پر تبادلہ خیالات کرکے قرآن حکیم کی تعلیمات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل

کرنا ہے۔ یہ باعث مسرت ہے کہ تمام شرکاء وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہیں۔ نشست میں تعلیمی اور تحقیقی اداروں سے وابستہ اہم افراد شرکت کرتے ہیں۔ دو گھنٹے کی نشست میں قرآنی تعلیمات پر کھل کر تبادلہ خیالات ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کو محض برکت اور ثواب حاصل کرنے والی کتاب کے طور پر نہیں بلکہ عملی زندگی کی رہنماء کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس علمی نشست میں روایتی درس قرآن کی بجائے اہل علم ہمارے روزمرہ کے عملی اور زندہ مسائل کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں تلاش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ پاکستان اور عالم اسلام کے حالات کو اگر دیکھا جائے تو ٹاک ہوم سٹڈی سرکل جیسی علمی و عملی تنظیموں کی اشد ضرورت ہے۔ میرے لئے یہ ایک اعزاز تھا کہ میں ایک نشست میں شامل ہوا جس میں شرکت کرکے مجھے بہت خوشی ہوئی اور میرے حوصلے بلند ہوئے۔ (جاری)

(سینچری کا سفر (حصہ دوم

ان سو نشستوں میں ہم نے زندگی کے اہم اور زندہ مسائل کو لیا اور ہر ایک موضوع پر نشست منعقد کی۔ موضوعات کی تفصیل سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دین کے ہر گوشہ اور عملی زندگی کے ہر موضوع کو لیا گیا ہے نشستوں میں لئے گئے موضوعات کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔ اسلام اور سیکولر ازم، حدود اللہ، حج اور قربانی، پردہ، تعدادِ ازواج، آدابِ معاشرت اور اخلاق، آخرت، قیامت، حیات بعد الموت،،برزخ، حشر، عذاب و ثواب، اجتہاد، حلال و حرام، سود یعنی ربٰو، صلوٰۃ یعنی نماز، صوم یعنی روزہ، قرآن کی معاشی تعلیمات، زکوٰۃ، تقدیر، عائلی زندگی، نکاح، طلاق، عدت، عذابِ قبر، ایصالِ ثواب، مغفرت، شریعت، علم و عقل، قرآن اور سائنس، تخلیقِ کائنات، تخلیقِ انسان، تخلیق آدام، ارتقا، ابلیس، مومن، کردار، نبوت و رسالت، حضور قرآن کی روشنی میں، اسباب زوالِ اُمت اور حل، عورت قرآن کی روشنی میں، دُعا، عدل و انصاف، ظلم، توبہ، ختمِ نبوت، دہشت گردی، اھم قرآنی الفاظ اور اصطلاحات کے معنی اور مفہوم، حُرمتِ رسول، سائنس اور قرآن، ا، مور مملکت اور قرآن، سیرتِ رسولِ پاک سے میں نے کیا سیکھا جزا وسزا کا قرآنی قانون، تصورِ الہ، ہدایت اور گمراہی، آیات متشبہات اور محکمات، حقوق انسانی، مذہبی آزادی اور اعتدال، جہاد، درود شریف کا مفہوم اور مقام رسالت، لین دین اور تجارت

ماحولیات اور قرآن، فساد فی الارض، فرقہ واریت، خواب قرآن وحدیث اور جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں، جھوٹ بولنا، خوف خدا، محبت الٰہی اور محبت رسولؐ، تواہمات، انسان کے بارے میں قرآن نے کیا کہا، اسلام کیا ہے، ہم میں عمل کی کیوں کمی ہے، قرآن حکیم اپنے بارے میں، حلم، عفو، جہاد اور دہشت گردی، حریت آزادی شرک، روزہ کیوں فرض ہے، یورپ میں مقیم مسلمانوں کے مسائل اور قرآنی تعلیمات، میں اُن کا حل، عہد کا مفہوم، بگ بینگ، تخلیق کائنات اور قرآن، خدا نے کائنات کیوں بنائی، کائنات کیسے بنی، قرآن اور سائنس کی یکجائی، بدعت سے مراد، رسول اکرمؐ کی ولادت باسعادت، فضول خرچی، میل جول اور سلام کرنا، قوانین خداوندی، جہنم میں عوام اور لیڈروں کے مکالمے اور قرآن، روزے کا مقصد قرآن کی روشنی میں، فلسفہ تاریخ سورہ الشعراء کی روشنی میں، نزول قرآن اور خطبات اقبال، انداز گفتگو، اور گھریلو زندگی۔ بہت سے احباب کی خواہش ہے کہ ان تمام موضوعات پر ہونی والی نشستوں میں پیش کئے جانے والے مواد پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جائے جس سے وہ لوگ بھی استفادہ کر سکیں جو شرکت نہیں کر سکتے۔ یہ تجویز نہایت اہم ہے اور انشاء اللہ کوشش کریں گے کہ ان تمام دروس کو کتابی صورت میں پیش کیا جاسکے۔

سٹاک ہوم سٹڈی سرکل ایک سو سیشن مکمل ہونے کے موقع پر ایک بڑی تقریب منعقد کی گئی جس میں خواتین اور بچوں نے بھی شرکت کی۔ تقریب میں ڈاکٹر محسن سلیمی

جمیل احسن، حارث کسانہ، شفقت کھٹانہ ایڈووکیٹ، کونسلر برکت حسین، تیمور عزیز، سید شوکت علی، ڈاکٹر سہیل اجمل، سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر غلام حسین اور مہمان خصوصی کونسلر سید اعجاز حیدر بخاری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سٹاک ہوم سٹڈی سرکل نے قرآنی تعلیمات کے فروغ میں عظیم کردار ادا کیا ہے اور اس کے تحت ہونے والے ہر درس سے ہمیں قرآن حکیم کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر مضامین کے اعتبار سے قرآن حکیم کو سمجھانے کا سلسلہ نو سال سے جاری ہے۔ درس قرآن کے ساتھ فکر اقبال سے آگاہی اضافی خوبی ہے۔ ان محافل میں شرکت کرنے ان کے بہت سے سوالوں کے جواب ملے ہیں اور اسلام کے بارے میں کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔ سفیر پاکستان جناب طارق ضمیر نے صدارتی خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ قرآن حکیم پر غور وفکر اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش قابل تحسین ہے اور جس انداز میں یہ سلسلہ جاری ہے وہ ایک منفرد مثال ہے۔ روایتی انداز سے ہٹ کر قرآن حکیم کا فہم اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے مسائل کا تلاش کرنا قابل تحسین کوشش ہے اور یہ تقریب بہت سے حوالوں سے ممتاز ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ سٹاک ہوم سٹڈی سرکل بہت اہم کرادر ادا کر رہا ہے اور مجھے جب بھی موقع ملتا ہے اس کے تحت ہونے والے درس قرآن میں شرکت کرتا ہوں۔ انہوں بہت اہم بات کی کہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت میں قرآن ہمارے حق یا مخالفت میں گواہی دے گا۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ کہ کس طرح ہم اپنے حق میں گواہی لے سکتے ہیں۔

سٹڈی سرکل کے تحت مستقبل میں نوجوانوں اور خواتین کی تعلیم و تدریس اہم ترجیح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے مصروف عمل رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں میں عشق رسول اکرم ﷺ کی شمع روشن ہو اور ہم قرآن حکیم سے زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی لے کر اپنا سفر حیات طے کرتے جائیں اور ایک مرد مومن کی زندگی بسر کریں۔ ہم اپنے حصے کا کام کرتے جائیں کیونکہ

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کلام اللہ انسانوں کے لیے زمان و مکاں کے ہر دور میں رہنمائی ہے۔ یہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ یہ ہماری شاہراہ زندگی پر درست سمت میں سفر کے لیے ہمارا Navigator ہے۔

یہ کوئی عام خیال کے مطابق مذہبی کتاب نہیں بلکہ صحیفہ فطرت ہے جو انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرتی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسائل کو کتاب اللہ کی روشنی میں ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ کلام اللہ ہمارے پاس ہو بہو اسی شکل میں پہنچا جس

طرح وحی الٰہی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسے ترتیب دیا۔ یقین کامل، جہدِ مسلسل اور خلوص نیت سے فکری و ذہنی انقلاب ممکن ہے اور اللہ کی رحمت پر ایمان ہے کہ آنے والا کل انسانیت کے لیے بہتر ہوگا۔

ذرات کو سیمابی کردے گی سبک سیری چھٹ جائے گی رستے کی تاریکی و بے نوری

افکار تازہ ناروے میں

ڈاکٹر سید ندیم حسین۔ صدر ادبی تنظیم دریچہ ناروے
اوسلو، ناروے میں ڈاکٹر عارف محمود کسانہ کی کتاب افکار تازہ کی تقریبِ رونمائی)
(میں پڑھی گئی تحریر

میں دریچہ اوسلو کی طرف سے آپ احباب کو آج کی اس تقریب میں آمد پر خوش آمدید کہتا ھوں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ڈاکٹر عارف محمود کسانہ کتاب افکار تازہ کی ناروے میں رونمائی کا اعزاز دریچہ اوسلو کو حاصل ہورہا ہے۔ اس سے پہلے افکار تازہ کی رونمائی دنیا کے دوسرے ممالک مثلاً آسٹریا، سویڈن، جاپان، چین،ڈنمارک، اورہالینڈ وغیرہ میں ہو چکی ہے اس سے کتاب اور مصنف کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کتاب مصنف کی شخصیت کی آئینہ دار ھوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبّی تحقیق سء وابستہ ہیں اور ساتھ ہی اخبارات میں کالم لکھتے ھیں۔ ماہانہ درس قرآن دیتے ہیں۔ بہت اچھے مقرر ہیں۔ افکار تازہ ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کی خاص بات اس کا تنوع ھے۔ یعنی مضامین کی وسعت۔ اس میں قاری کو اقلیتوں کے حقوق کا ذکر ملے گا۔ عورتوں کے اسلام میں مقام کا تذکرہ ہے۔ ملکی سیاست پہ تبصرے بھی

ہیں۔ کشمیر کے بارے درد بھری باتیں ہیں۔ علامہ اقبال کا پیغام ہے۔ سائنس کی باتیں ہیں۔ اور آج کل کے سب سے گرم موضوع اسلام اور سیکولرازم پر بحث ہے۔ الغرض افکار تازہ کے گلدستے میں قاری کو سیاست، معاشرت، مذہب اور سائنس کے پھول ملیں گے۔ جن کی خوشبو الگ الگ ہے لیکن مصنف کے نزدیک منبع ایک ہی ہے یعنی قرآن حکیم۔ ڈاکٹر صاحب کوئی باریش مولوی نہیں۔ نہ ہی اسلام کے بارے میں ان کا فہم روایتی اسلام سے متاثر ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مصنف نے اپنی کتاب کا نام افکار تازہ رکھا ہے۔ جب ہم روایتی اسلام کو دیکھیں تو ان کا قرآنی پیغام واقعی ایک تازہ فکر لگتا ہے۔ مثال کے طور پہ اقلیتوں کے بارے میں لکھتے ہوئے انھوں نے متعدد آیات کا حوالہ دے کہ ثابت کیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ یہ اُن پہ کوئی احسان نہیں بلکہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ پاکستان جیسے مذہبی انتہا پسندانہ ماحول میں یہ بات کہنا جرات و ہمت کا کام ہے۔ پھر عورتوں کے تحفظ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”یہ کیسا معاہدہ (یعنی نکاح) ہے۔ کہ جو فریقین باہمی رضامندی سے کرتے ہیں لیکن جونہی معاہدے پہ دستخط ہوتے ہیں۔ ایک حاکم بن جاتا ہے اور

" دوسرا محکوم حالانکہ معاشرے میں ایسی کوئی شرط نہیں ہوتی۔
یہی سادہ سی بات ہمارے مذہبی حلقوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ تحفظ حقوق نسواں بل کی مخالفت میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت آسان زبان میں سمجھا دیا ہے۔ بشرطیکہ کوئی سمجھنے والا ہو۔ کیونکہ کسی چیز کا خوبصورت ہونا ہی کافی نہیں ہوتا اُسے دیکھنے کے لیئے دیدہ بینا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر جہاد، ختم نبوت، خدا کا تصور، اجتہاد اور قرآن فہمی کے بارے میں آپکے خیالات روایتی اسلام سے ہٹ کر قرآن اور دور حاضر کے عین مطابق ہیں۔ کتاب کی ایک اور خاص بات مصنف کی نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے والہانہ عقیدت ہے۔ مضامین "میرا پیغمبرؐ عظیم تر ہے" اور "حضور ﷺ اہل یورپ کے لیئے بھی رحمت" حضور نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں خوبصورت خراج عقیدت ہے۔ ان مضامین میں مصنف نے غیر مسلم مفکرین کے حوالے سے حضور نبی کریمؐ کی شان بیان کی ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے قاری دیکھتا ہے کہ مصنف ایک اور ہستی سے بھی والہانہ عشق میں مبتلا ہے۔ اور وہ ہیں حکیم الامت علامہ اقبال۔ حکیم الامت اور مصنف دونوں کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ لیکن اس محبت کی وجہ سیالکوٹ نہیں بلکہ مصنف کی قرآن سے وابستگی اور اقبال کی قرآن فہمی هے۔ وہ خود لکھتے هیں۔ (صفحہ نمبر 227) "علامہ اقبال کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلم قوم کو ایک بار پھر قرآن کی طرف رجوع کرنے کا درس دیا۔ اور

قرآن کو زندہ کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا اور اسی کی روشنی میں مسلمان قوم کی وضاحت کی"۔ کتاب کے بہت کم مضامین ایسے ہیں جن میں مصنف نے علامہ اقبال کے کسی شعر کا حوالہ نہ دیا ہو۔ مختصراً عرض ہے کہ افکار تازہ کا مصنف ایک سچا عاشق رسولؐ و قرآن ، حاکمیت الٰہی کا داعی ، بلا تفریق رنگ و نسل و جنس انسانیت اور انسانی قدروں کا پرچارک ، کشمیر و پاکستان کا وکیل اور قائد و اقبال کا فکری شاگرد ھے۔ وہ ایک درد مند دل رکھتا ہے۔ کبھی کالم لکھتا ہے۔ کبھی کتابیں لکھتا ہے۔ کبھی قرآن کا درس دیتا ہے۔ صرف اس لیئے کہ

خدایا آرزو میری یہی ھے
میرا نور بصیرت عام کر دے

لیکن اقبال ہی کے الفاظ میں ھمارے معاشرے کا یہ عالم ھے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ھے قوموں کی زندگی میں

ایک ہزار سال سے فکری جمود کی شکار اور طرز کہن پہ اڑی ہوئی قوم کو افکار تازہ پہ قائل کرنا آسان نہیں۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"بے شک اللہ کے نزدیک جانداروں میں بدترین مخلوق وہ ہے جو گونگے اور بہرے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے" (سورۃ انفال آیت ۲۲) ۔افکار تازہ اسی غور

و فکر کی دعوت ہے۔ کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر صاحب خود صفحہ نمبر 20 پر لکھتے ہیں کہ کسی بھی لکھنے والے کو حرمت قلم کا امین ہونا چاہیے تاکہ وہ پوری دیانتداری سے اپنی ’’ بات قارئین تک پہنچا سکے۔ الحمد للہ یہ اہمیت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی اور بفضل تعالی اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھایا ہے۔ اپنے قلم کو نہ تو غلو اور خوشامد کی آلائشوں آلودہ کیا اور نہ ہی حق اور سچ بات لکھنے میں کوئی خوف اور تردد ہوا۔ حکیم الامت کی پیروی میں ساز سخن کو بہانہ بناتے ہوئے اپنی سوچ اور افکار کو لفظوں میں پرویا اور سپرد قلم کیا ہے۔ یہ ایک لگن ہے، جنون ہے، ایک جذبہ ہے اور ایک جدوجہد ہے جو خلوص سے جاری ہے اور اس مشن کا کچھ حصہ اس کتاب کی صورت میں اب آپ کے ہاتھوں میں ہے‘‘۔

ہماری دعا ہے کہ عارف کسانہ کا یہ جذبہ، یہ جنون، اور یہ لگن اور اپنے نصب العین سے عشق تا ابد قائم رہے اور اللہ تعالیٰ اُن کے قلم کو اور زیادہ طاقت دے۔ آمین۔

مسئلہ کشمیر آخر کیسے حل ہوگا

یہ اقوام متحدہ کے ایجنڈا پر یہ سب سے پرانا حل طلب مسئلہ ہے لیکن اقوام عالم کشمیر کی وادی میں بہتےہوئے خون کا شور سننے سے قاصر ہیں اور وہاں ہونے والے مظالم پر آنکھیں بند کیئے ہوئے ہے۔ محکوم اور مجبور اقوام کے پاس عالمی حمایت ہی آخری سہارا ہوتا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے بہت موثر انداز میں ایک بار پھر اقوام متحدہ پر زور دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرانے میں اپنا کرادر ادا کرے۔ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر اجاگر کیا جانا ایک مستحسن قدم ہے لیکن مقبوضہ کشمیر میں تمام تر بھارتی مظالم کے باوجود عالمی رائے اس پر توجہ نہیں دیتی اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ آزاد کشمیر حکومت کو یہ کرادر ادا دیا جائے کہ وہ خود عالمی برادی کے سامنے مسئلہ کشمیر پیش کرے۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ جب خود کشمیری اپنی بات کہتے ہیں تو دنیا توجہ سے سُنتی ہے لیکن جب وہی بات پاکستان کرتا ہے تو اسے پاک بھارت تنازعہ سمجھا جاتا ہے اور وہ موثر نہیں ہوتی۔ حکومت پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی کو موثر بنانے کی اشد ضرورت ہے لیکن وزیر خارجہ کی عدم موجودگی کے باعث یہ کیسےممکنہو سکتا ہے۔

بھارت الٹا پاکستان کو دہشت گرملک ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہے اور اسے تنہا کرنے کے لئے عمل پیرا ہے۔ عالمی رائے عامہ کو گمراہ کی کوشش میں ایک باقاعدہ مہم

شروع ہے لیکن پاکستان کی جوابی حکمت عملی کہیں نظر نہیں آ رہی ۔ اندرونی استحکام کے بغیر نہ بیرونی جارحیت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور نہ عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایک مضبوط پاکستان ہی کشمیر کی آزادی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ قانون کی حکمرانی، عدل و انصاف، بد عنوانی سے پاک طرز حکمرانی اور قومی یکجہتی کے بغیر مضبوط پاکستان کا تصور محال ہے۔

مسئلہ کشمیر کے حل میں سب سے مشکل کام بھارتی قیادت کو یہ باور کرانا کہ وہ اس مسئلہ کے لئے آمادہ ہو۔ بھارت کی سول سوسائیٹی اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

حالیہ دنوں میں وہاں کی سول سوسائیٹی اور حقوق انسانی کے علمبرداروں نے جموں کشمیر میں ہونے والے ظلم کے خلاف دہلی اور بھارت کے دیگر کئی شہروں میں آواز بلند کرکے قابل تحسین کام کیا ہے۔ بھارت اور پاکستان کی سول سوسائیٹی ، صحافی، دانشور، حقوق انسانی کے علمبردار، سیاستدان اور عام عوام کو مل کر کشمیری عوام کے غیر مشروط حق خود آرادیت کی حمایت میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔سب سے اہم کردار یورپ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کشمیری مزید متحرک اور متحد ہو کر بھرپور سفارتی مہم سے کر سکتے ہیں۔وہ عالمی رائے عامہ کو بیدار کر سکتے ہیں ۔ جن ممالک میں کشمیری مقیم ہیں وہاں کی حکومتوں، سیاستدانوں، حقوق انسانی کی تنظیموں، میڈیا ، عالمی تنظیموں اور اقوام متحدہ کے دفاتر کو بار بار اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کریں اور

ایک ایسے حالات پیدا کردیں کہ بھارت اس مسئلہ کو حل کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ مسئلہ کشمیر کے زمینی حقائق کو سمجھتے ہوئے غیر جذباتی انداز اور حقیقت پسندانہ طرز عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں مسئلہ کے تینوں فریقین کی مرضی کے بغیر یہ معاملہ حل ہو جائے۔ کوئی ایک فریق بھی اسے فوجی کارروائی سے حل نہیں کرسکتا کیونکہ اگر ایسا ہونا ہوتا تو کب کا ہوچکا ہوتا دوسرا یہ کہ اگر کوئی فوجی کارروائی سے کچھ علاقے پر قبضہ کر بھی لے تو اسے برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ کسی ایک فریق کی فتح اور دوسرے کی شکست کی صورت میں بھی پائیدار حل نہیں نکل سکے گا۔ تقسیم بھی اس مسئلہ کا حل نہیں کیوں ریاست جموں کشمیر پہلے ہی منقسم ہے۔ اگر اس مسئلہ کو حل نہ کیا گیا تو بھی جنوبی ایشیا میں امن ممکن نہیں۔ دونوں ممالک اپنے وسائل دفاع اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے میں صرف کرتے رہیں گے۔ سکولوں، ہسپتالوں، تعلم و تحقیق کے مراکز کی بجائے ایک دوسرے کو تباہ کرنے والے اسلحہ کے انبار لگانے کی دوڑ جاری رہے گی۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ حقیقت پسندانہ حل تلاش کیا جائے۔ بھارت کو یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ کشمیری اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ، کسی قیمت پر نہیں۔ نہ مالی مراعات نے کشمیریوں کو مطمئن کیا اور نہ ظلم نے تحریک آزادی ختم کیا۔ بھارت عالمی میڈیا کی اس آواز کو تسلیم کرلے کہ کشمیریوں کا صرف ایک مطالبہ ہے اور وہ ہے آزادی ۔ بھارت کو اس مسئلہ کے کسی آبرومندانہ حل کی طرف بڑھنا چاہیے۔ جب

تک دونوں ممالک اٹوٹ انگ اور شہ رگ کی پالیسی ترک نہیں کرتے مسئلہ میں پیش رفت ممکن نہیں۔ پاکستان اور بھارت کے مابین کشمیر کو ایک بفر سٹیٹ کی صورت دینے سے مسئلہ کا ایسا حل نکل سکتا ہے جو سب کے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ ریاست کے تمام منقسم حصوں کو ایک وحدت کی صورت میں ایک غیر فوجی خطہ بنایا جائے جبکہ پاکستان اور بھارت دونوں کا ریاست میں آزادانہ عمل دخل ہو۔ اس کے لئے اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کا طریقہ کار بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس مسئلہ کو حل کرنا ہے تو پاک بھارت قیادت کو اس پر غور کرنا ہو گا وگرنہ مستقبل بھی ماضی کی محاذ آرائی اور اپنے عوام کو روٹی دینے کی بجائے فوجی اخراجات پر رقم خرچ کرتے رہیں۔ سویڈن کے تھنک ٹینک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق بھارت دنیا میں اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کا سب سے بڑا خریدار ہے جبکہ اس کی کروڑوں عوام کو دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لئے گھر میسر نہیں۔ بھارت اگر دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے جمہوری اصولوں کو تسلیم کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیریوں کو آزادانہ رائے شماری کا موقع دینا چاہیے۔ اسے اپنے بانی وزیر اعظم کا وہ وعدہ پورا کرنا چاہیے جو دنیا اور کشمیریوں کے ساتھ کیا تھا۔ پاکستان کو ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہیے دونوں ممالک کشمیر کو ایک غیر فوجی علاقہ قرار دیں اور اسے سفارتی طور پر عالمی برادی کے سامنے رکھنے سے بھارت پر دباؤ میں بہت اضافہ ہوگا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے دونوں حکومتوں کو جرات مندانہ فیصلے کرنا ہوں گے اور اسے حل

کرنا خود اُن کے اپنے مفاد میں ہے۔

نامی ایک کتابچے پر ریاست جموں Justice Delayed حریت کانفرنس کی طرف سے کشمیر کا جو نقشہ شائع کیا گیا ہے اس میں آزاد جموں کشمیر، پاکستان کے زیر انتظام گلگت بلتستان اور اقصائے چین کو نکال دیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی بد دیانتی ہے جس سے تقسیم کشمیر کی بُو آتی ہے۔ امید ہے کہ حریت کانفرس اپنی اس غلطی کا ادراک کرتے ہوئے آئندہ پوری ریاست جموں کشمیر کا نقشہ شائع کرے گی اور دیگر جماعتوں اور اداروں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ہوگی۔ آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر جو پوری ریاست کی نمائندہ ہونے کی دعویٰ دار ہے اسے بھی ریاست کو پورا نقشہ سرکاری طور پر شائع کرنا چاہیے۔

جسم انسانی میں سور کے اعضا کی پیوندکاری

کیا اب جسم انسانی میں خنزیر کے اعضا لگائے جائیں گے ؟ کیا اب انسان کے سینے میں سور دل کا دھڑکے گا؟ اس سے پہلے کہ اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی سازش قرار دیا جائے ، حقائق جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آسکتی ہے۔ اسلامی دنیا کے اہل علم جسم انسانی میں اعضا کی پیوندکاری کو جائیز سمجھتے ہیں چاہے یہ زندہ انسان سے عطیہ ہوں یا مردہ سے۔ بہت سی بیماریوں اور جسم انسانی کے بعض اعضا کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے خون اور خلیوں کا عطیہ اور اعضا کی پیوندکاری اب عام سی بات ہے لیکن چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں اب سور کے خلیوں اور اعضا کا مرہون منت ہونا پڑے گا۔ سور جیسے نجس اور حرام ہی نہیں بلکہ روایتی طور پر کچھ لوگ تو اس کا نام لینا بھی نجاست کے مترادف سمجھتے ہیں حالانکہ خنزیر کا ذکر تو قرآن حکیم میں چار مرتبہ موجود ہے۔ جہاں تک حرام ہونے کا تعلق ہے قرآن نے مردار، خون، غیراللہ کے نام پر ذبیحہ اور سور کو ایک ہی قسم میں شمار کیا ہے۔ اسلام اور یہودیت میں سور کا گوشت حرام ہے بلکہ عیسائیت میں بھی ایسا ہی ہے اورمذہبی عیسائی اس حرام ہی گردانتے ہیں۔ اگرچہ مغربی معاشرے میں سور کا گوشت عام کھایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے گندہ جانور سمجھا جاتا ہے کسی کو برا بھلا اور گندا کہنا ہو تو اسے سور

سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سویڈش زبان میں تو ایسا ایک محاورہ بھی ہے۔قرآن حکیم نے بھی اسے آلائشوں سے پاک نہ ہونا بتایا ہے۔

انسانی بیماریوں کے علاج کے لئے ادویات میں شامل اہم عناصر جانوروں سے لیے جاتے ہیں۔ جسم انسانی میں سور کے اعضا کی پیوندکاری کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ ضرورت مند بہت زیادہ ہیں لیکن عطیہ ملنے کی صورتیں بہت محدود ہیں اس لیے طبّی ماہرین نے اس کا متبادل سوچنا شروع کیا۔انسانی جسم میں جانوروں کے اعضا کی پیوند کاری کو سائنسی زبان میں زینتھوٹرانسپلانٹ کہتے ہیں۔ حیاتیاتی اعتبار سے سور کے بہت سے افعال جس میں نظام انہضام بھی شامل ہے جسم انسانی کے قریب ترین ہیں۔ سور کا دل، گردے، جگر، پھیپھڑے اور آنکھ کی پتلی اپنی ساخت، جسامت اور کاردگی کے اعتبار سے انسانی جسم سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنتیں، جلد اور ہڈیوں کے گودے کو بھی پیوندکاری کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ کسی اور جانور کے اعضا ایسی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ سور کے لبلبہ کے خلیے جسم انسانی میں داخل کرکے قدرتی انسولین پیدا کی جاسکتی ہے اور اس طرح ذیابیطس کے مریض مستقل صحت مند ہو سکتے ہیں اور انہیں ادویات کی ضرورت نہیں رہی گی۔ فالج، رعشہ، اعصابی اور عضلات کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے لیے امید کی کرن واضح نظر آ رہی ہے۔ جن ہسپتالوں میں ایسی پیوندکاری کی جائے گی ان کے ساتھ سوروں کا ایک فارم

بھی قائم کیا جائے جو فیکٹری کی صورت میں کام کرے گا۔ لیکن یہ سب اس قدر آسان نہیں اس میں بہت سی پیچیدگیاں اور مشکل مراحل بھی ہیں جن کا خیال رکھنا لازمی امر ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے سور کے گوشت میں موجود وائرس ہیں۔ یہ انسانی صحت کے لئے خطرناک ہیں اور اعضا کی پیوند کاری سے قبل انہیں ان سے پاک کرنا بہت ضروری ہے اور اس کے لئے ایک طریقہ کار سائنسدانوں نے وضع کرلیا ہے۔ ممکن ہے قرآن حکیم نے سور کو گوشت کو حرام اسی لئے قرار دیا ہے اور ایسے وائرس کی موجودگی کی وجہ سے آلائشوں سے پاک نہ ہونا بتایا ہے (سورہ الانعام 145)۔ یہاں اس طبی تحقیق کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ جن ممالک میں سور کا گوشت زیادہ کھایا جاتا ہے وہاں قولون (آنتوں) کے سرطان کی شرح بہت زیادہ ہے اور جن ممالک میں خنزیر کا گوشت نہیں کھایا جاتا وہاں یہ سرطان بہت ہی کم ہے۔ وائرس سے پاک سور کے اعضا حاصل کرنے کے لئے جینیٹک انجنیئرنگ کو بروے کار لایا جارہا ہے اور حال ہی میں دریافت ہونے والی ایک تکنیک CRISPR Cas کو استعمال کرتے ہوئے سور کے بیضہ میں ڈی این اے اور آر این اے کو تبدیل کرکے ایسے سور پیدا کئے جائیں گے جو مضر وائرس سے پاک ہوں گیاور ان کے اعضا جسم انسانی میں پیوند کاری کے لئے استعمال کئے جاسکیں گے۔

سور کے اعضا کی جسم انسانی میں پیوند کاری کے سلسلہ میں ایک اور مشکل

انسانی جسم کا مدافعاتی نظام ہے جو کسی دوسرے عضو یا خلیوں کو قبول نہیں کرتا۔ سور کے جسم میں ایک مخصوص جین کے جوڑے کی موجودگی یہ مشکل پیدا کرتی ہے۔ اس مشکل سے نجات بھی جیناتی انجنیئرنگ نے دلائی ہے اور ان جین کو ناکارہ بنا کر سور کے ایسے بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں جن کے خلیے اور اعضا آسانی سے انسانی جسم میں منتقل کئے جا سکیں گے۔ پیوند کاری کے یہ تجربات پہلے بندروں پر کئے جائیں گے اور کامیابی کی صورت میں انسانوں کے لئے مروج ہوں گے۔ سویڈن اور دنیا کے کئی ایک ممالک میں اس تحقیق پر کام جاری ہے۔ طبّی ضروریات اپنی جگہ لیکن یہ بہت حساس معاملہ ہے اور اس بارے میں اخلاقی اور مذہبی سوالات ضرور اٹھیں گے۔ یورپ میں بھی اس بارے اخلاقی اور سماجی سوالات موجود ہیں۔اسلامی دنیا میں اسے قبول کرنا آسان نہیں ہوگا۔مذہبی طبقہ کی جانب سے اس کی اسی طرح مخالفت آئے جو خون اور اعضا کے عطیہ کے سلسلہ میں تھی یہ الگ بات ہے کہ اب آنکھوں، گردوں، جگر اور کئی دوسرے اعضا کی پیوند کاری اور خون کے عطیہ کی نہ صرف مخالفت ختم ہو گئی ہے بلکہ سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کسی شخص کو گالی دینی ہو اور بہت برا کہنا ہو تو اسی سور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ تھے جو کسی بہت برے شخص کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کی آنکھ میں سور کا بال ہے لیکن تب کیا ہوگا جب کسی کے سینے میں سور کا دل دھڑک رہا ہوگا۔

چومکھی لڑائی

پاکستان میری محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز اس نظریے کی وجہ سے ہے جو اس مملکت کے قیام کا بنیادی اور اصل محرک تھا۔ ریاست مدینہ کے بعد دنیا کے نقشے پر یہ مملکت رنگ و نسل، زبان اور جغرافیائی اشتراک کی بجائے مشترکہ نظریہ حیات کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی۔ یہ وہی نظریہ تھا جس نے یوم فرقان پر بدر میں دنیا پر واضح کر دیا کہ قوم کی تشکیل رشتہ داری، علاقہ اور زبان نہیں بلکہ ایمان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ چوہدری رحمت علی کے نظریہ اور تصور کو مسلم لیگ نے قبول کرکے پاکستان کو اپنی منزل قرار دیا اور مملکت خداداد دنیا کے نقشے پر ابھری۔ اس نظریاتی مملکت کے مخالفین آج بھی اس کے وجود کو برداشت نہیں کر رہے اور اسے ختم کرنے کے درپہ ہیں۔ کوئی اسے محض جذباتیت کہے اور متفق نہ بھی ہو تب بھی مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور اسے چومکھی لڑائی کا سامنا ہے۔
چاروں جانب سے اس یلغار میں اپنے بھی شامل ہیں اور دشمن بھی۔ اندرونی محاذ بھی کھلا ہے اور بیرونی تو ہے ہی۔ پاکستان کے نظریاتی مخالفین کا جانب سے پہلا محاذ قیام پاکستان سے قبل ہی جاری تھا جو اب بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ اس میں وہ عناصر وہ ہیں جو اسلام کا نام بھی لیتے ہیں لیکن نظریہ پاکستان کے شدید مخالف ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسلام

کو محض مذہب کی حد تک تسلیم کرنے کے لئے تو تیار ہیں لیکن پولیٹیکل اسلام ان کے قابل قبول نہیں۔ اسی فہرست میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جو پیدا تو مسلمانوں کے گھروں میں ہوئے لیکن اسلام ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا اور برملا اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستان اور اسلام کے خلاف ہر محفل میں بولنا اور ہر تحریر میں اس کا اظہار کرنا ان کا مقصد زندگی ہے۔ یہ عناصر تحریر و تقریر سے نوجوان نسل میں نظریہ پاکستان کے حوالے سے خلفشار پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ترقی پسندی اور سیکولرازم کے یہ علمبردار قیام پاکستان کی بنیاد کو مسمار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تجاہل عارفانہ سے تاریخی تناظر، مسلم لیگ کی جدوجہد، فکر اقبال اور قائداعظم کی ایک سو سے زائد تقریریں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کا قانون قرآن کی روشنی میں ہوگا، کو فراموش کردیتے ہیں۔ ایسے کالم نگار اور اینکر بکثرت پاکستانی میڈیا پر اپنے محاز پر جنگ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں اور گفتگو سے ان کو پہچاننا مشکل نہیں۔

پاکستان کے خلاف دوسرا محاذ لسانی، علاقائی، نسلی اور فرقہ وارانہ تعصبات کی صورت میں کھلا ہے۔ جب کسی قوم اور ملک کی نظریاتی اساس کو ختم کرنا ہو تو ایسے تعصبات ناگزیر ہیں۔ مذہبی فرقہ واریت سے نہ صرف اسلام کے تشخص کو نقصان پہنچتا بلکہ جو مملکت اس نظریہ کے تحت حاصل کی گئی اس کی بنیادیں بھی

کمزور ہوتی ہیں۔ زبان اور علاقائی بنیادوں پر قوم پرستی کے تصورات بھی زہر قاتل ہیں۔ تیسرا محاذ پاکستان کے دشمنوں اور بیرونی طاقتوں کا ہے جو اسے غیر مستحکم کرنے کے لئے سرگرم ہیں۔ ایک منظم منصوبہ بندی کے ساتھ وہ پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ اپنے مذموم مقاصد کے لئے اپنے مالی وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ حالیہ دو عشروں میں اسلامی دنیا کے بہت سے ممالک کے ساتھ جو ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ غیر جاندار عالمی مبصرین اور سفارتی حلقے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس قدر مخالفت اور سازشوں کے باوجود پاکستان کس طرح اپنی سالمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پاکستان کی سلامتی کے خلاف چوتھا اور اہم محاذ خود اس کے بالادست طبقے کی جانب سے ہے۔ اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں یہی طبقہ اس سے قبل مشرقی پاکستان کو الگ کرچکا ہے۔ اس میں حکمران اور سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں جو ملک کے آئین اور قانون کا کھلم کھلا مذاق اڑاتی ہیں۔ جمہوریت کو نام پر آمریت کی صورت ہیں کیونکہ جمہوریت خود ان جماعتوں میں نہیں۔ یہ جمہوریت کا مطلب صرف انتخابات کو سمجھتے ہیں جبکہ سیاسی جماعتیں ان کی خاندانی صنعت کے مانند ہیں۔ غریب عوام خوار ہوتے رہیں، انہیں اپنی عیاشی اور کرپشن سے غرض ہے۔ ملک کے وسائل لوٹ کر اسے معاشی بدحالی کی اس منزل تک پہنچانا چاہتے کہ یہ اپنے دفاع کے لئے مالی وسائل بھی مہیا نہ کرسکے۔ انہوں نے ایسا نظام مسلط کر رکھا ہے جس کے شکنجے میں

پاکستانی عوام مجبور اور بے بس ہو کر پھنسی ہوئی ہے۔ غریب کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں لیکن یہ طبّی معائینہ کے لئے بھی بیرونی ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ عوام عدم تحفظ کا شکار ہیں لیکن ان کی سیکورٹی پر کروڑوں خرچ ہو رہے ہیں ملک کی کا عدالتی نظام انصاف دلانے میں ناکام ہے۔ طاقت ور اور بالا دست طبقہ کے خلاف عدالتیں خاموش رہتی ہیں۔ ملک میں احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ افسر شاہی کو اپنی مراعات سے غرض ہے۔ ضمیر نام کوئی چیز باقی نہیں رہی اور حلال و حرام کی تمیز اٹھ گئی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں۔ یہ محاذ سب سے سنگین ہے کیونکہ یہ اس طبقے نے کھولا ہے جس کے ہاتھوں میں زمام اقتدار ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی خطرناک ہے کہ ان کی وجہ سے عوام کا مملکت سے ہی اعتبار اٹھ جائے گا اور جب کسی عوام کا اپنی مملکت سے اعتبار اٹھ جائے تو اسے ختم کرنے کی ضرورت ہی رہتی۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں امید کی کرن محب وطن عوام اور نوجوانوں ہیں جو اپنی افواج کے ساتھ مل کر ان تمام سازشوں کو ناکام بنا دیں گے۔ پاکستان عطیہ خداوندی ہے اور قائدِ اعظم نے درست فرمایا تھا کہ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

سائنس سے بھی آگے

بات کسی حد تک درست ہے کہ جب بھی کوئی نیا سائنسی انکشاف سامنے آتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے یہ تو پہلے سے ہی قرآن میں موجود تھا جسے سائنس نے اب دریافت کیا ہے لیکن یہی بات سائنسی تحقیق اور انکشاف سے قبل کیوں نہیں کی جاتی اور کیوں انتظار کیا جاتا ہے کہ پہلے کوئی دریافت ہو تو پھر اس کے بارے میں دعویٰ کیا جائے کہ یہ تو قرآن مجید میں پہلے سے موجود ہے۔ایسا کیوں ہے اور کیا واقعی قرآن حکیم میں ایسے حقائق موجود ہیں جنہیں ابھی سائنس نے دریافت نہیں کیا اور وہ مستقبل میں سامنے آئیں گے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ سائنسی تحقیق سے قبل کیوں نہیں واضح کر دیا جاتا کہ یہ حقیقت قرآن مجید میں موجود ہے تو اس کی بہت سی وجوہات میں ایک تو یونانی فلسفہ کی بالادستی تھی اور مسلمان مفسرین بھی اس سحر سے باہر نہ نکل سکے اور قرآنی الفاظ کے وہ معنی لئے جو مروجہ سوچ سے ہم آہنگ تھے۔ قرآن حکیم کی جو پہلی تفسیر لکھی گئی بعد میں آنے والوں نے اسی کو بنیاد بنایا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد قرآن پر غور و فکر کی بجائے دیگر علوم میں توجہ دی جاتی رہی اور قرآن حکیم پس منظر میں گیا۔ اس مختصر کالم میں ان تمام اسباب کا احاطہ ممکن نہیں بحر حال جب قرآن میں تدبر اور زمانے کے علوم سے ہم آہنگی نہ ہو سکی تو نتیجہ یہی

نکلنا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ قرآن حکیم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ اس کی تفصیلات پیش کرتا اور نہ ہی وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے سائنسی تحقیقات کا محتاج ہے چونکہ قرآن حکیم بار بار تخلیق کائنات اور گردش لیل و نہار پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اس لئے ان حقائق کو سامنے لایا جاتا ہے۔ قرآن مجید کا آٹھواں حصہ اسی غور و فکر کی دعوت کے بارے میں ہے اور بار بار غور کرنے والے، فکر کرنے والے، سوچنے والے، سمجھنے والے، عقل رکھنے والے، علم رکھنے والے، تدبر کرنے والے، تحقیق کرنے والے اور سچائی کے لئے سرگرداں رہنے والے الفاظ اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ انسان اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو۔ آل عمران میں کائنات کی تخلیق پر غوروفکر کرنے کو اللہ کا ذکر قرار دیا ہے اور کہا کہ اللہ بندے اٹھتے بیٹھتے کائنات کی تخلیق پر غوروفکر کرتے ہیں گویا سائنسی علوم کا حصول اللہ کا ذکر کرنا ہے۔ سورہ الجاثیہ کی ابتدا ہی میں یہ واضح کردیا کہ کائنات کی تخلیق میں غوروفکر کرنے والے حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔

اب ان حقائق کا ذکر جو قرآن حکیم میں موجود ہیں لیکن ابھی سائنس نے وہ دریافت نہیں کئے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے اور سائنس نے بھی ابھی تک کائنات میں کوئی ایسی مخلوق دریافت نہیں کی جو انسان سے بہتر ہو لیکن قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ کائنات میں انسان سے بہتر مخلوق ہو سکتی ہے

اور انسان سب سے اعلیٰ نہیں ہے۔ سورہ الاسراء کی آیت ستر میں ہے کہ " اور ہم نے انہیں اکثر مخلوقات پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے فضیلت دے کر برتر بنا دیا" ۔ اکثر کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ کی انسان تمام کائنات سے افضل مخلوق نہیں اور اس سے بھی اشرف مخلوق کائنات میں موجود ہو سکتی ہے۔ ذہین مخلوق کی تلاش کے لئے سائنس دان جستجو میں ہیں اور آسٹرونومیکل جرنل کی ایک رپورٹ کے مطابق کسی ایک سیارے میں ایسی کوئی مخلوق ہو سکتی ہے۔ سائنس زمین کے علاوہ دیگر سیاروں اور کائنات میں حیات کی موجودگی میں سرگرداں ہے اور ابھی تک کسی اور جگہ جاندار مخلوق تو دور کی بات ہے ابھی زندگی کے اثار بھی نہیں ملے لیکن قرآن حکیم نے سورہ الجاثیہ کی آیت چار اور سورہ الشوری کی آیت انیس میں بیان کیا ہے کہ وسیع اور پھیلی ہوئی کائنات میں اور جاندار مخلوقات کا ہونا ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں یا مل جائیں۔ سورہ النحل کی آیت انچاس میں بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ سائنس دان اس کوشش میں بھی لگے ہوئے ہیں کہ کسی دوسرے سیارے پر موجود مخلوق سے آنے والے کسی پیغام یا سگنل کو وصول کریں۔ اگر کبھی دو مخلوقات کے مابین رابطہ ہوا تو وہ اس کے بارے میں قرآن نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔ سائنس نے اب تک جانوروں کی انواع species دریافت کی ہیں ان کے مطابق تقریباً پرندوں کی 8600، دودھ پلانے والے جانور 4500، رینگنے والے 6000، خشکی وتری والے Amphibians کی 2500 اور مچھلیوں کی 32000 انواع دریافت کی ہیں

جبکہ ہر سال صرف مچھلیوں کی ایک سو نئی اقسام دریافت ہو رہی ہیں۔ اب دیکھیے قرآن نے کیا کہا اور جھوم جائیے۔ سورہ النحل کی آیت آٹھ میں ہے کہ وما یخلق وما لا تعلمون یعنی وہ اپنی تخلیق میں ایسے اضافے کرتا رہتا ہے جنہیں تم پہلے سے نہیں جانتے۔ سورہ فاطر کی پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ اپنی تخلیق میں جس قدر اضافہ اور توسیع ہے کرتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی لئے کہا تھا کہ

"یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے "کن فیکوں

قرآن حکیم میں ذاتِ باری تعالیٰ اور قرآن حکیم کے بعد اس کائنات کو بار بار حق یعنی سچائی کہا گیا ہے۔ یہ سراب، دھوکہ، وہم یا مایا نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کو سورہ فاطر کی آیت اٹھائیس میں علماء کا نام دیا ہے۔ وہی اہل علم اس کائنات پر غور و فکر کرتے ہوئے تلاش حقیقت کو پا لیتے ہیں جس بارے میں سورہ فصلت کی آیت 53 میں ہے کہ ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم میں دکھائیں گے تا آنکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کی قرآن واقعی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

اپنی زبان و ثقافت سے نفرت کرنے والی قوم

دنیا میں ہمارے علاوہ شاید ہی کوئی اور قوم ہو جسے اپنی زبان اور ثقافت کے حوالے سے احساس کمتری ہو۔ اپنا لباس پہننے میں ہچکچاہٹ اور اپنی زبان بولنے میں شرمندگی کا احساس صرف ہمیں ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بالا دست طبقے اور بیوروکریسی کو نجی محافل میں بھی شلوار قمیض پہننے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم اردو اور اپنی مادری زبان سے نفرت بھرا سلوک روا رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ شرمناک قدم اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیکن ہاؤس سکول سسٹم جس کے سکول پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اس نے پنجابی کو ایک گندی زبان قرار دیتے ہوئے اپنے سکولوں میں اس کے بولنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پنجابی پاکستان کے پچاس فی صد لوگوں کی مادری زبان ہے جس میں اس ادارے کے مالکان، منتظمین اور اساتذہ بھی شامل ہیں۔ کیا وہ اور ان کے والدین یہ گندی زبان بولتے ہیں۔ کوئی بھی زبان گندی یا اچھی نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے اور یہ ہر زبان کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ پنجابی تو ایک طرف رہی پاکستان میں کئی ایک سکول ایسے بھی ہیں جہاں قومی زبان اردو بولنے پر بچوں کو جرمانہ کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے غلامانہ ذہنیت ہمارے لوگوں کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان ہی ترقی و خوش حالی کی ضامن ہے۔ دنیا کا کون سا ملک ہے

جس نے اپنی زبان چھوڑ کر کسی دوسری زبان کو ذریعہ تعلم بنا کر ترقی کی۔ کوریا، جاپان، چین اور یورپی ممالک نے انگریزی ذریعہ تعلیم کے بغیر ہی ترقی کی ہے۔ایک کروڑ سے کم آبادی کے ملک سویڈن نے اپنی زبان کو دفتری اور ذریعہ تعلیم بنایا ہوا ہے یہی وجہ ہے سائنس، ٹیکنالوجی اور معاشی میدان میں عالمی سطح پر صف اول میں کھڑا ہے۔ کسی بھی حکومتی ادارے، سرکاری اہل کار یا کہیں بھی خط وکتابت کریں تو جواب ہمیشہ سویڈش زبان میں ملے گا۔ ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ، ہالینڈ اور بیلجیئم چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں لیکن اپنی زبان کو انھوں نے اپنایا ہوا ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایران ہے جس نے اپنی قومی زبان کو تعلیمی اور دفتری سطح پر رائج کیا ہے بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی زبان میں بات کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔آئین پاکستان کی دفعات کے باوجود اردو کے نفاذ کی تمام تر کوششیں لاحاصل ہیں اور سپریم کورٹ کا اس بارے میں فیصلہ بھی فائلوں میں دب چکا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات اور دوسرے ادارے فعال کردار ادا نہیں کرسکے۔ انگریزی سے مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے بہت سے سفیر اپنے ہم وطنوں سے اظہار خیال اور خطاب انگریزی زبان میں کرتے ہیں جسے سب سمجھ نہیں پاتے۔ اعلیٰ سرکاری عہدیداران عام گفتگو کرتے ہوئے بھی انگریزی کے الفاظ اور جملے بے تکے انداز میں ادا کرتے ہوئے اپنی علمیت اور ماڈرن ہونے کا رعب دیکھاتے ہیں۔ احساس کمتری کے اس رویہ نے صورت حال یہ پیدا کی ہے جس

کی روش میں سب بہے جا رہے ہیں۔ اردو کی تدریس کا یہ عالم ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم کے تحت اولیول پر سکولوں میں اردو کی نصابی کتاب پڑھانے پر توجہ ہیں نہیں دی جاتی جس سے بچے زبان کیا سیکھیں گے۔ نصابی کتابیں بھی غیر ملکی اداروں کی پڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا ہمارے اہل علم اپنے بچوں کے لئے نصابی کتابیں بھی نہیں لکھ سکتے۔ پاکستان رائج تعلیم نظام سے جو نسل تیار ہو رہی ہے اس کی زبان نہ اردو ہو گی اور نہ ہی انگریزی بلکہ کوئی عجیب سا ملغوبہ ہو گی۔

کوئی بھی زبان علمیت کی نشانی نہیں ہوتی بلکہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان میں ہی دی جائے لیکن کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری زبانوں سے نابلد رکھا جائے۔ بچوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت ایک سے زیادہ زبانیں یکھ سکتے ہیں۔
سویڈن میں اس حوالے سے تحقیق ہوئی ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اچھی ہوتی ہے وہ دیگر زبانیں بہت بہتر یکھتے ہیں اسی لئے سویڈن میں بچوں کی مادری زبان پر بہت توجہ دی جاتی ہے اور والدین سے کہا جاتا ہے کہ گھروں میں بچوں کے ساتھ اپنی مادری زبان میں ہی بات کریں۔ حکومت نے مادری زبانوں کو اپنے تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا ہوا ہے اور اس مقصد کے لئے اساتذہ بھرتی کئے گئے ہیں جو سکولوں اور کالجوں میں بچوں کو ان

کی مادری زبان پڑھاتے ہیں۔ سویڈن میں پاکستانی بچے سکولوں اور کالجوں میں اردو زبان پڑھتے ہیں۔ میٹرک کے امتحان میں اردو زبان کے نمبر دیگر مضامین جیسے سویڈش زبان، انگریزی، سائنس اور ریاضی کے برابر ہیں اس لئے بچے اس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ سکولوں سے لیکر جامعات تک ذریعہ تعلیم سویڈش زبان ہے اور ساتھ انگریزی کو ایک زبان کے طور پر پڑھایا جاتا ہے بلکہ ایک اور یورپی زبان بھی بچوں کو سکھائی جاتی ہے۔ مادری زبان پر توجہ اور ذریعہ تعلیم اپنی قومی زبان یعنی سویڈش یہاں کے تعلیم نظام کی بنیاد ہے اور جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے پورے یورپ میں برطانیہ اور آئرلینڈ کے بعد سویڈش بچوں کی انگریزی سب سے بہتر ہے۔ سویڈن میں پورے ملک میں ایک ہی نصاب تعلیم ہے جسے تعلیمی اتھارٹی تیار کرتی اور نافذ کرتی ہے۔ سرکاری اور نجی شعبہ کو ایک ہی نصاب تعلیم پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں ارباب اختیار اور ماہرین تعلیم کو سوچنا چاہیے اور دنیا کے ترقی یافتہ اقوام سے سبق سیکھتے ہوئے ایک قومی تعلیمی پالیسی بنائی جائے۔ مادری زبانوں کی اہمیت کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انگریزی زبان کی تدریس بھی توجہ مرکوز رہنی چاہیے اور اسے ایک مضمون کے طور پر لازمی پڑھانا چاہیے۔ سب سے ضروری یہ ہے کہ پورے ملک میں ایک تعلیمی نصاب ہونا چاہیے اور اس کا نفاذ یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ حکومت پنجاب کو اس توہین آمیز حرکت کا نوٹس لینا چاہیے اور پنجاب بھر میں بیکن ہاؤس کے سکولوں میں زیر تعلیم طلباء کے والدین کو شدید

احتجاج کرنا چاہیے جب تک کہ بیکن ہاؤس کا دارہ اس پر معافی نہ مانگے۔

مسئلہ کشمیر اور عالمی حمایت

بے شمار قربانیوں، طویل جدوجہد اور اقوام متحدہ کی قراردوں کے باوجود مسئلہ کشمیر کیوں عالمی حمایت حاصل نہیں کرسکا۔ وادی میں بہنے والے خون اور مظلوم کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کا شور کیوں دنیا کو سنائی نہیں دیتا۔ مسلسل کرفیو، ہزراوں شہادتوں، عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم کیوں عالمی میڈیا کا موضوع نہیں ہوتے۔ کچھ حلقے اس کا جواب یوں دیتے ہیں چونکہ مسئلہ کشمیر کے بنیادی فریق مسلمان ہیں اس لئے عالمی رائے عامہ اور اقوام متحدہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ اگر ایسا ہی ہے تو مسئلہ فلسطین بھی بنیادی طور پر مسلمانوں کا ہے لیکن اسے دنیا جانتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر نہ صرف سرفہرست ہے بلکہ دنیا کا ہر شخص اس سے آگاہ ہے لیکن کشمیر کے ساتھ ایسا کیوں نہیں حالانکہ کشمیر اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر سب سے پرانا مسئلہ ہے۔ سلامتی کونسل کی قراردادیں اس پر موجود ہیں اور اب بھی یہ حل طلب مسئلہ کے طور پر فہرست میں شامل ہے۔ مسئلہ کشمیر کو عالمی حمایت نہ ملنے کی وجوہات اور ان کا حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے۔ کشمیری کب تک شہادتیں دیتے رہیں گے۔ کب دنیا ان کی آواز سنے گی اور ان کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

دنیاکے اکثر ممالک اس مسئلہ کو کشمیری عوام کے حق خود آرادی کی بجائے پاک بھارت تنازعہ سمجھتے ہیں۔ دو طرفہ تنازعہ کی وجہ سے وہ اس میں مداخلت بھی نہیں کرتے کیونکہ بھارت ایک بڑا ملک ہے اور اس کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں۔ کشمیر کو پاک بھارت تنازعہ بنانے کی خشت اول پاکستان کے وزیر خارجہ ظفراللہ خان کی جانب سے رکھی گئی جب انہوں نے 13 اگست 1948 کو اقوام متحدہ کی کشمیر پر منظور کی گئی قرارداد میں تبدیلی کرائی اور ایک نئی قرارداد 5 جنوری 1949 کو منظور کرائی جس سے کشمیر بین الاقوامی مسئلہ کی بجائے پاک بھارت تنازعہ بن گیا اور اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر Jammu Kashmir Question کی بجائے The India-Pakistan Question بن گیا۔ کوئی شخص بھی انٹرنیٹ پر سلامتی کونسل کی قراردوں کی فہرست ملاحظہ کرسکتا ہے اس میں The Palestine Question تو بار بار نظر آئے گا لیکن کشمیر کا نام کہیں دیکھائی نہیں دے گا۔ اسی طرح ریاست میں اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کے مشن کا نام یو این مشن برائے کشمیر کی بجائے یو این ملٹری آبزرورز گروپ ان انڈیا اینڈ پاکستان UNMOGIP ہونے سے بھی مسئلہ کشمیر وہاں کے عوام کے حق خود آرادیت کی بجائے پاک بھارت تنازعہ کی صورت میں عالمی منظر پر نظر آیا۔ اقوام متحدہ میں کشمیریوں کو خود بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا جبکہ فلسطینی وہاں اپنی بات خود کرتے ہیں۔ معائدہ شملہ میں یہی دہرایا گیا کہ پاکستان اور بھارت دونوں باہمی طور پر یہ مسئلہ حل کریں گے ۔ اس کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کو عالمی

سطح پر اجاگر کرنے کے لئے مؤثر خارجہ پالیسی اختیار نہ کی گئی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان بغیر کسی منصوبہ بندی کے عمل پیرا ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں استصواب رائے کا مطالبہ تو کیا جاتا ہے لیکن آزاد کشمیر حکومت جسے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت رائے شماری میں اہم کرادرادا کرنا تھا وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ نوے سے زائد ممالک میں پاکستانی سفارت خانے پانچ فروری کو یوم یکجہتی کے نام سے خانہ پری کرنے کے علاوہ سارا سال کشمیر پر کوئی کام نہیں کرتے۔ جن ممالک میں یہ سفارت خانے ہیں وہاں کی حکومت، منتخب نمائندوں، سفارت کاروں، میڈیا، حقوق انسانی کے اداروں اور عام عوام کو مسئلہ کشمیر سے آگاہ کرنے کا کوئی عملی کام نہیں کرتے۔ بھارتی مظالم کے باوجود کشمیری عوام آزادی کی جدجہد جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کا واحد مطالبہ صرف آزادی ہے۔ بھارت کے سابق وزیر خارجہ اور بی جے پی کے رہنما یشونت سنہا کی قیادت میں ایک وفد نے میر واعظ عمر فاروق اور سید علی گیلانی کے ساتھ ملاقات کی اور کشمیری رہنماؤں نے وفد سے کہا ہے کہ وہ جا کر حکومت ہند کو بتا دیں کہ لوگ یہاں آزادی چاہتے ہیں جبکہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئر مین یاسین ملک نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ شدید علالت میں بھی کشمیری عوام کو درس حریت دے رہے ہیں۔ سید علی گیلانی نے واضح طور پر بھارتی وفد سے کہا ہے کہ کشمیر کو بھارت متنازعہ تسلیم کرے اور کشمیر سے فوجیں واپس بلالے تو وہ پاکستان سے کہیں گے کہ وہ آزاد کشمیر سے فوجی انخلا کا عمل شروع کرے۔

سید علی گیلانی کا یہ پالیسی بیان بہت اہم ہے اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ نہ صرف اس کی تائید کرے بلکہ اقوام عالم کو بھی یہی پیغام دے کہ اگر بھارت کشمیر سے اپنی افواج نکالنے پر آمادہ ہو جائے تو وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت پاکستان کو پارلیمانی کشمیر کمیٹی کو ختم کرکے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کی ذمہ داری آزاد کشمیر حکومت کے سپرد کرنی چاہیے۔ آزاد کشمیر کے صدر مسعود خان ایک منجھے ہوئے سفارت کار ہیں اور وہ یہ ذمہ داری بطریق احسن ادا کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ جب خود کشمیری عالمی سطح پر بات کرتے ہیں تو دنیا اس پر توجہ دیتی ہے۔ انہیں اسلام آباد میں غیر ملکی سفارت کاروں سے مل کر اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہیے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے اراکین کے بیرونی دورے بھی لاحاصل ہیں اور ماضی میں بھی ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اس لئے ایسے دوروں کی بجائے آزاد کشمیر اسمبلی کے اراکین اور صدر آزاد کشمیر کو دنیا میں جاکر عالمی حمایت حاصل کرنی چاہیے۔ ایسے دوروں میں پاکستانی اور کشمیری کمیونیٹی سے ملاقاتوں اور تقریبات میں شرکت کی بجائے میزبان ملک کے حکومت، سیاسی رہنماؤں اور منتخب نمائندوں سے ملاقاتیں ہی دوروں کو مؤثر بنا سکتی ہیں۔ کنٹرول لائن پر بھارتی جارحیت اور گولہ باری کا جواب دینے کے لئے پاک فوج کو جوابی کارروائی کرنا پڑتی ہے۔ اس دوطرفہ گولہ باری سے حد متارکہ کے

دونوں جانب کی سول آبادی نشانہ بن رہی ہے۔ گولی بھارتی فوج کی طرف سے چلے یا پاکستانی فوج کی طرف سے، مارے دونوں طرف کشمیری جارہے ہیں۔ حد متارکہ پر تعینات اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کو متحرک کیا جانا چاہیے تاکہ عالمی رائے عامہ اس گول باری کو روکنے میں اپنا کرادر ادا کرے۔ بھمبر آزاد کشمیر کے سماہنی سیکٹر میں سکول میں میرے ہم جماعت اور دوست راجہ سکندر بھارتی جارحیت کا نشانہ بنے اور شہادت کے رتبہ پر فائیز ہوئے۔ اللہ تعالٰی انہیں، دیگر شہید ہونے والوں اور سانحہ کوئیٹہ کے شہداء کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر اور برداشت کا حوصلہ عطا فرمائے۔

جب جموں خون آشام ہوا

ہمارا خیال تھا کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے اور جلد ہی حالات بہتر ہوجائیں گے اور ہم پھر سے اپنے گھروں میں واپس چلے جائیں لیکن بد قسمتی سے وہ دن کبھی نہ آیا اور ہم لوگ اپنے وطن واپس جانے کی آرزو لیکر ایک ایک کرکے اس دنیا سے رخصت ہورہے ہیں۔ جموں سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والوں کی اکثریت کی یہی سوچ تھی۔ جموں کشمیر سے اپنے گھروں کو چھوڑ آنے والے کبھی بھی اپنے وطن کو بھلا نہ سکے اور بہت سے تو یہ وصیت کرکے اس دنیا سے جاتے تھے کہ اگر اُن کا انتقال ہوگیا تو انہیں بطور امانت دفن کیا جائے اور جب بھی موقع ملے تو اُن کے جسد خاکی کو اپنے وطن کی مٹی کے سپرد کردیا جائے۔ اسلامیان جموں پر قیامت ٹوٹی اور ڈھائی لاکھ سے زیادہ مسلمان کے خون سے جموں کی سرزمین رنگین ہوئی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور تقسیم ہند کے منصوبہ کے بعد پنجاب کے تقسیم کی باتیں ہونے لگیں لیکن ریاست جموں کشمیر چونکہ برطانوی ہند میں شامل نہ تھی بلکہ ایک دیسی ریاست تھی جسے قانون آزادی ہند کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے یا پھر اپنی خودمختاری کا اعلان کرلے۔ مہاراجہ کشمیر ریاست کو خودمختار رکھنا چاہتا تھا اور اُسے کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کی ریاستوں کے بارے میں پالیسی اپنے اور

ریاست کے لئے فائدہ مند میں نظر آتی تھی اسی لیے اُس نے ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست جموں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ جوں کا توں (سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ) معائدہ کیا جس کی صورت میں دفاع، امور خارجہ، پوسٹل سروس، مواصلات اور کسٹم وغیرہ کے حکومت پاکستان کے کنٹرول میں چلے جانے سے ریاست جموں کشمیر کے لوگ بھی مطمئن ہو گئے۔ اگست کو ریاست بھر میں پاکستان کی آزادی کا دن بہت خوشی سے منایا گیا اور ۱۴ مہاراجہ نے خود پاکستانی پرچم کو سلامی دی لیکن یہ خوشی زیادہ دن نہ قائم رہ سکی اور ریاست کے مختلف حصوں سے شورش کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ گاندھی، نہرو، پٹیل اور دوسری کانگریسی قیادت کبھی بھی کشمیر کو ہاتھ نہیں جانے دینا چاہتی تھی اور انہیں ماؤنٹ بیٹن کا پورا تعاون حاصل تھا۔ قیام پاکستان کو بھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ پونچھ کے علاقہ سے ریاستی حکومت کے خلاف مسلح کاروائیوں کا سلسلہ ریاست کے دوسرے تک پھیلنا شروع ہوگیا جس کے رد عمل میں دوسری جانب سے بھی جوابی کارویئوں کا آغاز ہوگیا۔ بھارتی سامرج ریاست جموں کشمیر کو ہر قیمت میں ہڑپ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ جموں کے مسلمان ان حالات کے لیے نہ تو تیار تھے اور نہ ہی اس کشت و خون کا تصور کر سکتے تھے۔ جموں اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا مگر بھارت کے ساتھ سرحد ہونے کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے منظم انداز میں حملہ آور ہونے لگے۔ اگرچہ اکتوبر کے وسط تک جموں شہر کے حالات پر امن تھے مگر دیہات کے علاقوں سے لوگ حفظ ماتقدم کے طور پر پاکستان کی جانب پناہ

کی تلاش میں جانے لگے۔ میرے اپنے خاندان کے افراد کا کہنا ہے کہ ہم نے ذوالحج کا چاند پاکستان اور جموں کی سرحد پر دیکھا تھا جو پندرہ اکتوبر کی تاریخ ہوگی۔ اس کے بعد جب کشمیر پر ۲۲ کتوبر کو قبائلی حملہ شروع ہوا تو پھر جموں میں بھی قتل و غارت میں شدت آتی گئی۔ ۲۳ اکتوبر کو جموں کے ایک قصبہ میراں صاحب میں ڈوگرہ سپاہیوں اور جن سنگھیوں نے مسلمانوں کے مجمع پر شدید فائرنگ کرکے ہزاروں افراد کو شہید
کردیا۔ مسلمانوں کے گھروں پر حملے شروع ہوگئے اور ہزاروں مسلمان عورتیں کو اغواہ کرلیا گیا جن میں مسلم کانفرس کے صدر چوہری غلام عباس اور قائمقام صدر چوہدری حمیداللہ کی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔۲۶ اکتوبر کو جبری الحاق کا بہانہ بناکر بھارتی فوج جموں کشمیر میں داخل ہوگئی۔ ۳ نومبر کو پٹیالہ سے مزید فوجی کمک جموں آگئی اور ۴ نومبر کو بھارتی وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ اور وزیر داخلہ سردار پٹیل مزید منصوبہ بندی کے لیے جموں آئے۔ ۵ نومبر کو مسلمانوں کو کہا گیا کہ اگر وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو پولیس لائن پہنچ جائیں جہاں سے انہیں ٹرکوں اور گاڑیوں میں بھر کرلے جایا گیا مگر راستہ ہی میں انہیں شہید کردیا گیا صرف لوگ ہی اپنی جانیں بچاسکے۔ اگلے روز پھر جموں کے مسلمانوں کو قافلہ کی صورت میں پاکستان پہنچانے کی غرض سے روانہ کیا مگر انہیں بھی راستہ میں شہید کردیا گیا۔ اس قدر ظلم و بربریت کی مثال چشم فلک نے شائد پہلے نہ دیکھی ہوگی۔ عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر جان دے کر اپنی عزت بچائی۔

بچ نکلنے والے جب وہ واقعات سناتے تھے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔اس وقت کی قیادت اگر بالغ نظری اور مستعدی سے کام کرتی تو ممکن ہے کہ یہ قیامت صغریٰ بپا نہ ہوتی۔ریاست جموں کشمیر اور پاکستان کے مابین جوں کا توں معاہدہ ہونے کے باوجود باہمی تعلق کو مضبوط نہ بنایا گیا بلکہ سیالکوٹ سے جموں کے لیے ریل گاڑی بند کر دی گئی۔ قبائلی حملہ اگر ناگزیر بھی تھا تو اسے سیالکوٹ سے کٹھوعہ اور جموں کی جانب کیوں نہ کیا گیا۔ بھارت سے آنے والی صرف ایک شاہراہ کو کٹھوعہ کے قریب بند کرکے جموں کے مسلمانوں کو کیوں نہ بچایا گیا۔ اکتوبر کے وسط کے بعد جب جموں میں مسلمانوں پر حملے شروع ہوئے پھر بھی قبائلیوں کو جموں کی جانب کیوں نہ متحرک کیا گیا۔ مسلم کانفرس جموں کی قیادت کیوں حالات کا ادراک نہ کر سکی۔ قائد اعظم کے منع کرنے کے باوجود مسلم کانفرس کی قیادت نے کیوں بلاوجہ محاذ آرائی شروع کی جس کے نتیجہ میں جماعت کے صدر چوہدری غلام عباس، آر ساغر اور دوسرے جیل میں ڈال دیئے گئے۔ لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا اور ریاست بھی جبری تقسیم ہو گئی لیکن اُن شہداء نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی تھی وہ آج بھی روشن ہے اور جموں کشمیر کی تیسری نسل نے بھی اس جبری تقسیم کو تسلیم نہیں کرتی اور وہ مادر وطن کی آزادی کے لیے آج بھی متحرک ہیں اور اُس دن کی نہ صرف آرزو رکھتے ہیں بلکہ اس کے لیے مصروف جدوجہد ہیں جب آ ملیں گے سینہ چاکان وطن سے سینہ چاک۔

اقبال کا اصل کارنامہ

علامہ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے ؟ کیا ان کی وجہ شہرت و عزت صرف شاعر ہونا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ بہت بڑے فلسفی تھے۔ وہ ایک قانون دان ، ماہر تعلیم اور سیاست دان بھی تھے ۔ ہسب اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے امت مسلمہ کا تعلق قرآن حکیم سے جوڑنے کی کوشش کی ۔ وہ پیامبر قرآن تھے اور میرے نزدیک یہی ان کی پہچان ہے۔ علامہ نے نے امت کے زوال کے اسباب کا بہت گہرائی سے سے جائیزہ لیا اور زوال کی بڑی وجہ قرآن سے دوری اور اس پر عمل پیرانہ ہونا قرار دیا۔ انہوں نے عمل کا پیغام دیا اور کہا کہ دوبارہ عروج کے لیے قرآن میں غوطہ زن ہونا پڑے گا۔ انہوں نے غیر قرآنی تصورات کو مسترد کیا اور عشق مصطفےٰ ﷺ کی شمع کو قلوب میں منور کرنے کی کوشش کی۔ علامہ نے مغربی مفکرین اور مادیت کی طرف مائل مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی غلط فہمیوں کا دور کرنے لیے اپنے خطبات پیش کیے۔ ایک ہزار سالہ تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ تصور دیا کہ اسلام کو بحیثیت دین کے عملی مظاہرہ کے لیے ایک الگ مملکت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی شاعر کا خواب نہیں تھا بلکہ ان کی قرآن فہمی کا حاصل تھا۔ انہوں نے جو سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا اسی لئے فکر اقبال کا منبع قرآن ہے۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ

گر دلم آئینہء بے جوہر است ور بہ حرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن این خیاباں راز فکرم چاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم اہلِ ملّت را نگہدار از شرم
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسہء پا کن مرا

ان اشعار میں اقبال بارگاہ رسالتؐ میں عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ، اگر میرے دل کا آئینہ جوہروں سے خالی ہے اور اگر میری باتوں میں قرآن کے علاوہ کچھ اور ہے تو آپ میری فکر کی عزت کا پردہ چاک کر دیں اور ایسا انتظام فرمائیں کہ میرے کانٹے سے آپ کے پھولوں کی کیاری پاک ہو جائے۔ زندگی کا لباس مجھ پر تنگ کر دیجیے اور ملتِ اسلامیہ کے افراد کو میری برائی سے بچائے رکھیے۔ میرے آقا روز قیامت مجھے ذلیل و رسوا کیجیے اور کہ مجھے اپنے پاؤں کے بوسہ سے بھی محروم رکھیے ۔ اس سے بڑی بات اقبال کہہ نہیں سکتا تھا بلکہ کسی بھی مسلمان کے لئے یہ آخری حد ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے والہانہ محبت ان کے پیغام کی بنیاد ہے۔ اقبال نے امت مسلمہ کے تن مردہ میں روح پھونکی اور انہیں اپنے سوز جگر سے آشنا کیا۔ وہ اپنا یہی پیغام دوسروں کو یوں دیتے ہیں کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر بحق دل بند و راہِ مصطفٰی رو

یعنی اگر اس دنیا میں تو بلند مقام حاصل کرنے کی خواہش تو پھر اپنے دل کو اللہ سے آباد کر اور حضور اکرمؐ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو جا۔ انہوں نے دراصل قرآن حکیم کی ایک آیت کی تشریح کی ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔ مسلماں کیوں پستی کا شکار ہیں، اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوتی ہیں اور طویل تقاریر کی جاتی ہیں لیکن اس دانائے راز نے اسباب زوال امت صرف ایک شعر میں یوں بیان کیا کہ

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

انہوں نے نہ صرف امت کے مرض کی درست تشخیص کی بلکہ اس کا علاج بھی ایک شعر میں یوں تجویز کیا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

کہ اگر تم دنیا میں عزت چاہتے تو یہ قرآن پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔ لیکن وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں ہوئے کہتے ہیں کہ اے مسلمان ! تو صوفی اور ملا کے فریب اور کم نگاہی کا غلام ہے اور قرآن حکیم کی حکمت سے پیغام حیات اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ حاصل نہیں کر رہا۔ تمہارا تعلق تو قرآن کی آیات سے صرف اتنا سارہ گیا ہے کہ تمہارے ہاں کسی پر جب نزع کا عالم ہوتا ہے تو سورہ یٰسین کی تلاوت کی جاتی ہے کہ مرنے والے کی جان آسانی سے نکل جائے۔ وہ

فرماتے ہیں کہ

بہ بند صوفی وملا اسیری حیات از حکمت قرآں نگیری
بآیا تش ترا کاری جزایں نیست کہ از یسینِ اُو آساں بمیری

علامہ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمارا تعلق خدا کی آخری وحی کی جانب موڑا ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال ہمیں لائحہ عمل دیتے ہوئے کہتے ہیں

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

مسئلہ اخلاقی تربیت کا ہے

کہنے والے نے درست ہی کہا تھا کہ ہمارا مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم کی کمی ہے بلکہ اصل مسئلہ ہمارے ہاں تربیت کی کمی ہے۔ دانائے راز اور حکیم الامت نے اپنی بصیرت سے قوم کے مرض کہن کی نشاندہی نوے.برس قبل کردی تھی لیکن اب تو حالات اور بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ دور حاضر میں تعلیمی میدان میں تو کافی ترقی ہوئی ہے لیکن تربیت کا میدان تنزلی کی طرف گامزن ہے۔ اب تعلیم ہے مگر تہذیب نہیں ۔ ترقی اور خوشحالی کے لئے تعلیم کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے مگر جو اکبر آلہ آبادی نے کہا تھا کہ

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ کرکے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

عام آدمی ہوں یا بڑے عہدے پر فائیز شخصیات ہوں ، کم پڑھے لکھے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ چنداں فرق نہیں اس حمام میں سب ننگے ہیں ۔ معاشرہ کی غالب اکثریت کا یہی حال ہے۔ بظاہر دیکھنے میں کئی انسان.بڑے نظر آتے ہیں لیکن جب انہیں اخلاق اور تربیت کے معیار پر کھا جائے تو وہ بہت چھوٹے انسان دکھائی دیتے ہیں۔آئے روز میڈیا ،ہمارے معاشرہ کی منظر کشی کرتا ہے جس میں ڈاکٹر

وکلاء، طالب علم، قانون کے محافظ، افر شاہی، سیاستدان، علماء، اساتذہ، صحافی غرض ہر شعبہ زندگی کا حال پنجابی کے محاورہ اکو منڈھ کماد دا تے کوئی نہیں گنا سواد دا یا تند نہیں تانی ای وگڑی ہوئی اے یعنی ہر شخص بگڑا ہوا ہے۔ بقول اقبال قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں۔ اخلاقی اقدار اور تربیت کا ہمارے ہاں قحط ہے۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے اپنے کارکنوں کی تربیت کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ روز مرہ زندگی میں ہمارے رویے اخلاقی گراوٹ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آداب و اطوار مفقود ہیں۔ انسان اور حیوان میں فرق صرف اقدار کا ہے۔ حیوانات میں اخلاقیات کو کوئی سوال نہیں ہوتا۔ گائے بھینس بھوک کے وقت یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ ان کے مالک کا کھیت ہے یا کسی اور کا، انہوں نے اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ انسان تب ہی انسان کہلانے کے لائق ہوتا ہے جب وہ شرف انسانیت کی حامل اقدار کا امین ہو۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ وہ اخلاق کی تعلیم و تربیت دینے والے ہیں۔ خود ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ یہ تعلیم بھی دی کہ تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں لیکن اس کے باوجود بقول غالب

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تعلیم کے ساتھ تربیت اور اخلاق و اقدار کے لئے بچپن سے ہی انتظام ہونا چاہیے۔ کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ کسی بھی بچے کی تربیت کے لئے پہلے سات سال ماں، اگلے سات سال باپ اور مزید سات سال معاشرہ تربیت کرتا ہے۔ اکیس سال کا عرصہ گذرنے کے بعد تربیت کافی دشوار ہوجاتی ہے۔اچھے اخلاق و اطوار بچپن سے ہی سکھائے جاسکتے ہیں۔ نزول قرآن کا ایک مقصد انسانوں کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہے۔ سورہ حجرات میں تربیت کا ایک لائحہ عمل دیا گیا ہے اور یہ نصیحتیں کی گئی ہیں کہ فتبینوا یعنی کوئی بھی بات سن کر آگے کرنے سے پہلے تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بات سچ نہ ہو اور کسی کو انجانے میں نقصان پہنچ جائے۔ فاصلحوا یعنی دو بھایوں کے درمیان صلح کروا دیا کرو۔ تمام ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ واقسطوا مطلب دو گروہوں کے درمیان جھگڑے کو انصاف سے حل کرو۔ لایسخر کسی کا مذاق مت اڑاؤ. ولا تلمزوا کسی کو بے عزت مت کرو۔ ولا تنابزوا لوگوں کو برے القابات (الٹے ناموں) سے مت پکارو۔ ظن یعنی برا گمان کرنے سے بچو۔ لا تجسّسوا ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو۔ کسی دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی مت کرو۔ سورہ نور میں تربیت کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ کسی کے گھر بغیر اجازت نہ جاؤ، اگر اہل خانہ اس وقت معذرت کریں تو واپس چلے آؤ اور برا مت مناؤ۔ اگر تمہیں کسی کام کے لئے بلایا جائے تو وہاں سے بغیر اجازت مت جاؤ۔ اخلاق و اقدار کی مزید تربیت سورہ احزاب میں یوں دی کہ بات سچی اور سیدھی کرو۔ کسی کے ہاں دعوت پر قبل

از وقت مت جاؤ اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو زیادہ دیر نہ بیٹھو تاکہ اہل خانہ کو وقت نہ ہو۔ دعوت پر جاتے ہی کھانے کا مطالبہ نہ کرو۔ ایک اور بڑی بد تہذیبی یہ ہے کہ کسی کی دعوت قبول کرکے نہ جانا اور نہ ہی میزبان کو مطلع کرنا۔ مزید آداب کی تعلیم قرآن حکیم میں یوں ہے کہ جب وعدہ کرو پورا کرو، چیخ چیخ کر بات نہ کرو۔ مجلس میں ناشائستہ حرکات مت کرو۔ اگر محفل میں کہا جائے کہ جگہ کھول دو تو ایسا ہی کیا کرو اور جب محفل برخاست ہو جائے تو اٹھ کر چلے جاؤ۔ ایسی زبان بولو جو معاشرہ میں شرفاء کی زبان تسلیم کی جاتی ہو۔ عدل سے بات کرو اگرچہ وہ تمہارا قربت دار ہی کیوں نہ ہو۔ جھوٹ کو سچ کا لباس نہ پہناؤ، سچ اور جھوٹ کو آپس میں غلط ملط نہ کرو۔ بیہودہ باتوں سے کنارہ کش رہو۔ اگر کہیں اتفاق سے لغویات کا سامنا ہو جائے تو شریفانہ انداز میں پہلو تہی کرکے آگے بڑھ جاؤ۔ ان تعلیمات کی روشنی میں اگر ہم اپنے قول و فعل کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی اصلاح کی کوشش کریں تو ہم وہی انسان بن سکتے ہیں جس کی تعلیم آخری پیغامِ خداوندی میں دی گئی ہے اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو ہر مہذب معاشرہ کی بنیاد ہیں۔ گذشتہ دنوں کوئٹہ میں معذوروں سے پولیس کی بدسلوکی اور سیالکوٹ میں خواجہ سراپر وحشیانہ تشدد کرنے والوں کو قہر خداوندی سے ڈرنا چاہیے اور بااختیار حکام کو مظلوموں کی بددعا سے بچنے کے لئے انصاف کرنا ہوگا۔

خدانہ کرے کہ بھول جائے کوئی

کسی کو بھول جانا بے اعتنائی اور بے وفائی سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے شاعروں نے اسے اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ قتیل شفائی نے اپنے محبوب کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدانہ کرے جبکہ ساغر صدیقی کہتے ہیں کہ

تیری صورت جو اتفاق سے ہم
بھول جائیں تو کیا تماشا ہو

یہ تو ایک شاعرانہ تخیل اور دلی کیفیت ہے لیکن کبھی ایسا ہو سکتا ہے انسان کے اپنے بس میں ہی رہے اور وہ بھول جانے کا شکار ہو جائے ۔روز مرہ کے معاملات میں بھول جانا ایک عام سی بات ہے لیکن اگر بھول جانے کا وہ مرض لاحق ہو جسے الزائمر کہتے ہیں تو یہ انتہائی پریشان کن صورت ہوتی ہے۔ یہ مرض عمومی طور پر ساٹھ سال کے بعد حملہ آور ہوتا ہے اور ابتداء میں نسیان کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ انسانی دماغ میں ایک ارب کے قریب خلیے ہوتے ہیں لیکن بیس سال کی عمر سے ہی یہ خلیے کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور چالیس سال کی عمر کے بعد روزانہ دس ہزار خلیے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے اور اس کا کسی بیماری سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ عمر رسیدگی کا حصہ ہے۔

مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب کسی کو پڑھنے، لکھنے اور بات چیت میں دشواری ہو۔ ٹیلی وژن دیکھنے اور دیگر کام کاج میں توجہ مرکوز کرنے کا مسئلہ شدت سے درپیش ہو۔ معمولی حساب کتاب کرنا اور مقامات کو یاد رکھنا مشکل ہوجائے اور جب مرض شدید ہو تو اپنے گھر کا راستہ بھی بھول جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنی چابیاں کہیں رکھ کر بھول جائے تو یہ ایک عام سی بات ہے لیکن اگر کوئی چابی استعمال کرنا بھول جائے تو یہ سنگین مسئلہ ہے۔ اس وقت دنیا میں تقریباً پانچ کروڑ افراد اس مرض کا شکار ہیں۔ سویڈن میں ایک فی صد یعنی ایک لاکھ افراد جبکہ پاکستان میں نصف فی صد آبادی تقریباً دس لاکھ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں یہ مرض دنیا کے دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اس مرض میں مبتلا لوگ دس سال تک زندہ رہتے ہیں اور وہ وہ زندگی مریض اور گھر والوں کے لئے بہت دشوار ہوتی ہے۔ پریشان کن بات یہ ہے کہ مستقبل میں اس مرض میں مبتلا ہونے والے افراد کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔

یہ مرض کیوں لاحق ہوتا ہے۔ درست طور پر وجوہات کا ابھی علم نہیں لیکن وراثتی عوامل، طویل عرصہ پژمردگی میں رہنا، سر پر مسلسل چوٹیں لگنا مثلاً مکے بازی کا کھیل، بلند فشار خون اور خون میں شکر کی مقدار کم رہنا اس مرض کے محرکات سمجھے جاتے ہے۔ ابتداء میں اس مرض کی تشخیص آسان نہیں۔ جسم میں

سے دماغ کی حالت سے معالج کو MRI اور Scans CT PET, ، وٹامن بی کی کمی
تشخیص میں مدد ملتی ہے۔یہ ایک لاعلاج مرض ہے اگرچہ کچھ ادویات مرض کی شدت
اور تکلیف کم کرنے کے لئے دی جاتی ہیں لیکن زیادہ توجہ مریض کی نگہداشت پر توجہ دی
جاتی ہے۔اس مرض سے بچنے کے لئے ماہرین صحت جسمانی اور ذہنی آزمائش کی ورزش
جیسے کراس ورڈ کو مفید قرار دیتے ہیں۔زیادہ عمر میں کوئی اور زبان سیکھنا بھی بہت
فائدہ مند ہے۔جاپانی اور بحیرہ روم کے خطہ یعنی اٹلی، ہسپانیہ اور یونان کی غذائیں جن
میں زیتون کا تیل، مچھلی، سبزیاں پھل شامل ہیں اس مرض سے بچاؤ میں معاون ہیں۔
اپنے طرز زندگی کو بہتر رکھنا، مطالعہ کا شوق، آلات موسیقی کا استعمال، باغبانی، زیادہ
سماجی میل جول اور حلقہ احباب بھی اس مرض سے دور رکھتا ہے۔ذیابیطس، بلند فشار
خون، امراض قلب اور خون میں شکر کی کمی الزائمر کی طرف دھکیل سکتی ہے۔دنیا کی کئی
معروف شخصیات الزائمر کی شکار ہوئی ہیں جن میں بیگم نصرت بھٹو اور سابق امریکی صدر
رونلڈ ریگن بھی شامل ہیں۔امریکہ میں مقیم معروف پاکستانی نیوروسرجن ڈاکٹر ایوب
خان اومایا جنہوں نے دماغ کی چوٹ اور رسولیوں کے علاج کے لئے طریقہ وضع کیا جسے
کہا جاتا ہے جو آج بھی کیموتھراپی کے لئے استعمال کیا جاتا Ommaya Reservoir
ہے، وہ بھی اس دماغی مرض الزائمر کا شکار ہوئے اور 2008 میں ان کا انتقال ہوا۔اس
مرض میں مبتلا افراد اور ان کے اہل خانہ کی رہنمائی کے لئے انجمنیں اور صحت عامہ کے
شعبہ میں ادارے قائم ہیں اور ان سے مزید

معلومات مل سکتی ہیں۔ پاکستان میں معلومات کے لئے یہ ویب سائیٹ ہے۔
http://alz.org.pk/ ۔ اللہ تعالٰی سب کو ہمیشہ صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

آخر میں ایک اور معاملہ جس کا تعلق الزائمر سے تو نہیں لیکن جان بوجھ کر بھلا دینے سے ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہائیڈل.برگ یونیورسٹی جرمنی کے انسٹیٹیوٹ.برائے جنوبی ایشیا میں اقبال چیئر قائم ہے جس کے سر.براہ کی تعیناتی حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ یہ نشست گذشتہ تین سال سے خالی ہے اور حکومت پاکستان کی غفلت کی وجہ سے اس کے لئے کسی کی تعیناتی نہیں کی گئی ۔ جرمنی اور یورپ میں فکر اقبال کے فروغ کے لئے یہ مرکز اہم کرادر ادا کر رہا ہے لیکن حکومت پاکستان کی عدم توجہی اور لاپرواہی نا قابل فہم ہے۔ جرمنی میں مقیم معروف صحافی ادیب اور شاعر جناب سید اقبال حیدر کئی بار وہاں سفیر پاکستان کی توجہ اس جانب دلا چکے ہیں لیکن اس کا کوئی بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ اپنے اس کالم کے توسط سے ارباب اختیار سے گذارش ہے کہ وہ جلد ہی اس اہم عہدہ کے لئے کسی ماہر اقبالیات کی تعیناتی کریں تاکہ یہ مرکز فعال کرادر ادا کر سکے۔